مولانا مودودیؒ
گفتار و افکار

سید مودودیؒ کے معمولات جنہیں مصنف نے [۱۹۶۸ تا ۱۹۷۹]
ان کی خدمت میں رہتے ہوئے ڈائری کی صورت میں قلم بند کیا

مولانا عاصم نعمانیؒ

فہرست

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ چودھویں صدی ہجری، اور بیسویں صدی عیسوی کے متبحر عالم، بلند پایہ مفکر اور تحریکِ اسلامی کے عظیم رہنما تھے۔ انہوں نے نصف صدی سے زیادہ عرصہ اسلام کی مؤثر اور کامیاب ترجمانی کی اور عالم اسلام میں لادینیت، الحاد، تشکیک، مغربی تہذیب کے فاسد افکار و نظریات نیز کمیونزم اور سوشلزم کے بڑھتے ہوئے اثرات کے خلاف مسلسل جہاد کیا۔ اسلام کو محدود مذہبیت کے دائرے سے نکال کر ایک عالم گیر بین الانسانی دین، ایک ہمہ گیر نظام زندگی اور ایک انقلابی تحریک کی حیثیت سے پیش کیا۔ اگست ۱۹۴۱ء میں انہوں نے برصغیر میں اقامتِ دین اور حکومتِ الٰہیہ کے قیام کی غرض سے جماعتِ اسلامی قائم کی، اور اُس کے پہلے امیر منتخب ہوئے۔ پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد سے ۱۹۷۲ء تک جماعتِ اسلامی پاکستان کے امیر رہے۔ آغازِ جوانی سے تا دمِ واپسیں تحریکِ اسلامی کی خدمت و رہنمائی کے لیے وقف رہے۔ اس راہ میں انہوں نے نہ صرف یہ کہ اپنے علم، اپنے دل و دماغ اور اپنی زبان و قلم کی تمام صلاحیتیں صَرف کر دیں، بلکہ اپنی ساری قوتیں اسلام کی سربلندی کے لیے کھپا دیں۔ انہیں اِس مقدس مہم میں ہر طرح کی مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا، ناروا الزام تراشیوں سے دوچار ہوئے۔ طرح طرح کے مصائب و مشکلات سے سابقہ پیش آیا، ایک مدت تک قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کرنی پڑیں یہاں تک کہ مسئلہ ختمِ نبوت کی وکالت اور قادیانیت کی مخالفت کے جرم میں

انہیں پھانسی تک کی سزا سُنا دی گئی۔ مگر ظلم و عناد کا کوئی طوفان بھی انہیں راہِ حق سے نہ ہٹا سکا۔ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ۔

سید مودودیؒ جہاں ایک طرف عزیمت و استقامت کا پہاڑ تھے وہاں علم و ہدایت کا ایک بلند مینار بھی تھے۔ ان سے ہزارہا بندگانِ خدا کو علم و آگہی اور ایمان و اسلام کی دولت حاصل ہوئی اور وہ الحاد و تشکیک کے اندھیروں سے نکل کر دینِ حق کی روشنی میں آ گئے۔ بے شمار افراد کو اس دور میں بھی اسلامی نظام کے قابلِ عمل اور انسانی مسائل کا واحد حل ہونے پر یقین پیدا ہوا، اور وہ اسلام کی سربلندی اور اس کی اشاعت اور اقامت کی جدوجہد کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ سید مودودیؒ کی شخصیت، ان کے علم، ان کی فکر اور ان کی تحریک سے عرب و عجم دونوں متاثر ہوئے اور دونوں نے بھرپور استفادہ کیا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے ان کی فکر ایشیائی ممالک سے نکل کر یورپ، امریکہ اور براعظم افریقہ تک جا پہنچی۔ ان کی کتابوں کے تیس سے زیادہ زبانوں میں تراجم ہو چکے ہیں جن میں روسی زبان بھی شامل ہے۔

راقم الحروف نے ۱۹۶۲ء کے آخر میں مولانا محترم کے دفتر میں ٹائپسٹ کلرک کی حیثیت سے کام شروع کیا۔ مولانا امیر جماعت تھے اور میرے کام کی نوعیت ان کے ذاتی اُمور نمٹانا تھی۔ جماعت سے متعلقہ جملہ اُمور اور جماعتی مراسلت کا تعلق شعبۂ تنظیم سے تھا۔ علمی سوالات اور مسائل شعبہ رسائل و مسائل سے متعلق تھے۔ اس شعبہ کے سربراہ خود مولانا محترم تھے۔ محترم ملک غلام علی صاحب، مولانا محترم کے معاون خصوصی تھے۔ تیسرا راقم الحروف تھا۔ اس طرح مجھے شروع ہی سے مولانا کے زیرِ سایۂ عاطفت اور براہِ راست ان کی نگرانی میں کام کرنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ مولانا محترم بہت ہی نرم مزاج اور انتہائی شفیق انسان تھے۔ غلطی کی اِصلاح اتنے

خوبصورت انداز میں کرتے کہ بار بار غلطی کرنے کو جی چاہتا۔
عصری نشست باقاعدگی سے ہوتی تھی۔ میں اکثر و بیشتر اس میں شریک ہوتا، لیکن بے خیالی میں کئی سال بیت گئے اور مجھے ڈائری لکھنے کی نہ سوجھی۔ ۱۹۷۴ء کے وسط میں جب مرکزِ جماعت منصورہ منتقل ہوا، مجھے مولانا محترم کی خدمت میں اچھرہ ہی میں رہنے دیا گیا۔ اسی زمانے میں ڈائری لکھنے کا خیال پیدا ہوا، چنانچہ ڈائری لکھنا شروع کر دی گئی۔ نیز اس سے پہلے ضروری واقعات کے بارے میں بھی معلومات جمع کی گئیں۔ اس طرح ڈائری اور یادداشتوں کی مدد سے جو کچھ فراہم ہوسکا وہ تاریخ کا بیش قیمت سرمایہ ہے جو پیش نظر صفحات کی صورت میں قارئین کے ہاتھوں میں ہے۔ ان یادداشتوں کی تصدیق، تصویب اور حوالہ جات، نیز بعض تقاریر کے نوٹس کے سلسلے میں سہ روزہ ایشیا، ہفت روزہ آئین اور ماہنامہ ترجمان القرآن سے استفادہ کیا گیا ہے۔ کتاب "مولانا مودودیؒ کا آخری سفر" بھی پیشِ نظر رہی۔ اس کے لئے راقم الحروف ادارۂ ایشیا، ادارۂ آئین، ادارۂ ترجمان القرآن اور "مولانا مودودیؒ کا آخری سفر" کے مؤلف جناب انتظار نعیم صاحب (دہلی، بھارت) کا ممنون ہے۔ خصوصیت کے ساتھ برادر محترم پروفیسر حفیظ الرحمٰن احسنؔ صاحب اور چودھری غلام جیلانی صاحب کا شکر گزار ہوں جنہوں نے مسودے پر نظرِ ثانی فرما کر کتاب کو موجودہ شکل میں اشاعت کے قابل بنایا۔ فجزاھم اللہ احسن الجزاء۔

عاصمؔ نعمانی، لاہور۔
۴ / جولائی ۱۹۸۶ء۔

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ

تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ

الْمُنْكَرِ (آلِ عمران - ۱۱۰)

(اب دُنیا میں وہ بہترین گروہ تم ہو جسے انسانوں کی ہدایت و اصلاح کے لئے میدان میں لایا گیا ہے۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو، بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

برطانیہ روانگی

۲۳ تا ۲۵ ر اگست ۱۹۶۸ء

گزشتہ کئی مہینوں سے گردے کی تکلیف شدت اختیار کر چکی تھی۔ گردے میں پتھری تھی جو کسی کل چین نہیں لینے دے رہی تھی چنانچہ اس کے لئے ماہرین سے مشورہ کیا گیا۔ کراچی میں ڈاکٹروں کے بورڈ نے طے کیا کہ مولانا کو اس کے آپریشن کے لئے لندن جانا چاہیئے۔

اس غرض کے لئے مولانا محترم ۲۳ ر اگست کو لاہور سے لندن کے لئے روانہ ہوئے۔ علاج کی غرض سے ان کا یہ پہلا بیرونی سفر تھا۔ ۲۳، ۲۴، ۲۵ ر اگست کو کراچی میں چودھری غلام محمد صاحب امیر جماعتِ اسلامی کراچی کے ہاں قیام فرمایا۔ اس دوران میں کارکنوں سے ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا۔ ۲۵ ر اگست کی صبح کو کراچی سے لندن روانہ ہوئے۔

لندن میں مولانا محترم جناب رشید احمد صدیقی صاحب صدر یو کے اسلامک مشن کے ہاں قیام پذیر ہوئے۔ وہاں بھی ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا بلکہ چند ہی دنوں میں جناب صدیقی صاحب کا مکان ۵۔ اے ذیلدار پارک اچھرہ لاہور کا منظر پیش کرنے لگا۔

ہسپتال میں داخل ہونے سے پہلے مولانا محترم نے برطانیہ میں مسلمان طلبہ کی تنظیم (Fosis) اور یو کے اسلامک مشن کی تقریبات میں شرکت فرمائی۔

۲۹ ر ستمبر ۱۹۶۸ء

آج مولانا کا لندن کلینک میں پہلا اپریشن ہوا۔ تقریباً دو ہفتے

کلینک میں گزارنے کے بعد ۲۴؍ستمبر کو صدیقی صاحب کے مکان میں منتقل ہو گئے۔

۲۱؍اکتوبر ۱۹۶۸ء

آج آپریشن کے دوسرے مرحلے کے لیئے مولانا محترم دوبارہ لندن کلینک میں داخل ہوئے۔ ۲۲؍اکتوبر کو آپریشن ہُوا اور ستائیس سالہ پُرانی تکلیف سے نجات ملی۔ جو پتھری گردے سے برآمد ہوئی اخروٹ کے حجم کی نوکدار پتھری تھی۔ دو ڈھائی ہفتے ہسپتال میں گزارنے کے بعد ۱۲؍نومبر کو ایک مرتبہ پھر صدیقی صاحب کے مکان پر آ گئے۔

۱۵؍دسمبر ۱۹۶۸ء

آج مولانا محترم نے برطانیہ میں مقیم مسلمانوں کی طرف سے ہلٹن ہوٹل لندن میں دیئے گئے استقبالیہ سے خطاب فرمایا۔

۲۶؍دسمبر ۱۹۶۸ء

۲۶؍دسمبر کو مولانا محترم لندن سے پاکستان کے لیئے روانہ ہوئے لندن ائیرپورٹ پر الوداعی مُلاقات کے لیئے مختلف شہروں سے آنے والے ہجوم کے تقاضے پر مولانا محترم نے مختصر خطاب فرمایا۔ انہوں نے فرمایا:۔

> "میں آپ سے ایک ہی بات کہتا ہوں کہ آپ اسلام کا عملی نمونہ پیش کریں۔ اپنی زندگیوں کو دوسروں کے لیئے مشعلِ راہ بنائیں۔ اگر آپ ایسا کر سکیں تو یہ آپ کی خوش قسمتی ہوگی۔"

۲۷/ دسمبر ۱۹۶۸ء

پی آئی اے کی پرواز بوئنگ ۷۰۸، ۲۷/ دسمبر کو صبح کی نماز کے وقت کراچی پہنچی۔ ایئرپورٹ پر استقبال کرنے والوں کا ہجوم تھا جن میں میاں طفیل محمد صاحب قائم مقام امیر جماعتِ اسلامی پاکستان، صابر حسین شرفی صاحب، محمود اعظم فاروقی صاحب، حکیم اقبال حسین صاحب، سید منور حسن صاحب، جناب محی الدین ایوبی صاحب اور دوسرے بہت سے اصحاب موجود تھے۔ ۲۸/ دسمبر کو مولانا محترم نے کراچی ہی میں قیام گاہ پر ملاقات کے لیئے آنے والے حاضرین کے سوالات کے جوابات دیئے جن کا تعلق اس وقت کے سیاسی صورتِ حال سے تھا۔

ایک کارکن کا سوال تھا " بعض عناصر ملک میں توڑ پھوڑ اور تشدد کی راہ اختیار کر رہے ہیں۔ کیا جمہوریت کی بحالی کے لیئے ان سے کسی قسم کا اشتراک کیا جا سکتا ہے؟"

مولانا محترم نے فرمایا:۔

"ـــــ ہم اس ملک کی اصلاح کے لیئے اُٹھے ہیں، اسے خراب کرنے کے لیئے نہیں اُٹھے۔ اللہ کے فضل سے جماعتِ اسلامی ایک منظم جماعت ہے اور وہ صرف ایسے عناصر کے ساتھ مل کر کام کرے گی جو مفسد اور غارت گر نہیں ہیں جماعت اسلامی نہ تو کسی تخریب کار گروہ سے تعاون کرے گی اور نہ اسے یہاں کام کرنے دے گی"

ایک سوال "اسلامی سوشلزم" کی اصطلاح کے متعلق تھا۔

مولانا نے فرمایا:۔

"اسلام ایک مکمل نظامِ حیات ہے، اس کے ساتھ کسی دوسرے ازم کی پیوند کاری کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ جو لوگ اسلامی سوشلزم کا نام لیتے ہیں انہیں صرف اسلام کہتے ہوئے کیوں شرم آتی ہے۔ بہر حال نام سوشلزم ہو یا اسلامی سوشلزم کا، اسلام کے خلاف اس قسم کی جو تحریک بھی چلائی جائے گی جماعتِ اسلامی اس کا مقابلہ کرے گی۔ ان نعروں یا لیبلوں سے کوئی اور دھوکا کھائے تو کھائے لیکن خُدا کے فضل سے جماعتِ اسلامی دھوکا نہیں کھائے گی۔"

مزید فرمایا:۔

"پاکستان کسی سوشلزم، برطانیہ ازم، امریکہ ازم یا مارکس ازم کے لیے قائم نہیں کیا گیا۔ یہ ملک صرف اسلام کے نام پر قائم ہوا تھا اور یہاں صرف اسلام کا نظام ہی آئے گا۔"

۲۹ر دسمبر ۱۹۶۸ء

آج تین بجے بعد دوپہر پی آئی اے کی پرواز سے مولانا محترم لاہور پہنچے۔ استقبال کرنے والوں کا بہت بڑا ہجوم ہوائی اڈے پر موجود تھا۔ راستے میں بھی جگہ جگہ لوگ آنکھیں بچھائے کھڑے تھے۔ ہوائی اڈے سے اچھرہ تک کا سفر ڈیڑھ گھنٹے میں طے ہوا جب کہ کار سے اس میں صرف پندرہ منٹ لگتے ہیں۔

مولانا محترم جب ۵۔اے ذیلدار پارک پہنچے تو ان کے برادرِ بزرگ محترم سید ابوالخیر مودودی برآمدے میں پھولوں کا ہار لیے کھڑے تھے۔ ہار پہنایا۔ دونوں بھائی بغلگیر ہوئے اور دیکھنے والی آنکھیں بھیگ گئیں۔

تھوڑی دیر بعد مولانا محترم اپنے دفتر کے راستے گھر کے اندر تشریف لے گئے۔

اسی شام مغرب کی نماز کے بعد استقبال کے لیئے آنے والے مقامی اور بیرونی حضرات کے ساتھ، جن کی تعداد ڈیڑھ ہزار کے لگ بھگ ہو گی، مولانا محترم کی نشست کا انتظام کیا گیا۔

مولانا محترم نے مختصراً اپنے علاج اور آپریشنوں کی تفصیل بتائی اور ان کی وجہ سے لاحق ہونے والی کمزوری کا ذکر کیا۔ علاوہ ازیں ملکی حالات کا اختصار کے ساتھ تجزیہ کیا۔ تحریکِ اسلامی کے کارکنوں کو انکے فرائض کی یاددہانی کراتے ہوئے فرمایا:۔

"حضرات، جب تک ہم زندہ ہیں اور جب تک ہمارے سر ہماری گردنوں پر سلامت ہیں اس وقت تک کسی میں یہ ہمت نہیں کہ وہ یہاں اسلام کے سوا کسی اور ازم کو چلا سکے ——— یہ محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمّت کا ملک ہے۔ یہ مارکس اور ماؤزے تنگ کی اُمّت کا ملک نہیں ہے۔ یہاں کوئی دوسرا نظام نہ چل سکے گا، اور نہ یہاں لادین طبقے کی آمریت چل سکے گی۔ اگر اللہ کے دین کے لیئے ہمیں لڑنا پڑا تو ہم خُدا کے فضل سے دس محاذوں پر لڑنے سے نہ چوکیں گے۔ ہم انشاء اللہ بیک وقت آمریت کا مقابلہ بھی کریں گے اور بے دینی سے بھی لڑیں گے۔"

—●—

۲/جولائی ۱۹۶۹ء

آج ایک اخباری نمائندے نے مولانا محترم سے انٹرویو لیا جو شائع نہیں کیا گیا تھا۔ بعد میں ادارۂ آئین نے اسے حاصل کرکے "آئین" میں شائع کیا۔ آئین کے شکریہ کے ساتھ سوال و جواب کی صورت میں انٹرویو اس کتاب میں شامل کیا جا رہا ہے۔

سوال:۔ پاکستان میں اسلام ہی کیوں ناگزیر ہے؟

جواب:۔ پاکستان میں اسلامی نظام اس لیئے ناگزیر ہے کہ ہم مسلمان ہیں۔ اسلام کے حق ہونے پر اگر ہمارا ایمان ہو تو ہم اپنے لیئے اور اپنے ملک کے لیئے اسلام کے سوا کسی اور نظام کا تصور نہیں کر سکتے۔ پاکستان تو خاص طور پر بنا ہی اسلام کے لیئے ہے۔ اگر تحریکِ پاکستان کے آغاز میں یہ نہ کہا جاتا کہ پاکستان اسلامی شریعت کے نفاذ اور اسلامی نظامِ زندگی قائم کرنے کے لیئے بنانا مطلوب ہے تو اس تحریک کو کبھی مسلمانوں کی تائید حاصل ہی نہ ہوتی اور نہ یہ ملک وجود میں آتا۔ اب بائیس سال کے بعد یہ سوال اُٹھانا کہ یہاں اسلامی نظام نافذ ہو یا کوئی غیر اسلامی نظام نافذ ہو، ان لاکھوں مسلمانوں کے ساتھ غداری ہے جنہوں نے اس ملک کے بنانے کے لیئے اپنی جانیں، مال اور آبروؤں کو قربان کیا اور ہندوستان کے ان کروڑوں مُسلمانوں کے ساتھ بھی غداری ہے جنہوں نے محض اسلام کے نام پر پاکستان قائم کرنے کی خاطر اس کے قیام کی تحریک میں حصہ لیا اور آج تک وہ اس کی بڑی بھاری قیمت ادا کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ یہاں اسلام اس لیئے بھی ناگزیر ہے کہ اسلامی نظام کے سوا اس ملک کے مختلف اجزاء کو جوڑ کر رکھنے اور اسے ایک ملک بنائے رکھنے کی کوئی دوسری صورت ممکن نہیں۔ جس وقت یہاں اسلام

کے سوا کوئی اور نظام لانے کی کوشش کی گئی فوراً ہی بنگالی بنگالی ہو کر رہ جائے گا، پنجابی پنجابی ہو کر رہ جائے گا، پٹھان اور سندھی اور بلوچ سب عناصر ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں گے اور بالآخر ان میں سے کسی کی آزادی باقی نہیں رہے گی۔ اس لیئے آپ دیکھتے ہیں کہ جو لوگ یہاں اسلام کے سوا کوئی دوسرا نظام برپا کرنے کی کوشش کرتے ہیں وہ صاف صاف بنگالیت، پٹھانیت، سندھیت اور پنجابیت کے تعصبات اُبھارتے ہیں کیونکہ ان کا مدعا ان نعروں کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا۔ اور کوئی دوسرا نظام اگر پاکستان میں آسکتا ہے ۔۔۔۔۔۔ تو اس کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے آہی سکتا ہے۔"

سوال :۔ آپ نے اسلامی نظام کے لیئے کیا لائحہ عمل تجویز کیا ہے؟

جواب :۔ ہم اس مقصد کے لیئے ایک وسیع اور ہمہ گیر تحریک سالہا سال سے چلا رہے ہیں۔ اسلامی نظام چونکہ ایک ہمہ گیر نظام ہے جو افراد اور معاشرے اور ریاست کے سارے پہلوؤں پر حاوی ہے، اس لیئے اس کو برپا کرنے کی خاطر محض کسی ایک پہلو میں جدوجہد کرنا کارگر نہیں ہو سکتا۔ اس کے لیئے عوام میں بھی اسلام کا علم پھیلانا ضروری ہے اور تعلیم یافتہ طبقوں میں بھی اسلام کے خلاف جو شکوک و شبہات پائے جاتے ہیں۔ ان کو رفع کرنا بھی ضروری ہے۔ ہر طبقے کو اس کی فہم اور استعداد کے مطابق اسلام کا نظام سمجھانا ضروری ہے۔ زندگی کے مختلف پہلوؤں میں اسلام جو ہدایات دیتا ہے اور ہر شعبے کی جس طرح تشکیل کرتا ہے اس کی وضاحت کرنا بھی ضروری ہے۔ عوام کے اخلاقی بگاڑ کو روکنا اور ان میں اسلامی اخلاق پیدا کرنا بھی اس لائحہ عمل کا ایک اہم حصہ ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اس بات کی بھی ضرورت ہے کہ ملک کے اندر ایک ایسا جمہوری نظام موجود ہو۔ جس میں عوام کی رائے کے مطابق نظام حکومت بنے

جتنی جتنی عام رائے اسلامی نظام کے لیے تیار ہوتی جائے، اتنی ہی زیادہ صحیح اسلامی حکومت بنتی چلی جائے گی۔ جماعتِ اسلامی ان سارے پہلوؤں میں کام کرنے کو کوشش کر رہی ہے۔"

سوال:۔ آپ کے نزدیک اسلامی نظام کی کامیابی کے کیا امکانات ہیں؟

جواب:۔ ایک لحاظ سے دیکھا جائے تو پاکستان میں صرف اسلامی نظام ہی کی کامیابی کے امکانات ہیں اور کسی نظام کی کامیابی کے امکانات نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ملک کی مسلمان آبادی کا کم از کم ننانوے فیصد حصہ وہ ہے جو اسلام کے حق ہونے پر یقین رکھتا ہے اور اس سارے بگاڑ کے باوجود جو پچھلی صدیوں میں ہمارے معاشرے کے اندر پیدا ہوا ہے، اس کی روایات میں اسلام بہت گہری جڑوں کے ساتھ رچا اور بسا ہوا ہے۔ یہاں اسلامی نظام قائم کرنے کی کوشش کی جائے گی تو ملک کی آبادی کے اس عظیم حصہ کی روایات اور اس کے جذبات اس کے ساتھ ہوں گے۔ کوئی دوسرا نظام لانے کی کوشش کی جائے گی تو ملک کے عوام کی ذہنی، اخلاقی اور روحانی تائید اس کے ساتھ نہیں ہوگی، بلکہ ایک قلیل التعداد گروہ کو سازشوں اور ریشہ دوانیوں اور غیر آئینی تدبیروں سے کام لے کر زبردستی اس نظام کو ملک پر مسلط کرنا پڑے گا۔ اور مسلط کرنے کے بعد بھی مدت ہائے دراز تک وہ اپنی قوم کے عقائد اور روایات وجذبات سے لڑتا رہے گا۔ یہ نادانی جس مسلمان ملک میں بھی کی گئی ہے اس کے نہایت خراب نتائج رونما ہوئے ہیں اور کسی قسم کی ترقی کرنے کے بجائے ان ملکوں کی حکومتیں اپنی ہی قوم سے لڑنے میں اپنی قوتیں ضائع کرتے ہیں، چنانچہ دشمنوں سے جب سابقہ پیش آیا تو معلوم ہو گیا کہ انہوں نے اپنے ملک اور اس کی طاقت کو کتنا مضبوط کیا۔

ایک دوسرے نقطۂ نظر سے اگر دیکھا جائے تو یہاں اسلامی نظام کو برپا کرنے کی راہ میں سخت مشکلات حائل ہیں اور وہ روز بروز بڑھ رہی ہیں۔ اگر پاکستان بننے کے بعد ہی ان وعدوں کو پورا کیا جاتا جو پاکستان کی تحریک کے زمانے میں مسلمانوں سے کیئے گئے تھے اور جلدی سے جلدی ایک اسلامی دستور بنا کر ملک کے نظامِ تعلیم، نظامِ قانون۔ نظم و نسق اور معاشی نظام میں وہ اصلاحات شروع کر دی جاتیں جو اسلامی اُصولوں کے مطابق کرنی چاہیئے تھیں تو آج حالات بالکل مختلف ہوتے، لیکن یہاں پچھلے بیس بائیس سال ہر پہلو سے زندگی کے نظام کو انہی خطوط پر چلاتے رہے جن پر انگریز اس کو چلا رہا تھا بلکہ مزید کچھ خرابیاں باہر کے ہر اس ملک سے درآمد کی گئیں جن سے ہمیں کچھ اقتصادی امداد اور کچھ فوجی امداد حاصل ہوئی۔ ساری قوتیں یہاں اِسلام کے لیئے کام کرنے والوں کو دبانے میں صَرف کی گئیں، اور ہر اُس گمراہی کو پھلنے اور پھُولنے کا موقعہ دیا گیا جو گھر کے اندر سے اُٹھی یا باہر کہیں سے درآمد ہوئی۔ اِس چیز نے ہمارے ملک کو اس وقت ایسے مقام پر لا کھڑا کیا ہے جہاں ہمارے لیئے اپنی اسلامی روایات کی طرف پلٹنا ہی مشکل ہو گیا ہے۔ اور کسی غیر اسلامی نظام کا بھی کامیابی کے ساتھ چلنا ممکن نہیں ہے۔ ہم ایک شدید تفرقے میں مبتلا ہو گئے ہیں اور یہ تفرقہ بڑھ رہا ہے اور جتنا جتنا یہ بڑھتا جا رہا ہے ہمارے قدم تباہی کے راستے کی طرف بڑھ رہے ہیں۔"

سوال:۔ دولت کی منصفانہ تقسیم کے لیئے اِسلام کیا ضروری اقدامات تجویز کرتا ہے۔ اور کیا ان کے نفاذ کے لیئے عوامی تحریک کی ضرورت ہے؟

جواب:۔ دولت کی منصفانہ تقسیم کے لیئے سب سے پہلا ضروری

اقدام اسلامی نقطۂ نظر سے یہ ہے کہ:۔

• سُود کو بند کیا جائے۔

• دولت کے ان تمام ذرائع کو ممنوع کیا جائے جنہیں اسلام نے حرام کیا ہے۔

• جو دولت ناجائز طریقوں سے ایک محدود سے محدود طبقے میں مرکوز ہو گئی ہے اس کو اسلامی احکام اور اُصولوں کے مطابق از سرِ نو پُورے معاشرے میں پھیلانے کا انتظام کیا جائے۔

اس اصلاح کے لیئے صرف ایک "عوامی تحریک" کامیاب نہیں ہو سکتی بلکہ اس بات کی ضرورت ہے کہ جمہوری طریقے سے ایک صحیح قسم کی اسلامی حکومت وجود میں آئے جو اسلام کے قوانین کو پوری طاقت کے ساتھ نافذ کرے۔ آئینی طریقِ کار کے بغیر محض کسی عوامی تحریک کے ذریعے سے معاشی نظام کو بدلنے کی جو کوشش بھی جائے وہ بآسانی فساد کی راہ اختیار کر سکتی ہے اور یہاں وہ عناصر بھی موجود ہیں جو اس تحریک کو فساد کی راہ پر ڈالنے کے لیئے بے چین ہیں' اس کے نتیجے میں دولت کی منصفانہ تقسیم تو نہ ہو سکے گی، البتہ اس کا امکان زیادہ ہے کہ جتنی کچھ بے انصافیاں اس وقت پائی جاتی ہیں ان سے زیادہ بے انصافی کا کوئی نظام قائم ہو جائے۔ اسی لیئے ہم ملک میں ایک صحیح جمہوری نظام بحال کرنے کو ضروری سمجھتے ہیں تاکہ آئینی تدابیر سے معاشی نظام کی اصلاح ہو سکے"

سوال:۔ کیا سوشلزم کو اسلام کا معاشی نظام یا اسلام کا جزو قرار دیا جا سکتا ہے؟ نیز اسلامی سوشلزم کو اسلامی مساوات کہنا کس حد تک صحیح ہے؟

جواب:۔ سوشلزم کو اسلام کا معاشی نظام یا ایک جزو قرار دینا یا اسلامی مساوات کے لیئے "اسلامی سوشلزم" کا لفظ استعمال کرنا یا تو ان

لوگوں کا کام ہو سکتا ہے جو نہ اسلام کو جانتے ہیں اور نہ سوشلزم کو۔ یا پھر یہ ان لوگوں کا کام ہو سکتا ہے جو دراصل لانا تو چاہتے ہیں سوشلزم لیکن اس پر اسلام کا لیبل لگانا ضروری سمجھتے ہیں۔ کیونکہ پاکستان کے مسلمانوں کو اسلام کا نام لیئے بغیر فریب میں مبتلا نہیں کیا جا سکتا۔ لوگوں کو خود یہ سوچنا چاہیئے کہ جو چیز عین اسلام ہو اور قرآن و سنت کے احکام اور تعلیمات سے ماخوذ ہو، اس کو آخر اسلام کے سوا اور کوئی نام دینے کی ضرورت کیا ہے؟ اور اگر کوئی چیز باہر سے لائی جائے جو اسلام میں نہیں ہے اور جن کا کوئی ماخذ بھی قرآن و سنت میں نہیں پایا جاتا تو پھر اسلام کا لیبل لگانا کیسے صحیح ہو سکتا ہے؟ اس کو تو پھر اسی نام سے یاد کرنا چاہیئے جو دُنیا میں اس کا معرُوف نام ہے۔ سیدھی بات یہ ہے کہ جو اسلام چاہتا ہو وہ اسلام ہی کا نام لے اور کسی دوسرے ازم کو اس کے ساتھ خلط ملط نہ کرے۔ اور جو کوئی دوسرا ازم چاہتا ہو تو ایک رَاستباز آدمی کی طرح جو کچھ چاہتا ہے وہ صاف صاف کہے اور خواہ مخواہ کی دھوکا بازیاں نہ کرے۔"

سوال:۔ یہ الزام کس حد تک صحیح ہے کہ آپ صرف سوشلزم کی مخالفت کرتے ہیں اور سرمایہ دارانہ اور جاگیر دارانہ نظام کی حمایت کرتے ہیں؟

جواب:۔ میں نے ہمیشہ سرمایہ داری اور سوشلزم دونوں پر لعنت بھیجی ہے اور ہمیشہ دونوں کی علانیہ مخالفت کی ہے۔ میری تحریروں میں دونوں پر سخت تنقیدیں موجود ہیں لیکن جو لوگ سوشلزم کے حامی ہیں انہوں نے یہ طے کر لیا ہے کہ ہر اس شخص کو سرمایہ داروں یا جاگیر داروں کا یا امریکہ یا برطانیہ کا ایجنٹ قرار دیدیں۔ جو یہاں اسلامی نظام چاہتے ہیں۔ اِسلام کو وہ گالی دے نہیں سکتے۔ ایک آدھ مرتبہ "اِسلام مردہ باد" کا نعرہ لگا کر اس کا نتیجہ دیکھ چکے ہیں۔ اِس لیئے اسلامی نظام کے حامیوں کو گالی دینے

کے لیے کوئی اور تدبیر اس کے سوا نہیں ہے کہ انہیں سرمایہ داروں یا جاگیرداروں کا ایجنٹ یا امریکہ اور برطانیہ کا ایجنٹ قرار دے۔"

سوال:۔ مسلم ممالک میں ہر جگہ اشتراکیت کے علمبردار دینی جماعتوں اور اسلامی رہنماؤں کو امریکہ کا ایجنٹ قرار دیتے ہیں۔ یہ بات کس حد تک قرینِ انصاف ہے؟"

جواب:۔ اشتراکیوں کی زبان ساری دُنیا میں یکساں ہے۔ دُنیا میں جہاں بھی اشتراکی بات کرتا ہے۔ ایک ہی طرح کی اصطلاحیں بولتا ہے، ایک ہی طرح کے محاورات استعمال کرتا ہے اور اپنے مخالفوں کو گالیاں دینے کے لیئے بھی اس کی ایک ہی مخصوص زبان ہے، وہی زبان ہمارے ملک میں بھی یہ گروہ استعمال کر رہا ہے۔ سرمایہ داروں کا ایجنٹ، سامراج کا ایجنٹ، امریکہ کا پٹھو، اور اسی طرح کی دوسری گالیاں، ان لوگوں کا تکیہ کلام ہیں، اور ان کے ہاں چونکہ حصولِ مقصد کے لیئے ہر تدبیر استعمال کرنا بالکل حلال ہے اِس لیئے کسی کو کسی کا ایجنٹ یا پٹھو قرار دینے کے لیئے ان کو کسی دلیل یا ثبوت یا شہادت کی حاجت نہیں، جس طریقے سے بھی اپنے مخالف کو بدنام کرنا ممکن ہو اس سے یہ بے تکلف کام لیتے ہیں۔ پھر سامراج بھی ان کے ہاں صرف امریکی اور برطانوی ہے۔ باقی رہا سُرخ سامراج تو اس کا ایجنٹ بننا کوئی گناہ نہیں، بلکہ سراسر قابلِ فخر ہے۔ اسی طرح جاگیردار اور سرمایہ دار صرف وہ ہے جو اشتراکیت کی مخالفت یا اِسلامی نظام کی حمایت کرے۔ قطع نظر اس کے کہ وہ ایک چپہ زمین کا مالک ہو یا نہ ہو۔ اور سرمایہ داری کی اس غریب کو کوئی ہوا بھی نہ لگی ہو۔ باقی رہے ہزار ہا ایکڑ کے مالک، اور کروڑوں روپے کے سرمایہ دار تو اشتراکیت کا کلمہ بلند کرتے ہی نہ وہ جاگیردار رہتے ہیں نہ سرمایہ دار۔"

سوال:۔ آپ کے مخالفین آپ پر انبیاء کرامؑ اور صحابہ کرامؓ کی

توہین کا الزام لگاتے ہیں اس کی اصلیت کیا ہے"؟

جواب:۔ جو لوگ اس طرح کی باتیں کرتے ہیں وہ اپنے نزدیک یہ سمجھتے ہیں کہ سارا ملک ان پڑھ اور جاہلوں سے بھرا ہوا ہے اور یہاں کوئی اس قابل نہیں ہے کہ میری تحریروں کو پڑھ کر ان کا مطلب سمجھ سکے ــــــ میں نے جو کچھ بھی لکھا ہے وہ کہیں ناپید نہیں ہوگیا ہے، ہر جگہ لائبریریوں میں مل سکتا ہے اور بازاروں میں موجود ہے۔ ملک پڑھے لکھے لوگوں سے خالی نہیں ہوگیا ہے۔ وہ ان کتابوں کو خود پڑھ کر یہ رائے قائم کر سکتے ہیں کہ یہ الزامات کہاں تک صحیح ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں ایسے بے بنیاد الزامات کی طرف کبھی توجہ نہیں کرتا اور نہ جواب دینے کی کوئی ضرورت محسوس کرتا ہوں (پھر جو حضرات میرے اوپر توہین صحابہؓ کا الزام لگاتے ہیں۔ ان پر خود علماء کے ایک گروہ نے توہین خدا تک کے الزامات لگائے ہیں) یہاں میں ایک بات کا ذکر ضروری سمجھتا ہوں ــــــ اخبارات میں ان لوگوں کے بیانات سے جن لوگوں کو غلط فہمی لاحق ہو، میں ان کو یہ مشورہ دوں گا کہ وہ جو الزام بھی مجھ پر لگاتے ہیں ان کا حوالہ معلوم کرلیں۔ اور میری اس تحریر کو سیاق و سباق کے ساتھ خود پڑھ کر دیکھ لیں جن کا حوالہ وہ دیں۔ حوالے کے معاملے میں بھی بعض حضرات نے یہ چال چلنی شروع کی ہے۔ کہ وہ "ترجمان القرآن" کے پچھلے پرچوں کے حوالے دیتے ہیں حالانکہ وہ ساری چیزیں جن کا وہ ذکر کرتے ہیں، کتابوں کی شکل میں شائع ہوئی ہیں، لیکن کتاب کا نام وہ اس لیے نہیں دیتے کہ لوگ اصل کتاب حاصل کرکے پڑھ لیں گے۔ پرانے پرچوں کو کون ڈھونڈتا پھرے گا۔

ایک اور عجیب بات یہ ہے کہ جن حضرات کو انبیاء کرام اور صحابہؓ کی عزت کی بڑی فکر ہے۔ انہیں پہلے اگر شرح صدر ہوتا تھا تو نہرو اور گاندھی

کے ساتھ ہوتا تھا اور اب اگر ان کا دل ملتا ہے تو سوشلسٹوں کیساتھ ملتا ہے۔ سارے کیڑے ان کو صرف انہی لوگوں میں نظر آتے ہیں جو یہاں اسلامی نظام قائم کرنے کے لئے کام کرتے ہیں۔ باقی رہے تقسیم سے پہلے کی کانگرس اور تقسیم کے بعد کے اشتراکی ـــــ تو ان کے اندر نہیں پورا اسلام جلوہ گر نظر آتا ہے۔ اب ہر شخص خود دیکھ سکتا ہے کہ ان کے اس نوع کے الزامات کی حقیقت اور وزن کیا ہے؟"

۱۳ر تا ۱۹ر ستمبر ۱۹۶۹ء

ستمبر کی ان تاریخوں میں مراکش کے شہر فاس میں تعلیمی کانفرنس منعقد ہوئی۔ اس کانفرنس میں مسلم اور غیر مسلم سولہ ملکوں کے نمائندے شریک ہوئے۔ پاکستان سے مولانائے محترم مندوب کی حیثیت سے اس کانفرنس میں شریک ہوئے۔ مولانا محترم نے اپنی تعلیمی سکیم کے علاوہ تعلیمی نصاب وضع کرنے والی کمیٹی کے غور و فکر کے لیے چار بنیادی نکات پیش کیے:

۱۔ ہمیں صرف مختلف علوم و فنون کے ماہرین ہی درکار نہیں ہیں بلکہ ایسے ماہر درکار ہیں جو اپنی فکر اور اخلاق کے لحاظ سے مومن اور مسلم ہوں اور ہماری زندگی کے سارے شعبوں کو اسلام کے مطابق چلا سکیں۔ اسلامی تعلیم کا یہ تصور صحیح نہیں ہے کہ اس کو محض تفسیر و حدیث اور فقہ کی اختصاصی تعلیم تک محدود رکھا جائے۔ دراصل ہمیں اُن تمام علوم کو جنہیں دنیوی علُوم کہا جاتا ہے، مسلمان بنانا چاہیئے اور ان سب کے اندر اسلامی رُوح اور فکر داخل کرنی چاہیئے۔ ہمیں محض ڈاکٹر، طبیب، انجینئر، سائنسدان اور علومِ عمرانیہ کے ماہرین درکار نہیں ہیں۔ بلکہ ایسے ماہرینِ علُوم درکار ہیں۔ جو اپنی سوچ اور اپنی ذہنیت کے لحاظ سے اور اپنی عملی زندگی کے لحاظ سے مسلمان بھی ہوں۔ اس غرض کے لیے تمام علوم کی تعلیم میں اسلام کو ایسے طریقے پر داخل کرنے کی ضرورت ہے جس سے اسلامی فکر ان کے ذہن پر غالب ہو سکے اور وہ علومِ عصریہ کو پڑھتے ہوئے مغرب کی الحادی فکر سے مرعوب نہ ہوں۔

۲۔ دُوسرا اہم مسئلہ اخلاقی تربیت کا ہے۔ جو اگر تعلیم کے ساتھ ساتھ نہ ہو تو محض فکری مسلمان عملی مسلمان نہیں بن سکیں گے اور عمل و فکر کا تضاد اپنے بُرے اثرات دکھاتا رہے گا۔

۳۔ تیسرا اہم کام مستشرقین کے فتنے کا مقابلہ کرنا ہے جن میں یہود اور نصاریٰ کے وہ تینوں عناصر شامل ہیں جو یا تو سیاسی اغراض رکھتے ہیں یا مشنری اغراض یا پھر مسلمانوں میں الحاد پھیلانا چاہتے ہیں۔ یہ سب مل کر تحقیق کے نام سے اسلامی تاریخ اور علومِ دینیہ اور اسلامی نظریات کی شکل بگاڑنے میں لگے ہوئے ہیں۔ اسلامی دُنیا کے بکثرت تعلیمی اداروں میں ان کی نام نہاد تحقیقات پڑھائی جارہی ہیں اور ان میں جو خطرناک فتنے چھپے ہوئے ہیں ان سے ہماری نئی نسلیں متاثر ہوتی جارہی ہیں۔ ان سے خبردار کرنے والا لٹریچر مسلمانوں کی طرف سے بہت کم تیار کیا گیا ہے جو نہ ہونے کے برابر ہے۔ متعلمین ہی نہیں بلکہ معلمین تک ان سے دھوکا کھا رہے ہیں۔

۴۔ چوتھی اہم چیز جس کی طرف توجہ کرنے کی خاص ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ تمام مسلمان ملکوں کے ہزاروں نوجوان اس وقت امریکہ اور یورپ اور روس کی جامعات میں جا رہے ہیں اور ان کی دینی اور اخلاقی تعلیم و تربیت کا کوئی انتظام نہیں ہے۔ یہی لوگ واپس آکر مسلمان ملکوں میں اہم مناصب پر فائز ہوتے ہیں اور ان کی کثیر تعداد کے اخلاق و افکار دونوں اسلام کی راہ سے منحرف ہو چکے ہوتے ہیں۔ اس کے لیۓ بہرحال ایسی تدابیر سوچنی چاہئیں کہ ان ممالک میں جانے والے مسلمان نوجوانوں کے دین و اخلاق کی حفاظت کی جا سکے۔ اعلیٰ تعلیم کے لیۓ ان کا جانا تو بہرحال ناگزیر ہے، لیکن ہمارے لیۓ اس نقصان کو برداشت کرنا مشکل ہے کہ ہمارے سب سے زیادہ کار آمد نوجوانوں کی ایک بڑی تعداد اپنی فکر و اخلاق کے لحاظ سے ہم سے بیگانہ ہو جائے اور دوسروں کے رنگ میں رنگ جائے۔

کانفرنس کی مکمل رپورٹ محترم مولانا خلیل احمد حامدی صاحب نے جو

اس سفر میں مولانا محترم کے ساتھ تھے، مرتب کرکے بھیجی تھی جو ترجمانُ القرآن بابت نومبر ۱۹۶۹ء، دسمبر ۱۹۶۹ء میں شائع ہوئی۔

۲۱ ستمبر ۱۹۶۹ء

تعلیمی کانفرنس کے ختم ہونے کے بعد بھی مولانا کئی روز تک مراکش میں رہے۔ اس دوران میں مختلف مصروفیات رہیں۔ علماء اور صحافیوں سے بھی ملاقاتیں ہوئیں۔ ۲۱ ستمبر کو مراکش کے علماء کی نمائندہ تنظیم رابطۃ العلماء کا ایک وفد سیکریٹری جنرل شیخ ابن سعید العلوی کی قیادت میں مولانا محترم سے ملا۔ وفد نے ایک سوالنامہ پیش کیا جس کے جوابات مولانا محترم نے دیئے۔ سوالات اور جوابات درج ذیل ہیں:۔

سوال:۔ آپ ہمیں جماعتِ اسلامی پاکستان کے بارے میں کچھ بتائیں؟

جواب:۔ جماعت اسلامی قائم ہوئے ۲۸ سال ہوچکے ہیں۔ اس جماعت کا مقصد اسلام کو اس پوری شکل اور رُوح کے ساتھ زندگی کے ہر پہلو میں قائم کرنا ہے، خواہ اس کا تعلق عقائد و عبادات سے ہو، یا اخلاق اور معاشرت سے، یا تمدّن و تہذیب سے، یا سیاست اور معیشت سے، یا صلح و جنگ سے۔ ہم دین کو ایک پُورا نظامِ زندگی سمجھتے ہیں۔ اسے اجزاء میں تقسیم نہیں کرتے اور اس کے کسی شعبے کو دوسرے شعبے کی بہ نسبت کم تر اہمیت کا حامل نہیں مانتے۔ اس دین کو پوری طرح قائم کرنے کے لئے جماعتِ اسلامی ہر میدان میں کام کر رہی ہے۔ وہ عقائد اور اعمال و اخلاق کی اصلاح کے لئے بھی کوشاں ہے، سیاسی نظام کی اصلاح کی کوشش بھی کر رہی ہے اور اسلامی قانون کو نافذ کرنے کے لئے تمام ممکن تدابیر عمل میں لا رہی ہے۔"

سوال:۔ کیا پاکستان میں اور بھی اسلامی تحریکیں ہیں؟ اور کیا ان کے درمیان تعاون و یک جہتی ہے؟"

جواب:۔ دوسری اسلامی تحریکیں بھی پاکستان میں کام کر رہی ہیں۔ ایک تحریک علماء میں کام کر رہی ہے جس کا نام اتحاد العلماء ہے۔ ایک اور تحریک طلبہ میں کام کر رہی ہے جس کا نام اسلامی جمعیت طلبہ ہے۔ ایک اور تحریک کسانوں میں کام کر رہی ہے جس کا نام کسان بورڈ ہے۔ ایک اور تحریک مزدوروں میں کام کر رہی ہے جس کا نام لیبر آرگنائزیشن ہے۔ جماعت اسلامی کا اب ان سب کے ساتھ بہت گہرا تعاون ہے۔ اس کے علاوہ متعدد سیاسی جماعتیں ملک میں قائم ہیں جو اپنا مقصد جمہوریت اور اسلامی نظام کا قیام قرار دیتی ہیں۔ سیاسی میدان میں جماعت اسلامی اور ان کے درمیان تعاون ہو رہا ہے۔ ملک میں علماء کی بھی متعدد جماعتیں ہیں جن میں سے صرف ایک اشتراکیت کی حامی ہے اور ہر معاملہ میں اشتراکیوں کا ساتھ دے رہی ہے۔ باقی تمام جماعتیں ان کی اس پالیسی کی مخالف ہیں، اور علماء کی عظیم اکثریت اسلامی نظام کے قیام کی خواہاں اور اس کے لئے کوشاں ہے۔"

سوال:۔ جماعتِ اسلامی نے کتنی کتب شائع کی ہیں اور کتنے اخبارات و رسائل جاری کئے ہیں؟"

جواب:۔ جماعتِ اسلامی نے اب تک تقریباً دو سو سے زائد کتابیں شائع کی ہیں، جو قریب قریب معاشرے کے ہر عنصر کی ضروریات اور حالات کو پورا کرتی ہیں۔ کچھ اہلِ علم کے لیے ہیں اور کچھ خاص طور پر جدید تعلیم یافتہ لوگوں کے لیے۔ کچھ اہلِ سیاست کے لئے ہیں اور کچھ اہل قانون کے لئے۔ کچھ عوام کے لئے ہیں اور کچھ عورتوں اور بچوں کے لئے۔ اس کے علاوہ جماعتِ اسلامی کا لٹریچر ۱۹ زبانوں میں ترجمہ ہو

کر شائع ہو رہا ہے جن میں سے تین یورپین زبانیں ہیں، انگریزی، جرمنی، فرانسیسی۔ کچھ ایشیائی زبانیں ہیں، عربی، فارسی، ترکی، انڈونیشی اور جاپانی۔ کچھ افریقی زبانیں ہیں، سواحلی اور ہاؤسا۔ اور باقی برصغیر ہندو پاکستان کی زبانیں ہیں۔ اس کے علاوہ جماعت اسلامی سے تعلق رکھنے والے مختلف لوگ بنگلہ، انگریزی، اُردو اور سندھی میں متعدد ہفتہ وار، ماہوار اور دو ماہہ پرچے شائع کر رہے ہیں۔ ایک خاص پرچہ ماہوار عورتوں کے لیئے اور ایک ماہانہ بچوں کے لیئے ہے۔"

سوال:۔ کیا جماعت کے اندر عورتوں کی کوئی تنظیم بھی ہے۔ اُس کی سرگرمیوں اور طریقِ کار کی کیا تفصیل ہے؟"

جواب:۔ جماعت کی ایک شاخ مستقل طور پر عورتوں کیلئے ہے جن کے اجتماعات مردوں سے بالکل الگ ہوتے ہیں۔ ان میں عورتیں ہی قرآن و حدیث کا درس دیتی ہیں اور عورتوں میں اشاعتِ دین کا کام کرتی ہیں۔ مردوں کے اجتماعات میں اگر عورتیں مدعو کی جائیں تو وہ پردے کے پیچھے بیٹھتی ہیں۔ جماعت سے تعلق رکھنے والی خواتین حجابِ شرعی کی پُوری پابندی کرتی ہیں اور بے پردگی کے خلاف مسلسل جدوجہد کر رہی ہیں۔ ان میں نہایت اعلیٰ تعلیم یافتہ خواتین بھی شامل ہیں جن میں سے بعض علومِ عصریہ میں ایم اے ہیں اور بعض ڈاکٹرنیاں بھی ہیں۔ یہ سب مردوں اور عورتوں کی مخلوط سوسائٹی سے، اور بے پردگی سے قطعی مجتنب ہیں۔ وہ غیروں کے سامنے سر اور منہ بھی نہیں کھولتیں جسے عرب ملکوں نے حلال کر رکھا ہے۔ اس سلسلے میں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ پاکستان میں جو عورتیں مغربی تہذیب میں غرق ہو چکی ہیں وہ بھی منی اسکرٹ نہیں پہنتیں اور نہ غسل کے لباس میں علانیہ نہاتی ہیں۔ پُورے پاکستان میں آپ کو ایک مسلمان عورت بھی ایسی نہیں ملے گی جو اسکرٹ استعمال کرتی

ہو کجا کہ منی اسکرٹ۔ بے شک انہوں نے سر کھول دیا ہے اور بانہیں بھی برہنہ کر لی ہیں لیکن غنیمت ہے کہ ایران، ترکی اور عربی ممالک کی طرح ابھی تک ان کی پنڈلیاں نہیں کھلی ہیں۔"

سوال:۔ کیا حکومتِ پاکستان دیوانی اور فوجداری معاملات میں اسلامی قانون نافذ کرتی ہے؟"

جواب:۔ نہیں، انگریزوں کے زمانے میں صرف احوالِ شخصیہ (پرسنل لا) تک اسلامی قانون کا استعمال محدود ہو گیا تھا اور وہی کیفیت اب تک باقی ہے۔"

سوال:۔ آپ نے جن اسلامی ملکوں کا دورہ کیا ہے اُن میں اسلام سے انحراف کس حد تک پایا جاتا ہے۔ نیز اُس انحراف کو ختم کرنے کا کیا طریقہ ہے؟"

جواب:۔ تمام بلادِ اسلامیہ میں جہاں بھی میں گیا ہوں یا تو اسلام سے کھلا کھلا انحراف پایا جاتا ہے اور اگر اسلام کا اعتقاد اور اس سے محبت اور اعلائے کلمۃ اللہ کی خواہش موجود ہے تو وہ زبان اور عمل کے تناقض کی شکار ہے، یہی اصل غفلت ہے۔ اس حالت کو بدلنے کا طریقہ میرے نزدیک وہی ہے جسے جماعت اسلامی نے پاکستان میں اختیار کر رکھا ہے۔"

سوال:۔ وہ کونسا بنیادی طریق کار ہے جسے مسلم اقوام کو اختیار کرنا چاہیئے تاکہ وہ اپنی حکومتوں سے یہ تسلیم کرائیں کہ اسلام دین بھی ہے اور ریاست بھی، عقیدہ بھی ہے اور نظام بھی، مصحف بھی ہے اور سیف بھی؟

جواب:۔ تمام مسلمان قوموں کے لیے لازم ہے کہ وہ اپنی اپنی حکومتوں اور ان کے حکام پر یہ بات واضح کر دیں (جس طرح بھی مختلف

ملکوں کے حالات میں ممکن ہو) کہ جب تک وہ اسلام کے مطابق کام نہیں کریں گی اس وقت تک ان کو کسی پہلو میں بھی قوم کی تائید حاصل نہ ہو سکے گی۔ کوئی حکومت بھی دُنیا میں نہ طاقتور ہو سکتی ہے نہ کامیاب، جب تک اس کی پالیسی قوم کے عقیدے اور ضمیر سے مطابقت نہ رکھتی ہو۔ جو حکومت اپنی قوم کے ضمیر اور عقیدے کے خلاف چلتی ہے اس کی ساری قوتیں اپنے ہی گھر میں اپنی ہی قوم کے خلاف لڑنے میں ضائع ہو جاتی ہیں اور اس کا کوئی قدم ترقی کی راہ پر آگے نہیں بڑھ سکتا۔ اس کی نمایاں ترین مثال اسرائیل کے مقابلے میں عرب ریاستوں کی پے در پے شکستیں ہیں جو ۴۸ء سے وہ مسلسل کھا رہی ہیں، حالانکہ اسرائیل میں یہودیوں کی تعداد ڈھائی ملین سے زیادہ نہیں ہے اور عرب ۱۱۰ ملین ہیں اگر اس پر بھی مسلمان حکمرانوں کی آنکھیں نہ کھلیں تو یہ مزید تباہیوں کو دعوت دینے کی ہم معنی ہے۔ اللہ اُن لوگوں کو اپنی تائید سے محروم کر دیتا ہے جو اس کی کتاب رکھتے ہوئے بھی اس سے منہ موڑ رہے ہوں"

سوال:۔ تعلیمی کانفرنس کی قرار دادوں اور فیصلوں کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے؟"

جواب:۔ قرار دادیں اور سفارشیں ساری اچھی ہیں۔ میں نے خود بھی ان سے اتفاق کیا ہے، لیکن جیسا کہ میں نے اپنی آخری تقریر میں کہا ہے، اصل چیز تنفیذ ہے اور ان کی تنفیذ اس کے بغیر نہیں ہو سکتی کہ بلادِ اسلامیہ میں جو لوگ مختلف جامعات کو چلا رہے ہیں ان کے اندر اخلاص اور اسلامی رُوح موجود ہو اور وہ فی الواقع عمل کا ارادہ کریں"

سوال:۔ مسلمان سربراہوں کی کانفرنس کے لیے آپ کون سے بنیادی خطوط تجویز کرتے ہیں جن کی روشنی میں وہ اپنے فیصلے صادر کرے؟"

جواب:۔ اس بات کو میں اپنی تقریر میں بیان کر چکا ہوں جو سانحہ

مسجد اقصیٰ کے عنوان پر میں نے حال میں کی ہے اور جس کا عربی ترجمہ مراکش کے بعض اخبارات میں شائع ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ اب سے دو تین سال پہلے میں نے ۱۳۔۱۴ تجاویز اُس وقت پیش کی تھیں جب سومالی لینڈ کے صدر اور شاہ فیصل کی طرف سے مسلم ممالک کے سربراہوں کی کانفرنس منعقد کرنے کی تحریک ہوئی تھی۔ میں نے ان تجاویز میں متعدد ایسے مسائل کی نشان دہی کی تھی جو تمام عالمِ اسلامی کے مشترک مفاد سے تعلق رکھتے ہیں اور جنہیں مسلمان حکومتیں مل کر ہی حل کر سکتی ہیں۔"

سوال:۔ شاہ حسن ثانی کے عام مواقف اور خاص طور پر اسلامی کانفرنس کے انعقاد کے لئے ان کی دعوت کے بارے میں پاکستانی مسلمانوں کے تاثرات کیا ہیں؟"

جواب:۔ اسرائیل کے مقابلہ میں عربوں کی شکست کے موقع پر جتنے بیانات بھی عالمِ اسلامی کے اکابر کی طرف سے شائع ہوئے تھے ان میں سب سے زیادہ جس بیان کو پاکستانیوں نے پسند کیا وہ مولائے حسن الثانی کا بیان تھا۔ اور اب پورا پاکستان سربراہوں کی اس کانفرنس کے انعقاد پر شاہ حسن کی تعریف کر رہا ہے اور دُعا کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی اس سعی میں برکت عطا فرمائے۔"

سوال:۔ عالمِ اسلامی اور علی الخصوص مراکش میں پائے جانے والے اخلاقی انحطاط اور فسق و فجور کے مظاہر کے بارے میں آپ کا کیا تاثر ہے؟"

جواب:۔ بلادِ عربیہ اور بعض دوسرے بلادِ اسلامیہ میں عورتوں کی بے پردگی اور بے حیائی کا فتنہ جس حد تک پہنچ گیا ہے اور علانیہ فسق و فجور کے جو مظاہرے ہو رہے ہیں انہیں دیکھ کر مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ

شاید مسلمان اُس عذاب کو بھی کافی نہیں سمجھتے جو مغربی استعمار کی شکل میں اُن پر نازل ہُوا تھا۔ بجائے اس کے کہ وہ اس بات پر اللہ کا شکر ادا کرتے کہ اس نے اِس عذاب سے اُن کو نجات دے دی، وہ کسی مزید اور سخت تر عذاب کو دعوت دے رہیں۔ خصوصًا مجھے عربی بولنے والی قوموں پر سخت حیرت ہوتی ہے جن کی زبان میں قرآن نازل ہُوا ہے اور جن کی زبان میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے کلام فرمایا ہے۔ وہ براہِ راست خود دیکھ سکتے ہیں کہ عورتوں کے متعلق اللہ اور رسُول نے کیا ہدایات دی ہیں۔ غیر عرب مُسلمان تو پھر بھی یہ عذر پیش کر سکتے ہیں کہ وہ قرآن وحدیث کی زبان سے ناواقف ہیں، لیکن میں نہیں سمجھتا کہ اہلِ عرب خُدا کے سامنے اس بے حیائی کے لئے کیا عذر پیش کریں گے جو ان کی موجودہ نسل اختیار کر رہی ہے۔"

سوال:۔ رابطۃُ العلماء کے ارکان کے لئے آپ کی نصیحت اور مشورہ کیا ہے؟"

جواب:۔ رابطۃُ العلماء کو میری نصیحت یہ ہے کہ یا تو وہ خود ایک سیاسی جماعت کی حیثیت سے اُٹھیں اور اپنے بل بوتے پر اقامتِ دین کی دعوت اہلِ مراکش کو دیں، یا اگر کسی سیاسی پارٹی کے ساتھ تعاون کریں تو اِس شرط کے ساتھ کریں کہ وہ تناقض اور نفاق سے بری ہو کر سیدھا سیدھا اِسلام قائم کرنے کے لئے تیار ہو۔ اُس کی پالیسی بنانے میں علماء کو دخیل ہونا چاہیئے۔ عُلماء کی یہ حیثیت نہیں ہونی چاہیئے کہ وہ فقط سیاسی پارٹیوں کے دُعاگو بن کر رہیں یا اپنے اثر سے مسلمانوں میں اُن کا اعتماد تو قائم کر دیں مگر ان کی پالیسی بنانے میں ان کا کوئی دخل نہ ہو۔ اسکے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ علماء علُومِ عصریہ سے واقفیت پیدا کریں تاکہ موجودہ نوجوان نسل کو وہ سمجھ سکیں اور ان کی مشکلات کو وہ حل کر سکیں۔

اگر علماء نے اس معاملے میں غفلت برتی تو صرف پُرانے طرز کے دیندار اُن کے ساتھ رہ جائیں گے اور نئی نسل کو راہِ راست دکھانے میں وہ ناکام ہو جائیں گے۔ علماء کو یہ استعداد اپنے اندر پیدا کرنی چاہیئے کہ وہ نئی نسل کو اپنی بات سمجھا سکیں اور ان کی ذہنیت کے مطابق اُن کی تفہیم کر سکیں۔

۱۰ر جنوری ۱۹۷۱ء

دسمبر ۱۹۷۰ء کے انتخاباتِ عام کے حوصلہ شکن نتائج کا عوام پر اعصاب شکن اثر پڑا۔ ان حالات میں مولانا محترم نے کارکنوں کے سامنے جماعت کا مؤقف واضح فرمایا۔

۱۰ر جنوری کو رشید پارک اچھرہ میں کارکنانِ جماعت کے ایک بڑے اجتماع سے مولانا محترم نے خطاب فرمایا۔ اس تقریر کو جناب حفیظ الرحمٰن احسن صاحب نے ٹیپ ریکارڈ سے اُتار کر مولانا محترم کی خدمت میں پیش کیا، چنانچہ انھوں نے اس کے تقریری انداز کو تحریری اسلوب میں بدل دیا۔ اس طرح یہ تقریر گویا مولانا محترم ہی کی لکھی ہوئی تحریر بن گئی۔ یہ تقریر ہفت روزہ آئین میں شائع ہو چکی ہے۔ آئین کے شکریہ کے ساتھ اسے کتاب میں شامل کیا جا رہا ہے۔

خطبۂ مسنونہ کے بعد فرمایا:۔

"کارکنانِ جماعت کو خطاب کرنے میں ابھی کچھ تامل کر رہا تھا اور چاہتا تھا کہ انتخابات کے نتائج سے جو گرما گرمی پیدا ہوئی ہے وہ ذرا کچھ اور ٹھنڈی ہولے اس کے بعد اظہارِ خیال کروں تاکہ نسبتاً پُرسکون ماحول میں لوگ اچھی طرح سوچنے سمجھنے کے لئے تیار ہو جائیں، لیکن میں نے یہ محسوس کیا کہ انتخابات کے نتائج جس طرح غیر متوقع طور پر نکلے ہیں اس کی وجہ سے بہت سے ذہنوں میں ایک طرح کا اضطراب پیدا ہو گیا ہے۔ جو لوگ جماعتِ اسلامی کے ساتھ بہت پہلے سے وابستہ رہے ہیں اور مدتوں سے اس تحریک میں کام کر رہے ہیں، ان کے دل تو خدا کے فضل سے ہر اضطراب

سے محفوظ ہیں، وہ پوری طرح مطمئن ہیں کہ جس راستے پر ہم
چل رہے تھے ٹھیک چل رہے تھے، اسی راستے پر ہمیں
آگے چلنا ہے اور جو کامیابی ہمیں مطلوب ہے وہ اسی
راستے پر چلتے ہوئے حاصل ہو سکتی ہے، اس لیئے ان کے
اندر تو کوئی اضطراب، کوئی بے چینی یا کسی قسم کی گھبراہٹ موجود
نہیں ہے، لیکن ایک کثیر تعداد جو قریب کے زمانے میں اس
تحریک کے ساتھ وابستہ ہوئی ہے اس کے اندر کچھ اضطراب
پایا جاتا ہے اور اس اضطراب کو بڑھانے میں وہ بہت
سے تبصرے بھی حصّہ لے رہے ہیں جو اخبارات و رسائل میں
ان نتائج کے متعلق لکھے جا رہے ہیں۔ اس لیے میں نے یہ
مناسب سمجھا کہ یہاں کارکنوں کو مخاطب کروں، اور یہی بات
جو کہ میں کہہ رہا ہوں وہ جماعت کے تمام حلقوں تک پہنچا
دی جائے تاکہ ہمارے ساتھ کام کرنے والے سب لوگ
اچھی طرح سمجھ لیں کہ ہم کس مقصد کے لیئے اُٹھے تھے، کیا طریقِ
کار ابتدا سے ہمارے سامنے تھا، اس طریقِ کار کے لحاظ
سے ہم اپنے مقصد کی طرف کس طرح پیشقدمی کرتے رہے
ہیں اور آگے کس طرح ہمیں اپنی منزل کی طرف بڑھنا ہے۔

آپکو یاد ہوگا کہ ابھی چند مہینے پہلے جماعتِ اسلامی کے
تیسویں یومِ تاسیس کے موقع پر جو تقریر میں نے کی تھی اس
میں یہ بتایا تھا کہ جماعتِ اسلامی کوئی ایسی جماعت نہیں ہے
جو کسی اتفاقی واقعہ کے طور پر یکایک وجود میں آگئی ہو بلکہ یہ
برسوں کے غور و خوض کے بعد ایک سوچی سمجھی سکیم کے تحت
بنی ہے اور پچھلے تیئیس سال کے دوران میں یہ ایک ایک قدم

خوب سوچ سمجھ کر اُٹھاتی رہی ہے۔ ایسی سوچی سمجھی سکیموں پر وقتی تغیرات اور وقتی حوادث کی بنا پر کسی گھبراہٹ میں کوئی نظرثانی نہیں کی جا سکتی۔ کوئی چیز ایسی پیش نہیں آگئی ہے جو ہمارے لیۓ غیر متوقع ہو۔ ہم نے جب کام شروع کیا تھا اسی وقت ہمیں یہ اندازہ تھا کہ ہم ایک بہت بڑا کام لے کر اُٹھے ہیں۔ سخت ناسازگار ماحول میں اُٹھے ہیں۔ بڑے خارزار میں قدم رکھ رہے ہیں۔ سخت موانع اور مزاحمتوں سے ہمیں سابقہ پیش آنا ہے۔ اب تک جو مشکلات ہماری راہ میں آئی ہیں انسے بہت زیادہ کے لیۓ ہم تیار تھے اور ان کے مقابلے کا عزم کرکے ہی ہم نے کام شروع کیا تھا۔ الحمدللہ ابھی تک ہمیں اتنے سخت حالات سے سابقہ پیش نہیں آیا ہے اور انشاء اللہ آئندہ بھی پیش نہیں آسکے گا جن کا آغاز کرتے وقت ہمیں اندازہ تھا اور جن کی توقع رکھتے ہوئے ہم اپنے مقصد کو لیکر اُٹھے تھے۔

میں مختصر طور پر سب سے پہلے آپ کو یہ بتاؤں گا کہ ہمارا وہ مقصد کیا تھا تاکہ اس کی نوعیت اور اہمیت آپ کے ذہن میں تازہ ہو جائے اور آپ یہ جان لیں کہ وہ کوئی قریبی اور سہل الحصول مقصد نہ تھا۔ ہم یہ چاہتے تھے کہ اسلام کے کسی ایک جز کو نہیں بلکہ پورے کے پورے اسلام کو ایک مکمل نظامِ زندگی کی حیثیت سے عملاً قائم کیا جائے۔ اسلام ایک ایسے نظامِ زندگی کا نام ہے جس کی بنیاد چند عقائد پر رکھی گئی ہے۔ اللہ وحدہٗ لاشریک کو خالق، مالک، رب، معبود، حاکم اور شارع تسلیم کرنا، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو برحق رہنما

تسلیم کرنا، اللہ کی کتاب اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو ہدایت کا اصل ماخذ ماننا اور یہ یقین رکھنا کہ اصل زندگی یہ دُنیا کی زندگی نہیں بلکہ آخرت کی کامیابی مطلوب ہے اور آخرت میں ہم اسی طرح کامیاب ہو سکتے ہیں کہ اس دُنیا میں ہم اس نظامِ زندگی کی پیروی کریں جو اللہ اور اس کے رسُول صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو دیا ہے، ہر اس نظامِ زندگی کو رد کر دیں جو اس کے خلاف ہو اور اس کوشش میں اپنی حد تک کوئی کسر نہ اُٹھا رکھیں کہ اللہ کے دین کے سوا کوئی دوسرا دین ہم پر غالب نہ ہو سکے بلکہ اللہ کا دین ہی سب پر غالب ہو۔

ان عقائد کی بنیاد پر جو نظامِ حیات مرتب ہُوا ہے اس کی پُوری عمارات ان عبادات پر قائم کی گئی ہے جنہیں ارکانِ اسلام قرار دیا گیا ہے، کیونکہ یہی وہ ستون ہیں جن پر یہ عمارت کھڑی رہ سکتی ہے۔ ان میں سے کوئی ایک ستون بھی خواہ وہ نماز ہو یا روزہ یا حج یا زکوٰۃ، اگر ہمارے معاشرے میں ساقط ہو جائے تو یہ معاشرہ اسلامی نظامِ زندگی پر چلنے کے قابل نہیں رہ سکتا، پھر انہی عقائد پر اخلاقیات کا ایک پُورا نظام قائم کیا گیا ہے جس کی اصل رُوح ایمان باللہ اور ایمان بالیوم الآخر ہے، اور تمام ملحدانہ، مادہ پرستانہ اور مشرکانہ اخلاقیات سے اپنی رُوح اور شکل میں بالکل مختلف ہے۔ اسلامی نظامِ زندگی کبھی ایک لمحے کے لیئے بھی نہیں چل سکتا۔ اگر اس کے اندر اسلامی اخلاق کارفرما نہ ہوں اور ان کی جگہ مادہ پرستانہ یا کسی اور قسم کے کافرانہ اخلاق کام کرنے لگیں۔ اس کے بعد انہیں عقائد و عبادات اور اخلاقیات پر معاشرت، تہذیب

تمدن، تعلیم، سیاست، قانون عدالت اور معیشت کا ایک پُورا اور ہمہ گیر نظام قائم ہوتا ہے جس کی ہر چیز اپنے اصُولوں اور اپنی عملی صُورتوں کے لحاظ سے دُنیا کے ہر دُوسرے نظام سے قطعی مختلف ہے۔ اور اس سے جو نتائج مطلوب ہیں وہ بھی ان نتائج سے بالکل مختلف ہیں جو دوسرے نظاموں کے مطلوب و مقصود ہیں۔ ہم محض اس مذہبی عقیدت کی بناء پر نہیں جو ہمیں وراثتاً اپنے اسلاف سے ملی ہے بلکہ خود اپنے فہم و شعور کی بنا پر بھی یہ یقین رکھتے ہیں کہ انسان کو دُنیا میں جس عدل اور خیر اور بھلائی کی ضرورت ہے وہ صرف اسی نظام سے حاصل ہو سکتی ہے۔ دوسرا ہر نظام ہمارے لئے اور پُوری انسانیت کے لئے تباہ کُن ہے۔"

وہ مقصد کیا ہے جسکے لئے ہم اُٹھے رہیں

"ہمارا مقصد جس کے لئے ہم کھڑے ہوئے تھے اسی نظام کو عملاً قائم کرنا تھا۔ ہم اس بات کو اچھی طرح سمجھتے تھے کہ یہ نظام ہمیں قائم کرنے کے لئے دیا گیا ہے صرف اس لئے نہیں دیا گیا کہ ہم بس اس کے معتقد ہو کر رہ جائیں اور عملاً کوئی دوسرا نظام دُنیا میں اور خود ہمارے اپنے معاشرے میں چلتا رہے۔ ہم یہ بھی جانتے تھے کہ اس کی خوبیوں کا فائدہ ہمیں اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے جبکہ وہ واقعی ہماری زندگی میں کارفرما ہو، محض اس کی تعریف و تحسین کوئی فائدہ نہیں دے سکتی جبکہ ہمارا سارا کاروبار زندگی اس کے خلاف کسی اور نظام پر چل رہا ہو۔ ہمیں یہ بھی یقین تھا کہ محض اس نظام کی خوبیوں

کو بیان کر دینا، ان پر کوئی وعظ کہہ دینا یا کوئی کتاب لکھ دینا یا اس کی تبلیغ کرتے پھرنا کبھی نتیجہ خیز نہیں ہو سکتا۔ جب تک باقاعدہ جدوجہد کر کے دُنیا کے کسی حصے میں، خُدا کی زمین پر کسی خطے میں، اسے بالفعل قائم نہ کر دیا جائے اور زندگی کا نظام اسی پر نہ چلنے لگے۔ دُنیا اس کے برحق ہونے کی قائل نہیں ہو سکتی اگر وہی قوم جو اس کے ماننے کا دعوےٰ کرتی ہے، خود اس کی پیروی نہ کرے۔ اور دُنیا اس کی قائل ہو سکتی ہے تو اسی صُورت میں جبکہ وہ اپنی آنکھوں سے یہ دیکھ لے کہ رُوئے زمین کے ایک خطے میں اس نظام پر عمل کر کے فی الواقع انسانی فلاح کے لیئے کیا کام ہوا ہے، ظلم کس طرح مٹایا گیا ہے، عدل کس شان سے قائم کیا گیا ہے، معاشرے کو جرائم سے کس طرح پاک کیا گیا ہے۔ انسانی اخلاق کو کسطرح انفرادی اور اجتماعی حیثیت سے بلند کیا گیا ہے۔ انسان کو اپنی اخلاقی و رُوحانی اور مادی ترقی کے لیئے جن اُصولوں کی ضرورت ہے وہ یہاں کس خُوبی کے ساتھ عمل میں لائے گئے ہیں اور ان کے کیا نتائج برآمد ہوئے ہیں ظاہر بات ہے کہ جب تک کسی مقام پر عملاً اس کا مظاہرہ نہیں کیا جاتا اور واقعات کی دُنیا میں ہر دوسرے نظام سے اس کی برتری ثابت نہیں کر دی جاتی۔ محض وعظ و تلقین سے کام نہیں چل سکتا۔ اس لیئے ہمارے پیشِ نظر محض اِسلام کی تبلیغ کرنا نہ تھا بلکہ یہ تھا کہ اس نظام کو عملاً قائم کیا جائے اور اس کے لیئے وہی سرزمین فطری طور پر ہماری کارگاہ بن سکتی ہے جس میں ہم رہتے ہیں۔

یہ تھا وہ مقصد جس کے لیئے جماعت اسلامی قائم کی گئی تھی

اور اسی مقصد کے لیئے ہم نے جماعت کی تاسیس کے پہلے ہی دن یہ اعلان کر دیا تھا، جسے آپ ہمارے اوّلین اجتماع کی روئداد میں دیکھ سکتے ہیں کہ ہم پُورے کے پُورے اسلام کو ایک تحریک بنا دینا چاہتے ہیں۔ اس موقع پر آپ یہ اچھی طرح سمجھ لیں کہ پُورے اسلام کو تحریک بنا دینے کا مطلب کیا ہے۔ اگر کوئی شخص اسلام کا قائل ہے اور اس کے مطابق خود زندگی بسر کر رہا ہے تو یہ تحریک نہیں ہے بلکہ ایک شخص کا عقیدہ اور عمل ہے۔ اگر وہ اسلام کے کسی جُز مثلاً نماز یا روزے کو لیکر اس کو رواج دینے کے لیئے دوڑ دھوپ کر رہا ہے، تو یہ تحریک ہے مگر پُورے اسلام کی نہیں بلکہ اس کے کسی جُز کی تحریک ہے، لیکن اگر وہ عقائد سے لے کر عبادات، اخلاق تہذیب، معاشرت، تعلیم، قانون، عدالت، سیاست اور معیشت تک ہر شعبۂ زندگی میں اسلام کو قائم کرنے کی جدّوجہد شروع کر دیتا ہے تو اسی کا نام پُورے اسلام کو ایک تحریک بنا دینا ہے۔ اسی معنی میں ہم نے آج سے تیس سال پہلے اِسلامی تحریک کا آغاز کیا تھا، اور جماعت اسی غرض کے لیئے قائم کی گئی تھی کہ وہ اسلام کو اس سرزمین کا غالب نظام بنانے کے لیئے جدوجہد کرے۔

جماعتِ اسلامی کی تشکیل میں جو بات ہمارے پیشِ نظر تھی وہ یہ تھی کہ اس میں ان لوگوں کو شامل کیا جائے جو اسلامی تحریک کے لیئے موزوں کارکن بن سکتے ہوں اور اس کے لیئے تین چیزیں بہر حال ضروری تھیں ایک یہ کہ وہ اسلام کے محض قائل ہی نہ ہوں بلکہ اسے عملاً اپنی زندگی پر نافذ کریں، اس

کے عائد کردہ فرائض ادا کریں اور اس کی حرام کی ہوئی چیزوں سے کم ازکم کبائر سے پرہیز کریں، کیونکہ جو شخص خود اپنے اُوپر اسلام کو نافذ نہیں کرتا وہ دُنیا پر اسے نافذ کرنے کی بات کیسے کرسکتا ہے! دُوسرے یہ کہ وہ جماعت کے مقصد کو خود اپنی زندگی کا مقصد قرار دیں اور اس کے لئے اپنا وقت، اپنی محنتیں، اپنی قابلیتیں، اپنے مال اور اپنی جان کھپا دینے پر آمادہ ہوجائیں۔ تیسرے یہ کہ وہ خود سر اور آزاد رَو نہ ہوں بلکہ جماعت کے نظم وضبط اور اس کے ڈسپلن کی پابندی قبول کریں۔ اس طرح جماعتِ اسلامی کے نام سے دراصل ایک متعین مقصد کے لیے ایک تحریک کے منظم کارکنوں کی جماعت بنائی گئی تھی۔ یہ کوئی قومی جماعت نہیں تھی جو قوم کی نمائندہ بننے کے لئے اُٹھتی اور ہر وہ شخص جو دو آنے یا چار آنے دے کر اس کی ممبری کا فارم بھر دیتا وہ اس کا ممبر بنالیا جاتا۔ جو مقصد ہمارے سامنے تھا اس کے لیے دو چار آنے والے ممبر کسی طرح موزوں نہیں ہو سکتے تھے۔ اس کے لئے تو وہی لوگ کارآمد ہوسکتے تھے جو اسلام کی پیروی میں مخلص ہوں سیرت وکردار کے لحاظ سے قابلِ اعتماد ہوں۔ تحریکِ اسلامی کے مقصد کو اپنی زندگی کا مقصد بنائیں، اس کے لئے منظم طریقے سے کام کریں اور اس کو کامیاب بنانے کی خاطر جان و مال کی بازی لگادیں۔ اس حد تک جو لوگ آگے بڑھنے کیلئے تیار نہ تھے مگر ہمارے مقصد سے ہمدردی اور اتفاق رکھتے تھے ان کو ہم نے متفق کی حیثیت سے اپنے ساتھ شامل کیا۔ اور ہماری کوشش ہمیشہ یہی رہی کہ ان میں سے زیادہ سے

زیادہ لوگ کارکن متفق بنیں اور پھر اتفاق کے مقام سے آگے بڑھ کر رُکن بن جائیں۔ یہی چیز ہے جس پر جماعت سے ناواقف لوگ آئے دن اعتراض کرتے رہتے ہیں کہ جماعت نے اپنے آپ کو ایک خول میں بند کر رکھا ہے اور وہ اپنی رُکنیت کا دروازہ عام لوگوں کے لیے کھول کر ایک عوامی جماعت نہیں بنتی۔ حالانکہ اگر کوئی شخص تھوڑی سی بھی غور و فکر کی زحمت اُٹھائے تو وہ سمجھ سکتا ہے کہ جو مقصد ہمارے پیشِ نظر ہے وہ اگر پورا ہو سکتا ہے تو صرف اس طرح کہ ہمارے معاشرے میں ایماندار، مخلص اور قابلِ اعتبار سیرت و کردار رکھنے والے کارکنوں کا ایک منظم گروہ ایسا پیدا ہو جائے جس کی کارکردگی کو دیکھ کر عوام بالآخر اس پر بھروسہ کرنے لگیں۔ اور جس سے وہ یہ اُمید کر سکیں کہ اگر وہ اپنے معاملات اس کے ہاتھ میں دیں گے تو وہ کھوٹا نہیں بلکہ کھرا ثابت ہوگا۔"

ہمیں معلوم تھا کہ یہ کام آسان نہیں

"اب میں آپ کو بتاتا ہوں کہ جس وقت ہم نے یہ کام شروع کیا تھا اسے کوئی ہلکا اور آسان کام سمجھ کر شروع نہیں کیا تھا۔ ہمیں پُورا اندازہ تھا کہ کیسے سخت ناسازگار حالات میں ہم یہ کام کرنے اُٹھے ہیں۔ ایک مدت دراز کے مسلسل انحطاط نے ہمیں زوال کی اس حد پر پہنچایا تھا کہ ایک کافر حکومت کے ہم غلام بنے۔ پھر اس کافر حکومت نے ڈیڑھ دو سو برس کے اندر اپنی تعلیم کے ذریعے سے ہمارے خیالات

بدل ڈالے اور ہمارے عقائد کی جڑیں تک ڈھیلی کر دیں۔ اپنی تہذیب کے اثرات ڈال کر ہمارے اخلاق بدل ڈالے اور ہماری قدریں تک تبدیل کر دیں۔ اپنے قوانین کے ذریعے سے ہمارے معاشرتی ڈھانچے کو تلپٹ کر کے رکھ دیا۔ اپنے معاشی نظام کو مسلّط کر کے ہمارے ہاں سرمایہ داری اور ظالمانہ استحصال کو اس حد تک فروغ دیا کہ ہماری پُوری معیشت از سرتا پا بیمار ہو کر رہ گئی۔ اپنی استعماری سیاست سے ہمارے ہاں ان ذلیل خصائل کو فروغ دیا جو ہمیشہ غلام قوموں میں پیدا ہو جاتے ہیں۔ اس حکومت کے تحت پروان چڑھ کر جو طبقے ہمارے ہاں اُبھر کر اُوپر آئے، جن کو ہماری قومی زندگی میں اثر و رسُوخ حاصل ہوُا، جن کے ہاتھ میں وہ اصل طاقت آئی جو کسی قوم کی قیادت و رہنمائی کرتی ہے اور اس کے مُعاملاتِ زندگی کو چلاتی ہے، وہ وہی طبقے تھے جن کو مغربی تعلیم و تہذیب اپنے نظریات سے، اپنے فلسفۂ زندگی سے اور اپنے طرزِ زندگی سے بُری طرح متاثر کر چکی تھی اور جتنے زیادہ وہ اس سے متاثر ہوئے تھے اتنے ہی وہ اسلامی نظامِ زندگی سے دُور ہو چکے تھے۔

اب میں اختصار کیساتھ آپ کو یہ بتاؤں گا کہ تیس سال پہلے جب ہم نے کام شروع کیا تھا اس وقت مسلمانوں کی حالت کیا تھی اور اب کیا ہے۔ اس وقت ان کی بہت بڑی تعداد اسلامی عقائد کے بارے میں سخت شکوک رکھتی تھی۔ اِسلامی عبادات کو بے معنی سمجھتی تھی۔ اخلاق کے مُعاملہ میں اس کے تصورات اور اعمال دونوں مغربی اخلاقیات کے

سانچوں میں ڈھل چکے تھے۔ یہ لوگ اس بات سے بالکل خالی الذہن تھے کہ اسلام خود اپنا کوئی نظامِ زندگی رکھتا ہے جو ہر شعبۂ حیات پر حاوی ہے۔ جو تعلیم انہوں نے پائی تھی اس میں ہر دوسرے سیاسی نظام کا ذکر تھا مگر اسلامی ریاست نامی کسی چیز کا کوئی تصور نہ پایا جاتا تھا۔ اس میں دُنیا کے سب معاشی نظاموں کے متعلق انہیں معلومات ملتی تھیں، مگر اسلام کے معاشی نظام کا نام ونشان تک اس کے اندر نہ تھا اور سود کی حُرمت کو تو وہ قطعی ناقابلِ عمل سمجھتے تھے کیونکہ اس کے بغیر ان کے نزدیک کوئی مالی نظام نہ چل سکتا تھا۔ اسلامی قانون کو وہ ایک فرسودہ قانون سمجھتے تھے اور یہ ماننے کے لیۓ تیار نہ تھے کہ اس زمین میں بھی وہ نافذ کیا جا سکتا ہے۔ حتیٰ کہ اس قانون کے جس حصّۓ یعنی پرسنل لاء کو انگریزی حکومت نے برقرار رکھا تھا، اس کے بھی بعض مسائل مثلاً تعدّد ازواج کو وہ مغربی اقدار کے لحاظ سے قابلِ اعتراض سمجھتے تھے۔ اسی طرح یہ بات ان کے ذہن میں کسی طرح نہ سماتی تھی کہ کوئی اسلامی نظامِ تعلیم بھی ہو سکتا ہے۔ وہ سمجھتے تھے کہ جو نظامِ تعلیم اس وقت دُنیا میں رائج ہے۔ بس یہی ایک نظامِ تعلیم ہمارا بھی ہو سکتا ہے اور اسی سے ہمارا کام چل سکتا ہے۔ اسلامی نظامِ تعلیم نام کی کوئی چیز نہیں ہے اور اگر ہے تو ان مدرسوں اور مسجدوں میں ہے جو پانچ سو برس پہلے کی دُنیا میں رہتے ہیں۔ کوئی ایسا نظامِ تعلیم ان کے نزدیک سرے سے ہو ہی نہیں سکتا تھا جس میں جدید ترین علوم اسلامی نقطۂ نظر سے پڑھاۓ جا سکتے ہوں اور بیسویں

صدی ہی میں نہیں بلکہ اکیسویں اور بائیسویں صدی میں بھی انسان کو اپنے وقت کی بہترین ترقی یافتہ ریاست اسلامی اُصولوں کے مطابق چلانے کے قابل بنا سکتا ہو۔ غرض یہ تھی ہمارے اہلِ دماغ، تعلیم یافتہ، بااثر اور کارفرما طبقے کی ذہنی حالت جسے دُنیا بھر کی غالب تہذیب اور افکار و نظریات اور فلسفوں کی پُشت پناہی حاصل تھی اور جسے خُود ہمارے ملک کا پُورا نظامِ تعلیم و تہذیب پرورش کر رہا تھا۔ اسی گروہ سے ملحدانہ نظریات کی تبلیغ کرنے والے اُستاد اور ادیب اور اہلِ قلم اُٹھے اور اسی سے نکل کر اشتراکیت کے علمبردار میدان میں آئے۔ بیرونی دُنیا میں ان دونوں قسم کے لوگوں کے ہاتھ مضبوط کرنے کے لیئے عالمی طاقتیں موجود تھیں، تاہم تعلیم یافتہ گروہ کے ایک بڑے حصّے کو اسلام کیساتھ جذباتی وابستگی ضرور تھی جس کی وجہ سے وہ اسلام کو چھوڑ کر کوئی کھلا کھلا کفر اختیار کرنے کے لیئے تیار نہ تھا، البتہ وہ اسلام سے تقریباً نابلد تھا اور سرسَری واقفیت سے بڑھ کر اسے کچھ معلوم نہ تھا کہ اسلام کا نظامِ زندگی کیا ہے۔

ہمارے نزدیک یہ ضروری تھا کہ سب سے پہلے ہم اس ناواقفیت کو دُور کریں۔ اس طبقے کو اسلامی عقائد ایسی زبان میں اور ایسے دلائل کے ساتھ سمجھائیں جس سے وہ مطمئن ہو کر ان کو برحق تسلیم کرے۔ اسلامی عبادات کی معنویت ایسے طریقے سے بتائیں کہ وہ ان کی پابندی کو عار سمجھنا چھوڑ دے، اور ان کی حقیقی اہمیت کو محسُوس کرے۔ اسلامی اخلاق اور مادہ پرستانہ اخلاقیات کا فرق اس کے سامنے واضح کریں اور اسلام کے

دیئے ہوئے اخلاقی اُصولوں کی برتری کا اسے قائل کریں
۔ پھر اس کو تفصیل کے ساتھ بتائیں کہ اسلام اس دور میں
انسان کو کیا رہنمائی دیتا ہے اور اس دور کی ایک متمدن اور ترقی
یافتہ قوم، بلکہ ایسی قوم جو دُنیا میں قوموں کی امام بن سکے۔
اسلامی نظام کی پیروی کر کے کیسے تیار ہو سکتی ہے اور اس
کے لیئے کس طرز کی تعلیم و تربیت درکار ہے۔ اسلام کا قانون
کس طرح انسانی معاشرے میں حقیقی عدل و انصاف قائم کرتا ہے۔
اسلام کا نظامِ معیشت کس طرح ہمارے تمام معاشی مسائل کو
حل اور معاشی بے انصافیوں کا خاتمہ کر سکتا ہے۔ اس تفہیم
کے بغیر ہمارے نزدیک یہ ممکن نہ تھا کہ اسلامی نظامِ زندگی کا
خواب کبھی شرمندۂ تعبیر ہو سکتا ہے، کیوں کہ اسی ذریعے سے
وہ کارکن تیار ہو سکتے تھے جو دُنیا کے غالب نظاموں کے مقابلے
میں کوئی طاقت ور تحریک ہمارے ملک میں برپا کر سکیں،
عوام کو اس نظام کے لیئے تیار کر سکیں جو ہم قائم کرنا چاہتے
ہیں اور جب وہ مرحلہ آئے جس میں اس کا قیام ممکن ہو تو اسے
کامیابی کے ساتھ چلا سکیں۔"

دشمن کو اپنا ھدف معلوم ہے

"جماعتِ اسلامی کا یہی وہ کام ہے جس کی وجہ سے اسلام
کی مخالف تمام عالمی طاقتوں نے جو نہیں چاہتیں کہ پاکستان
ایک اسلامی ریاست بنے، یہ اچھی طرح سمجھ لیا کہ اس ملک میں
اگر کوئی طاقت ہے جو ان کی خواہشات کے علی الرغم اسے
اِسلامی ریاست بنا سکتی ہے تو وہ جماعتِ اسلامی ہے۔ اسی

لیے انہوں نے اپنی تمام طاقتیں اس کو شکست دینے پر مرکوز کر دیں۔

آپ یورپ اور امریکہ کے مصنفین کی کتابیں، مغربی صحافت کے مضامین اور اشتراکی بلاک کی نشریات جو پاکستان کے بارے میں ہیں، ان سب کو دیکھ لیں۔ آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ یہاں وہ کسی دوسری جماعت کا نام تک نہیں لیتے۔ خطرہ سمجھتے ہیں تو صرف جماعتِ اسلامی کو۔ خود اس ملک کے اشتراکیوں نے، منکرینِ حدیث نے، قادیانیوں نے، مغرب زدہ بیوروکریسی نے، اور علاقائی عصبیتوں کے علمبرداروں نے بھی اپنا اصل ہدف جماعت ہی کو بنایا ہے، اس کی طاقت توڑنے پر اپنا سارا زور صرف کیا ہے۔ اور پروپیگنڈے کی ساری توپیں جماعت ہی کے خلاف کھول دی گئی ہیں۔ گویا دشمن نے خود نشان دہی کر کے بتا دیا ہے کہ وہ یہاں اپنے لیے خطرہ کسے سمجھ رہا ہے اور کس کے متعلق اس کا خیال یہ ہے کہ اگر اسے شکست دے دی جائے تو آگے کوئی اس کا راستہ روکنے والا نہیں ہے۔"

ہم انتخابات میں کیوں حصہ لیتے ہیں

"اب میں مختصراً یہ بات بھی بتانا چاہتا ہوں کہ انتخابات میں حصہ لینے سے ہمارا مقصد کیا ہے۔ جن لوگوں کا خیال یہ ہے کہ ہمیں انتخابات میں حصہ نہیں لینا چاہیئے تھا، یا نہیں لینا چاہیئے، وہ دراصل ہمارے مقصد اور اس اسکیم کو نہیں سمجھتے جس پر عمل کر کے ہم اپنے مقصد تک پہنچنا چاہتے ہیں

جیساکہ میں ابتدا میں عرض کر چکا ہوں، ہم محض تبلیغ کرنے نہیں اُٹھے ہیں بلکہ اس لیے اُٹھے ہیں کہ وہ نظامِ زندگی اپنی ہمہ گیر اور مکمل صُورت میں عملاً قائم ہو جو اسلام نے ہمیں دیا ہے۔ اس مقصد کے لیئے ہم نے جماعت کی تشکیل کی۔ قابلِ اعتماد سیرت کے آدمیوں کو ایک ایک کر کے جمع اور منظم کیا۔ پھر ان کی تربیت کر کے ان کے ذریعے مزید آدمیوں کو ہم خیال بنایا۔ یہاں تک کہ یہ ایک ملک گیر جماعت بن گئی۔ اب یہ ظاہر بات ہے کہ جو جماعت وہ مقصد رکھتی ہو جس کی ابھی میں نے آپ کے سامنے وضاحت کی ہے وہ صرف اتنے ہی کام پر اکتفا نہیں کر سکتی بلکہ اس کے لیئے لازم ہے کہ اس کام کے ساتھ ساتھ وہ سیاسی طاقت حاصل کرنے کی بھی پیہم کوشش کرتی چلی جائے تاکہ بالآخر وہ اس نظام کو بالفعل نافذ کر سکے جو اس کے پیشِ نظر ہے۔ اس غرض کے لیئے ایک ممکن راستہ یہ تھا کہ خفیہ تحریک اور مسلح انقلاب کا طریقہ اختیار کیا جائے، لیکن ابتداء ہی سے، ہماری یہ رائے تھی کہ اس راستہ سے کوئی پائیدار اور صحت مند تغیر واقع نہیں ہو سکتا، جو پُورے معاشرے اور اس کے نظام کو مستقل بنیادوں پر تبدیل کر سکے۔ اس کے بعد لامحالہ دُوسرا راستہ یہی رہ جاتا تھا کہ جمہوری اور آئینی طریقوں سے ایک نظامِ زندگی کی جگہ دُوسرا نظام قائم کرنے کی بتدریج کوشش کی جائے اور اس کی کوئی صُورت اس کے سوا نہ تھی کہ جب بھی ملک میں انتخابات ہوں، اُن میں حصہ لیا جائے۔ عام لوگوں کے سامنے معقول طریقوں سے اپنا پروگرام پیش کیا جائے۔

رائے عامہ کو اس کے حق میں ہموار کرنے کی تمام ایسی تدبیریں
اختیار کی جائیں جو جائز بھی ہوں اور ہمارے وسائل و ذرائع
کی حد تک قابلِ عمل بھی، اور عوام کے سامنے ایسے آدمی
نمائندگی کے لیۓ پیش کیۓ جائیں جو اہل بھی ہوں اور قابلِ
اعتماد بھی، تاکہ لوگ خود یہ فیصلہ کر سکیں کہ یہ پروگرام اور یہ
نمائندے ان کے لیۓ قابلِ قبول ہیں یا نہیں۔ ہمارے نزدیک
بالغ رائے دہندگی سے بہتر کوئی طریقِ انتخاب اس مقصد کے
لیۓ موزوں نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اسی طریقِ انتخاب میں ملک
کے عام آدمی تک پہنچا جا سکتا ہے۔ اس میں معاملات کا شعور
پیدا کیا جا سکتا ہے، اس کے ذہن کی تربیت کی جا سکتی ہے،
اس کے اندر پروگراموں کی اور اُن کے لیۓ موزوں آدمیوں
کی پرکھ پیدا کی جا سکتی ہے، اور اس کی رائے کو تیار کر کے
پوری قومی زندگی میں وہ تبدیلی لائی جا سکتی ہے جو ہمیں مطلوب
ہے۔ اس لیۓ ہم ملک کے سیاسی نظام میں انتخابات کے
ہمیشہ حامی بلکہ اس کے لیۓ کوشاں رہے ہیں اور ہمارے
پیشِ نظر یہی رہا ہے کہ جو نظام ہم قائم کرنا چاہتے ہیں وہ جمہوریت
اور انتخابات کے ذریعے سے قائم کیا جائے، لیکن ہم کبھی اس
غلط فہمی میں مبتلا نہیں رہے ہیں کہ اس راستہ سے مطلوبہ تغیر
لے آنا کوئی قریبی اور سہل الحصول کام ہے اور ایک دو
انتخابات ہی میں اس کا فیصلہ ہو سکتا ہے۔ یہ تو ایک پیہم اور
مسلسل سعی چاہتا ہے جس میں ہر انتخابات کے حاصل کردہ
نتائج کو دوسرے انتخابات کے لیۓ استعمال کرنے کا سلسلہ
جاری رکھنا ہوگا۔ یہاں تک کہ بالآخر ہم قوم کی فیصلہ کُن اکثریت

کو اپنے حق میں ہموار کرلیں۔

"پس جب یہ راہِ عمل ہمارے پیشِ نظر تھی تو آخر اس بات کی کیا معقول وجہ ہو سکتی تھی، کہ جب ملک میں انتخابات کی نوبت آتی تو ہم خود پیچھے ہٹ جاتے اور دوسروں کو آگے لانے کی کوشش کرتے جیسا کہ ہمارے بعض خیرخواہ ہمیں مشورہ دے رہے ہیں۔ مجھے معاف کیا جائے اگر میں پوچھوں کہ وہ دوسرے لوگ ہیں کہاں جو اس نظامِ زندگی کو واقعی قائم کر سکتے ہوں، اور جنہوں نے اسے قائم کرنے کے لئے فی الواقع کوئی کام کیا ہو؟ اگر ایسے لوگوں کی نشاندہی کی جائے تو ہم خوشی سے اس بات کے لئے تیار ہیں کہ فصل ہم بوئیں اور کھیت ان کے حوالے کر دیں، بشرطیکہ ہمیں یہ اطمینان ہو کہ وہ اس کھیتی کی حفاظت بھی کر سکیں گے۔ —ہم نے یہ فصل اپنے لئے نہیں بوئی تھی اور نہ اپنے خاطر اسے کاٹنا ہمارے پیشِ نظر تھا۔ اگر ہمیں یہ اطمینان ہوتا کہ یہاں کوئی ایسا ہے جو اس بوئی ہوئی کھیتی کو سنبھال بھی سکتا ہے اور کاٹ بھی سکتا ہے تو ہم بڑی خوشی سے پیچھے ہٹ جاتے اور کہتے کہ بسم اللہ آپ حضرات تشریف لائیں، یہ فصل حاضر ہے لیکن ایسا کوئی گروہ یہاں موجود نہیں ہے۔ یہ گروہ بھی جو تیار ہوا ہے تیس سال کی سخت محنتوں کا نتیجہ ہے اور اسکے اندر بھی اس ساری جانچ پرکھ اور نگہداشت کے باوجود جو قابلِ اعتماد سیرت کے لوگ جمع کرنے کیلئے کی جاتی ہے، گندے انڈے نکل ہی آتے ہیں جن سے اسکو صاف کرنا پڑتا ہے۔ پھر بھلا وہ لوگ جنکے ہاں سیرت و کردار کی سرے سے فکر ہی نہیں ہے اس فصل کو کہاں سنبھال سکتے ہیں؟

لیکن اللہ کا فضل ہے کہ تیس سال کے اس مسلسل کام سے ہمارے تعلیم یافتہ طبقے کی اُلجھنیں بہت بڑی حد تک صاف ہو گئی ہیں اور وہ اس بات پر مطمئن ہو گیا ہے کہ اسلام ایک مکمل اور جامع نظامِ زندگی ہے جو زندگی کے تمام شعبوں میں ہماری بالکل صحیح راہنمائی کرتا ہے ـــــــ اس چیز کو تازہ انتخابات نے ہمارے سامنے کھول کر رکھ دیا ہے ـــــــ ہمارے ساتھ جو طبقہ آیا ہے وہ زیادہ تر ملک کا تعلیم یافتہ طبقہ ہے اور وہ بھی متوسط درجے کا۔ "اُونچے طبقے" کے لوگ، سرمایہ دار، صنعت کار، بڑے بڑے زمیندار اور جاگیر دار اکثر و بیشتر جماعتِ اسلامی کے نام سے کانوں پر ہاتھ رکھتے تھے۔ اس لئے کہ وہ سمجھتے تھے کہ دُوسرے لوگ جو پروگرام پیش کرتے ہیں، چاہے وہ کیسے ہی "انقلابی" ہوں، بہرحال وہ انہیں عمل میں نہیں لائیں گے اور جب ہم ان کے ساتھ ہوں گے تو عمل میں لا بھی نہیں سکیں گے۔ اس لئے ان کو اپنا مُفاد پُوری طرح ان کے ہاتھ میں محفوظ نظر آتا تھا۔ اس کے برعکس وہ جانتے تھے کہ جماعتِ اسلامی ملک کی معیشت اور تہذیب و معاشرت میں اصلاح کا جو پروگرام پیش کر رہی ہے وہ اسے عمل میں لاکر دکھا دے گی، اسلئے یہ طبقہ ہمارے خلاف گیا ہے۔ ہمارا ساتھ اس پڑھے لکھے، سمجھدار اور متوسط طبقے نے دیا ہے جو اپنی کوئی ایسی اغراض اور اپنے کوئی ایسے مفادات نہ رکھتا تھا جو حق کی طرف آنے میں مانع ہوتے۔

جو حضرات ان انتخابات کے بعض خلافِ توقع نتائج دیکھ

کر گھبرائے جارہے ہیں وہ براہِ کرم اس بات پر غور فرمائیں
کہ ۲۳ سال کے بعد ملک میں پہلی مرتبہ انتخابات عام کی نوبت
آئی ہے۔ جس گروہ کے ہاتھ میں اس ملک کا نظامِ حکومت
آیا تھا وہ جمہوریت کو اپنے لئے خطرناک سمجھتا تھا۔ اس کا
خیال یہ تھا کہ اگر یہاں جمہوریت ہوگی اور وقتاً فوقتاً انتخابات
ہوتے رہیں گے تو رفتہ رفتہ قوم آخرکار اس گروہ کے پیچھے
چل پڑے گی جو یہاں اسلامی نظامِ زندگی قائم کرنا چاہتا ہے۔
یہ لوگ جانتے تھے کہ یہ قوم ناخواندہ ضرور ہے لیکن اتنی
نادان نہیں ہے کہ اسلام اور غیر اسلام میں اور اچھے اور
بُرے اخلاق میں فرق نہ کرسکے۔ کبھی نہ کبھی اس کے سامنے
یہ بات کھلے گی کہ اسلام کا نام لینے والے کون ہیں اور اس
کا کام کرنے والے کون۔ قابلِ اعتماد کیریکٹر کے لوگ کون
ہیں اور ناقابلِ اعتماد کون۔ ایک دو چار مرتبہ وہ دھوکہ کھا بھی
لے گی تو آخرکار تجربہ کار ہو ہی جائے گی اور اس بات کو
جان لے گی کہ ہم اپنے مُعاملات کن کے ہاتھ میں دیں اور
کن کے ہاتھ میں نہ دیں۔ اسی وجہ سے وہ جمہوریت کی رَاہ
میں روڑے اٹکاتے رہے اور انہوں نے پُوری کوشش
کی کہ اسے یہاں نہ چلنے دیں، حالانکہ اگر ایسا نہ کیا جاتا اور
ابتدا ہی میں آئین بناکر ہر چار پانچ سال کے بعد انتخابات
ہوتے رہتے تو آج آپ حالات بالکل مختلف پاتے، لیکن
عملاً جو صُورت پیش آئی وہ یہ تھی کہ قیامِ پاکستان کے چار
سال بعد مغربی پاکستان میں صرف صوبائی انتخابات بالغ رائے
دہندگی کی بنیاد پر کرالئے گئے۔ ہم نے اس موقع سے فائدہ

اُٹھاکر براہِ راست عوام تک پہنچنے اور ان کی رائے کی تربیت کرنے کی کوشش کی، لیکن برسرِ اقتدار لوگ اپنی قوم کو یہ موقع نہیں دینا چاہتے تھے کہ وہ اپنی قسمت کا خود فیصلہ کرے بلکہ وہ صرف انتخابات کی نمائش کرنا چاہتے تھے، چنانچہ انہوں نے درحقیقت قوم کو فیصلہ کرنے کا موقع نہیں دیا اور فیصلہ سرکاری افسروں کے ذریعہ کرایا۔ ظاہر ہے کہ یہ قوم کا انتخاب نہیں تھا، سرکاری افسروں کا انتخاب تھا۔ پھر ۱۹۵۴ء میں مشرقی پاکستان میں بالغ رائے دہندگی کی بنیاد پر انتخابات ہوئے، لیکن اس وقت تک جماعت کا کوئی کام مشرقی پاکستان میں نہیں تھا۔ پورے صوبے میں جماعت کے صرف دو ارکان تھے اور متفقین گویا نہیں تھے۔ اس وجہ سے مشرقی پاکستان کے انتخابات میں ہم کوئی کام اس وقت نہ کر سکے۔ اس کے بعد سے دسمبر ۱۹۷۰ء تک پھر اس سرزمین میں انتخابات کی نوبت آئی ہی نہیں اور اس طویل مُدّت میں عوام کی کوئی سیاسی تربیت نہ ہو سکی، بلکہ تمام ممکنہ ذرائع سے اس کو بے خبر رکھنے اور طرح طرح سے گمراہ کرنے ہی کا کام کیا جاتا رہا۔

اب دیکھئے کہ اس طویل وقفے کے بعد جب پورے ملک میں عام انتخابات منعقد ہوئے تو ہمیں کس صورتِ حال سے سابقہ پیش آیا۔ ہمارے کچھ دوست کہتے ہیں کہ تم نے قوم کی نبض پر ہاتھ نہیں رکھا۔ میں کہتا ہوں کہ اس قوم کی نبض پر ہاتھ ہم نے بھی رکھا اور بہت سے دوسرے لوگوں نے بھی رکھا، لیکن تشخیص و تجویز ہر ایک کی مختلف تھی۔

ہم نے اس کی نبض پر ہاتھ رکھ کر ایک حکیم کی طرح یہ محسوس کیا
کہ اس قوم کے اندر یہ کمزوریاں اور یہ بیماریاں موجود ہیں اور
ہمارا فرض ہے کہ ہم اُس کی کمزوریاں دُور کریں، اسکی بیماری
کا علاج کریں اور اس کے دُکھوں کو دُور کرنے کے لیئے وہ
تدبیریں اختیار کریں جن سے فی الواقع اس کے دُکھ دُور ہو
سکتے ہوں۔ کچھ اور لوگ تھے جنہوں نے اس کی نبض پر ہاتھ
رکھ کر اس کی کمزوریوں کو محسوس کیا اور یہ سوچا کہ ان کمزوریوں
سے کس طرح فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے، اس کی بیماریوں کا اندازہ
کیا اور ایک لالچی ڈاکٹر کی طرح یہ سوچا کہ اس بیمار کو کس طرح
لوٹا جا سکتا ہے، اس کے دکھوں کو معلوم کیا اور یہ طے
کیا کہ اس کی ایک ایک دُکھتی رگ کو دبا دبا کر پہلے اُسے تڑپایا
جائے اور پھر اس کے دُکھ دُور کرنے کے لیئے طرح طرح
کے جھانسے دے کر اسے بیوقوف بنایا جائے۔ اب اگر
فیصلہ اسی پر ہے کہ مریض نے کس کو چھوڑ کر کس کے حوالے
اپنے آپ کو کر دیا، تو فی الواقع وہ دردمند حکیم احمق تھا جس
نے بیمار کے علاج کی فکر کی تھی، اور وہ سب عطائی نہایت
دانشمند تھے جو اسے بیوقوف بنانے میں کامیاب ہو گئے
لیکن ہم ایسی دانشمندی سے خدا کی پناہ مانگتے ہیں اور اس
بات پر خوش ہیں کہ اس نوعیت کے مقابلے میں جس چیز کو
حماقت سمجھا جا رہا ہے اسی کی توفیق خدا نے ہمیں عطا فرمائی۔
ہم اس قوم کا علاج کرنے اُٹھے تھے اسے بیوقوف بنانے
کے لیئے نہیں اُٹھے تھے۔ قوم کا جو سمجھدار اور صاحبِ علم
طبقہ تھا، اس کی اکثریت نے ہمیں واقعی معالج سمجھا اور

ہماری تائید کی۔ بھولے بھالے سادہ لوح عوام نے اپنی ناتجربہ کاری کے باعث ان لوگوں کو پسند کر لیا جو اسے بیوقوف بنانے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس پہلے تجربہ سے ہم قطعاً مایوس نہیں ہیں۔ جو مقصد ہمارے پیشِ نظر ہے اس کی خاطر ہم پے در پے ایسے ہی تجربے کرتے رہیں گے اور آخر وقت تک ہماری کوشش یہی رہے گی کہ اپنی قوم کے عوام کی ذہنی اور اخلاقی تربیت کر کے اسے صحیح فیصلہ کرنے کے قابل بنائیں۔ اس میں اگر کامیابی ہو جائے تو الحمدللہ اور اگر خدانخواستہ کامیابی نہ ہو تو ہم اس پر راضی ہیں کہ خدا کے ہاں ہمارا نام اُمتِ محمدیہؐ کو بیوقوف بنانے والوں میں نہ لکھا جائے۔"

انتخابات میں کس نے کیا تصویر پیش کی

"انتخابات کے نتائج کو جو حضرات کامیابی و ناکامی کا اصل معیار سمجھ رہے ہیں وہ ذرا آنکھیں کھول کر دیکھیں کہ ان انتخابات میں فی الواقع ہُوا کیا ہے اور ان میں کامیاب ہونا قابلِ فخر ہے یا ناکام ہونا؟

کچھ لوگوں نے ملک کے ایک حصے میں دوسرے حصے کے خلاف نفرت کا زہر اتنے بڑے پیمانہ پر پھیلایا کہ عوام کی ایک عظیم تعداد اسی تعصب کے سیلاب میں بہہ گئی۔۔

کچھ اور لوگوں نے عوام سے کہا کہ ہم ساڑھے بارہ ایکڑ زمین فی کسان دیں گے، یہ پرچی سنبھال کر رکھو، جب تم ہمیں ووٹ دے دو گے اور ہم بادشاہ بن جائیں گے تو اسے ہمارے

پاس لے آنا اور زمین حاصل کر لینا۔ انہیں اس سے کوئی بحث نہیں تھی کہ یہاں اتنی زمین ہے بھی یا نہیں کہ ساڑھے بارہ ایکڑ فی کسان دی جا سکے؟ آسمان سے کوئی زمین اُتار کر لائی جائے گی، یا نیچے سے زمین کو پھاڑ کر کچھ اور طبقے نکالے جائیں گے؟ ان کے پیشِ نظر صرف یہ تھا کہ جو دھوکا بھی لوگوں کو دیا جا سکتا ہے، دو اور کامیابی حاصل کر لو۔ انہوں نے کرایہ داروں سے کہا کہ اب یہ مکان تمہارے ہی ہو جائیں گے اور تمہیں کرایہ دینے کی کوئی ضرورت نہ رہے گی۔ ٹیکسی اور رکشا چلانے والوں سے کہا کہ یہ ٹیکسیاں اور رکشائیں تمہاری ملکیت میں دے دی جائیں گی۔ کوٹھیاں لوگوں کو دکھاتے پھرے کہ یہ تمہارے اندر تقسیم کر دی جائیں گی اور ان کے مالکوں کو نکال باہر کیا جائے گا۔ غرض مختلف طریقوں سے لوگوں کو لالچ دیے گئے اور ان کو مختلف طریقوں سے اپنے ساتھ بہا کر لے جانے کی کوشش کی گئی۔

کچھ اور لوگ تھے جنہوں نے دیکھا کہ اس قوم کے اندر مذہبی تعصبات بھڑکا کر بھی کام نکالا جا سکتا ہے، چنانچہ وہ اپنے اپنے فروعی مسائل لے کر اُٹھ کھڑے ہوئے اور اشتراکیوں، قادیانیوں، ملحدوں، سب کو چھوڑ چھاڑ کر میرے اور جماعتِ اسلامی کے خلاف الزام تراشیاں کرنے پر تل گئے۔ ایک گروہ تو پہلے ہی سالہا سال سے مجھ کو اور جماعتِ اسلامی کو گالیاں دے رہا تھا۔ انتخابات کا زمانہ جوں جوں قریب آتا گیا، "مقدسین" کے دوسرے گروہ بھی اس کارِ خیر میں شریک ہوتے چلے گئے۔ جھوٹ اور بدگوئی اور

فحش کلامی کی کوئی قسم ایسی نہیں ہے جس سے ان "دینداروں" نے کام نہ لیا ہو۔ میرے متعلق یہاں تک کہا گیا کہ یہ شخص قرآن کے صرف پندرہ پارے مانتا ہے، رمضان کے صرف پندرہ روزوں کا قائل ہے، صرف تین وقت کی نماز کو فرض سمجھتا ہے۔

یہ اور ایسے ہی بے شمار جھوٹ ہزار ہا آدمیوں کے مجمعوں میں بولے گئے، جگہ جگہ ان کو دُہرایا گیا، اور انکے بولنے والے وہ لوگ تھے جن کی شرعی صُورتوں اور قَالَ اللہ وَقَالَ الرسولؐ کی باتوں کو سُن کر ایک سیدھا سادا عام مُسلمان کبھی یہ تصور تک نہیں کر سکتا تھا کہ ایسے لوگ خُدا سے اس قدر بے خوف بھی ہو سکتے ہیں، آخرت سے اتنے غافل اور بے فکر بھی ہو سکتے ہیں کہ دُنیا میں کسی شخص اور جماعت کو نیچا دکھانے کی خاطر اتنے بے سروپا جھوٹے بہتان لگانے پر اُتر آئیں۔ ان لوگوں میں خُدا کا خوف تو درکنار خلق کی اتنی شرم بھی نہ تھی کہ اس شخص پر انہوں نے یہ بہتان لگائے جو غیر معرُوف آدمی نہیں ہے، لاکھوں آدمی اسے جانتے ہیں، لاکھوں آدمیوں نے اس کی تحریریں پڑھی ہیں، ہر جگہ اس کی کتابیں مل سکتی ہیں۔ انہوں نے یہ خیال کیا کہ جو لوگ جانتے ہیں وہ بے شک ہمیں جھوٹا سمجھ لیں گے، مگر جو نہیں جانتے وہ تو دھوکا کھا جائیں گے اور ان کو دھوکا دینے میں اگر ہم کامیاب ہو جائیں تو یہی فوز عظیم ہے۔ ان لوگوں نے ایڑی چوٹی کا زور جماعتِ اسلامی کو ایک الگ فرقہ قرار دینے پر صَرف کر دیا، حالانکہ فرقہ بندی

میں یہ خود مبتلا ہیں کہ انہوں نے اپنی نمازیں اور مسجدیں تک دوسرے مسلمانوں سے الگ کر رکھی ہیں اور جماعتِ اسلامی کا حال یہ ہے کہ اس کے لوگ ہر مسجد میں ہر امام کے پیچھے نماز پڑھتے ہیں، حتیٰ کہ ان مسجدوں تک میں نماز ادا کرتے ہیں جن کے امام اور خطیب شب و روز جماعت پر تبرّا کرنے میں مشغول رہتے ہیں۔ انہوں نے بھرے مجمعوں میں لوگوں سے کہا کہ فاتحہ، نیاز، عرس جو کچھ کرتے ہو اب کر لو، جماعتِ اسلامی آگئی تو یہ سب کچھ بند کر دے گی اور مزارات تک ڈھا دے گی۔ یہ خطرہ ان کو اشتراکیوں سے نہ تھا، جماعتِ اسلامی سے تھا، حالانکہ جماعت ہمیشہ مسلمانوں کے مختلف فرقوں کے درمیان رواداری ہی کی تلقین کرتی رہی ہے، اس کی اپنی صفوں میں بریلوی، دیوبندی، اہلِ حدیث سب شامل ہیں جن کے درمیان کبھی ایک دوسرے کے عقائد اور اعمال پر کوئی جھگڑا نہیں ہوا، اور اس کا مسلک یہ رہا ہے کہ جس عمل کو آپ صحیح سمجھتے ہیں اسے کیجئے اور جسے دوسرا صحیح سمجھتا ہے اسے کرنے دیجئے اور سب مل کر اپنی کوشش اللہ کا کلمہ بلند کرنے پر صَرف کر ڈالیے۔ اب اگر بڑی بڑی مقدس صُورتوں کے لوگوں کی زبان سے یہ جھوٹی باتیں سُن کر بے چارے ناواقف عوام دھوکا کھا گئے تو یہ ان کا قصُور نہیں ہے۔ قصُور تو ان لوگوں کا ہے جنہوں نے وارثانِ انبیاء بن کر یہ افترا پردازیاں کیں۔

آپ بتائیں اور کوئی شریف آدمی مجھے بتائے کہ ان

باتوں کا جواب آخر میں کیا دیتا اور جماعتِ اسلامی کے لوگوں سے کیا کہتا کہ وہ ان کا کیا جواب دیں؟ میں نے جس خاندان میں آنکھیں کھولی ہیں اور جس گھر میں پرورش پائی ہے اس کے یہ اخلاق نہیں تھے کہ میں گالی کا جواب گالی سے دیتا یا جھوٹے الزامات کے جواب میں جھوٹے الزامات لگاتا۔ مجمعِ عام تو درکنار میں اپنے کمرے کے دروازے بند کر کے تنہائی میں بھی زبان سے گالی نہیں نکال سکتا۔ مجھے یہ بھی یقین ہے کہ ایک روز مرنا ہے اور خُدا کو جا کر جواب دینا ہے۔ دُنیا میں جھوٹ اور افترا اور بہتان سے کام لے کر کوئی فائدہ اُٹھا بھی لوں تو خُدا کی پکڑ سے کیسے بچ سکوں گا۔

اب آپ یہ بات اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں کہ جو انتخابی نتائج آپ کی توقعات کے خلاف نکلے ہیں وہ کیوں نکلے ہیں۔ اس کے بعد یہ سوچنا آپ کا کام ہے کہ جہاں یہ اسباب کام کر رہے ہوں، وہاں جماعتِ اسلامی جیسی ایک جماعت کو آپ کی رائے میں کیا کرنا چاہیئے تھا۔ کیا جماعتِ اسلامی یہ کرتی کہ جہاں نسلی، علاقائی اور لسانی تعصبات بھڑکائے جا رہے تھے اور لوگوں کو نفرت کا زہر پلایا جا رہا تھا وہاں وہ دوسروں سے بڑھ کر اس زہر کو پھیلاتی اور ان تعصبات کو بھڑکاتی؟ کیا اس کو یہ کرنا چاہیئے تھا کہ جہاں جھوٹے وعدے اور لالچ دے دے کر عوام کو بہکایا جا رہا تھا وہاں وہ دوسروں سے بڑھ کر وعدے کرتی اور لالچ دیتی؟ کیا اس کو یہ کرنا چاہیئے تھا کہ جہاں جھوٹ، بہتان، افتراء

اور بدزبانیوں سے کام لیا جارہا تھا وہاں اس ذلیل کام میں وہ دوسروں سے بازی لے جانے کی کوشش کرتی؟ اگر واقعی انتخاب جیتنا ہی اصل مقصود ہو تو آپ کی رائے یہی ہونی چاہیئے کہ جماعت کو یہ سب کچھ سب سے بڑھ کر کرنا چاہیئے تھا، لیکن اس کے بعد آپ کو اور اس ملک کو جماعتِ اسلامی کی ضرورت ہی پھر کیا رہ جاتی ہے؟ یہ کام کرنے والے تو موجود ہیں اور بڑی خوبی کیساتھ اسے کرکے انہوں نے دکھا دیا ہے۔ جماعت تو اس لحاظ سے بالکل نالائق ہے کہ وہ اس سے زیادہ تر درکنار، ان کے برابر بھی درکنار، سرے سے کسی درجہ میں بھی یہ کام کر سکے اس لیئے جہاں ہار جیت کا فیصلہ اگر انہی بنیادوں پر ہونا ہے تو جماعت کو ختم ہوجانا چاہیئے، یا اس مقصد سے دست بردار ہوجانا چاہیئے کہ اس سرزمین میں اسلامی نظام عملاً قائم ہو، لیکن ہم یہ ماننے کے لیئے تیار نہیں ہیں کہ یہ اصل ہار جیت ہے، اور اس پہلے انتخاب ہی نے ہمیشہ کے لیئے یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ کس کی ہار ہوئی اور کس کی جیت۔"

ہمیں انتخابات صحیح طریقہ سے جیتنا ہے

"اس کے برعکس اگر واقعی آپ چاہتے ہیں کہ یہاں اسلامی نظامِ زندگی برپا ہو تو پہلے اس خیال کو دماغ سے نکال دینا چاہیئے کہ اصل کام بہرحال انتخابات جیتنا ہے خواہ اس کے لیئے کچھ ہی کرنا پڑے، بلکہ خوب سوچ سمجھ

کر یہ طے کر لینا چاہیئے کہ انتخاب صحیح طریقہ سے جیتنا ہے۔
خواہ اس کی کوشش کرتے ہوئے آپ ایک دو چار نہیں
دس انتخاب ہارتے چلے جائیں۔ صحیح مقصد کیلئے صحیح طریقے
سے انتخاب جیتنے کے لئے ہمیں عوام میں مسلسل کام کر کے
اپنی قوم کی ذہنی سطح کو بلند کرنا پڑے گا۔ اس کے اخلاق کو
بلند کرنا پڑے گا تاکہ وہ اسلامی نظام کو سنبھالنے کے قابل
ہو سکے۔ اس کے اندر اسلام کا فہم پیدا کرنا پڑے گا۔ اس
کی رائے کو تیار کرنا ہوگا کہ وہ بھلے اور بُرے میں تمیز کر
کے غلط قسم کی اپیلوں کو رد کر دے اور اپنے مسائل کو
حل کرنے کے لئے وہ پروگرام قبول کرے جو اسلامی
اُصولوں کے مطابق بھی ہو اور معقول و معتدل اور قابل
عمل بھی۔ نیز ان لوگوں کو اپنے مُعاملات کی سربراہی کے
لئے منتخب کرے جو اپنی اہلیت اور سیرت و کردار کے
لحاظ سے قابلِ اعتماد ہوں۔ جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں، بالغ
رائے دہندگی اس مقصد کے لئے موزوں ترین طریقِ انتخاب
ہے، کیونکہ اس ذریعہ سے ایک پوری قوم کو ذہنی تربیت
دی جا سکتی ہے ایک پوری قوم کو بیدار کیا جا سکتا ہے،
اس کے اندر مُعاملات کا فہم و شعور پیدا کیا جا سکتا ہے،
اور اس کے عام آدمی کے اندر یہ احساس اُبھارا جا سکتا
ہے کہ اپنی بھلائی اور برائی کا بالآخر وہ خود ذمہ دار ہے،
لیکن یہ کام بڑا صبر، بڑی محنت اور بڑی لگاتار جدوجہد چاہتا
ہے۔ جہاں کروڑوں عوام بستے ہوں، اور جہاں انہے کو
بیوقوف بنانے کے لئے ہزار ہا آدمی خُدا کے خوف اور

خلق کی شرم سے بے نیاز ہوکر ہر قسم کے حربے استعمال کرنے کے لئے موجود ہوں، وہاں عوام کی اس حد تک تربیت کرنا بڑا کٹھن کام ہے اور ہتھیلی پر سرسوں جمانے کی طرح انجام نہیں دیا جا سکتا۔ اس کے لئے ہم میں اتنی ہمت ہونی چاہیئے کہ کامیابی کے امکانات نہ ہوتے ہوئے بھی بار بار ہر انتخاب میں حصّہ لے کر دیکھتے رہیں کہ پہلے انتخاب کے بعد دوسرے انتخاب میں کتنے آدمیوں کو ساتھ لینے میں کامیاب ہوئے ہیں اور پھر ان کی تربیت کرکے مزید انتخابات میں قدم آگے بڑھاتے چلے جائیں۔ اس طرح آخر کار آپ ملک کے عوام کی بڑی اکثریت کی رائے تیار کرنے میں انشاء اللہ کامیاب ہوجائیں گے، لیکن اگر آپ کے نزدیک اصل اہمیت اس بات کی نہ ہو کہ آپ نے انتخابات میں کتنے مزید آدمیوں کو ساتھ ملایا، بلکہ اس بات کی ہو کہ نشستیں آپ نے کتنی حاصل کیں، اور اس لحاظ سے اگر آپ کو شکست ہوجائے تو آپ ہمت ہار بیٹھیں اور اسی شکست کو نگاہ میں رکھ کر اپنے مقصد، طریقِ کار، اصول اور نظامِ جماعت، ہر چیز پر نظرِ ثانی کرنے بیٹھ جائیں تو پھر اس جھنجھٹ میں پڑنے سے بہتر یہ ہے کہ ایک مرتبہ میدان سے ہٹ جانے ہی کا فیصلہ کرلیں، مگر مجھے کامل یقین ہے کہ جن لوگوں نے سوچ سمجھ کر جماعتِ اسلامی سے اپنا تعلق وابستہ کیا ہے وہ ہرگز ایسا فیصلہ کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ اور خُدا کے فضل سے ان کے اندر یہ ہمت بھی ہے کہ پے در پے چوٹیں کھاتے چلے جائیں اور جیتے جی

اس کام سے منہ نہ موڑیں جس کو انہوں نے حق سمجھ کر اختیار کیا اور اپنی زندگی کا مقصد بنایا ہے۔ اور میں یہ بھی یقین رکھتا ہوں کہ اگر ہم ہر تجربے سے سبق سیکھتے ہوئے اور ہر پیش آمدہ صورتِ حال کا ٹھیک ٹھیک جائزہ لیتے ہوئے باقاعدگی کے ساتھ مسلسل کام کرتے چلے جائیں تو ان انتخابات میں جہاں پچیس لاکھ آدمی ہمارے ساتھ آئے ہیں، آئندہ انتخاب میں انشاء اللہ اس سے دو گنے آئینگے، اور اس کے بعد جو انتخاب ہو گا اس میں آپ منزلِ کامیابی کے قریب ہوں گے۔

ہمارے سامنے اس وقت سب سے بڑا کام یہ ہے کہ اپنی قوم کی ان کمزوریوں اور بیماریوں کو دور کرنے کی کوشش کریں جو ان انتخابات میں کھل کر سامنے آگئی ہیں، اور اسکے لیئے ہمیں تعلیم یافتہ طبقے میں اپنے کام کو حسبِ سابق جاری رکھتے ہوئے اب دیہات اور شہروں کے ناخواندہ، پسماندہ اور دکھوں کے مارے ہوئے عوام تک جانا ہوگا۔ وہاں لٹریچر سے کام نہیں چلے گا، زبانی تلقین، براہِ راست شخصی ربط ضبط، عملی ہمدردی اور دردمندانہ خدمت سے کام کرنا ہوگا اور اس کام میں یہ مقصد نگاہ میں رکھنا ہوگا کہ صرف ان کے دکھ درد کا علاج ہی نہیں کرنا ہے بلکہ ان کے اخلاق اور شعور کا معیار بھی بلند کرنا ہوگا۔

خوش قسمتی سے پچھلے ایک سال کی انتخابی مہم میں ہمیں اس مقصد کے لیئے کام کرنے والوں کی اتنی کثیر تعداد مل گئی ہے۔ جو پچھلے تیس سال کے دوران

میں نہیں مل سکی تھی اور یہی خدا کے فضل سے وہ سب سے بڑا نفع ہے جو ہم نے اس زمانے میں کمایا ہے۔ اب یہ ضروری ہے کہ ہم ان کو جماعت میں جذب کریں اور ان کو تربیت دے کر اور منظم کرکے عوام کی اصلاح کے کام میں لگائیں۔ اس سلسلے میں چند باتیں ایسی ہیں جن کی وضاحت کرنا میں ضروری سمجھتا ہوں:

جماعتِ اسلامی کا ہمیشہ یہ طریقہ رہا ہے کہ اپنی جو کمزوری اور خامی بھی اسے محسوس ہو، یا جس کی نشان دہی اس کے خیر خواہوں کی طرف سے، یا ناقدین کی طرف سے کی جائے، ان پر وہ ٹھنڈے دل سے غور کرتی ہے اور حکمت کی بات جہاں سے بھی ملے اسے قبول کرکے اپنے کام اور نظام کی اصلاح کرتی ہے۔ پچھلے دنوں جو تبصرے بھی مخالفانہ یا موافقانہ یا ناصحانہ کئے گئے ہیں ان سب کو ہم پڑھتے رہے ہیں اور ان پر غور کرتے رہے ہیں۔ ہم ان سب لوگوں کے شکر گزار ہیں جنہوں نے ہمیں مشورے دینے کی زحمت اٹھائی ہے لیکن جماعت کی توسیع کرنے، اسے عوامی بنانے اور اسے کامیاب کرنے کے لئے ہم صرف انہی تجاویز پر عمل کر سکتے ہیں جو ہمارے مقصد اور سوچے سمجھے طریقِ کار سے مطابقت رکھتی ہوں ——— ہم نے جو مقصد اول روز سے اپنے سامنے رکھا اور اس مقصد کے لئے جو طریقِ کار طے کیا تھا اس کو ہم اب بھی صحیح سمجھتے ہیں اور اس سے ہٹنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ کامیابی کے لئے ہم ناجائز تدابیر کبھی اختیار نہیں کریں گے

خواہ ایک صدی تک کامیابی نہ ہو۔ ہم صحیح طریقے سے ہی کام کرنا چاہتے ہیں۔ اگر اس قوم کی قسمت میں ایک صحیح عادلانہ نظام کا قیام ہے تو اللہ تعالیٰ اسی طریقے سے ہمیں کامیابی عطا فرمائے گا لیکن اگر خدانخواستہ اس کی قسمت میں دھوکے ہی کھانا لکھا ہے تو ہم وہ لوگ نہیں بننا چاہتے جو اس کو دھوکہ دینے والے ہوں۔ ہم اس کو بچانے والے تو بننا چاہتے ہیں لیکن اس کو ٹھوکریں کھلانے والے نہیں بن سکتے۔ اس لیے محض انتخابات میں کامیابی حاصل کرنے کی خاطر ہم جماعت کی ایسی توسیع کرنے اور اسے اس طرح کی عوامی جماعت بنانے کی کوشش نہیں کر سکتے جو ہمارے کارکن کا معیار اخلاق گرا دے اور وہ عوام کی اصلاح کرنے کے بجائے صرف کسی نہ کسی طرح انہیں بہاکر اپنے ساتھ لے آنے کے قابل بن جائے۔ جماعتِ اسلامی صرف انتخابی جماعت نہیں ہے، نہ اس کی حیثیت ان سیاسی پارٹیوں کی سی ہے، جو محض انتخابات کے لیئے کام کرتی ہیں۔ اسے ایک مخصوص مقصد کے لیئے، جس کی تشریح میں کر چکا ہوں، پورے معاشرے کو ہر پہلو سے تیار کرنا ہے، اور یہ کام ایسا ہے جسے سال کے بارہ مہینے اور بارہ مہینوں کے ۳۶۵ دن، ہمہ وقت جاری رہنا ہے۔ اس کے لیے بلاشبہ ہمیں زیادہ سے زیادہ کارکنوں کی ضرورت ہے ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں کارکن اس کے لیئے درکار ہیں، مگر لازماً وہ ایسے ہی کارکن ہونے چاہئیں جو مخلص ہوں، بے لوث ہوں، اخلاق کے لحاظ سے کھرے ہوں، اور سیرت و کردار کی اتنی مضبوطی رکھتے

ہوں کہ سخت نامساعد ماحول میں بھی اپنے مقصد کی خاطر معاشرے کی اصلاح کے لیئے مسلسل محنت کرتے چلے جائیں، خواہ دُور دُور تک انہیں کامیابی کے آثار نظر نہ آتے ہوں۔ ایسے کارکن جہاں جہاں بھی موجود ہیں ہم ان سب کو جماعت میں شامل کر لینا چاہتے ہیں۔ ان کے لیئے جماعت کا دروازہ ہر وقت کھُلا ہے وہ آگے بڑھیں اور بلاتکلف رُکنیت کے لیئے اپنے آپ کو پیش کر دیں۔ یہ محض ایک غلط فہمی ہے جو لوگوں میں پھیل گئی ہے کہ جماعتِ اسلامی نے اپنی رُکنیت کی شرائط بہت کڑی رکھ چھوڑی ہیں۔ ہم نے تو اسلام کے زیادہ سے زیادہ مطالبات کو نہیں بلکہ کم سے کم مطالبات کو جماعت کی رکنیت کی شرط قرار دیا ہے اور وہ یہ ہیں کہ آدمی خُدا اور رسُولؐ کے عائد کردہ فرائض کو ادا کرے اور کبائر سے پرہیز کرے۔ اب آپ خود ہی سوچیں کہ اگر کوئی شخص یہ کم سے کم مطالبات بھی پُورے کرنے کے لیئے تیار نہ ہو تو اِسلامی نظامِ زندگی کے لیے وہ کارکن آخر کیسے بنے گا؟ کسی کو اگر نماز روزے اور حج اور زکوٰۃ کو معاف کردینے اور حلال وحرام کی تمیز مٹا دینے کے اختیارات ہوتے تو وہ ضرور ان اختیارات کو استعمال کرتا، لیکن جبکہ یہ اختیارات کسی کو بھی حاصل نہیں ہیں تو جماعت میں آنے کے لیئے یہ شرائط تو بہرحال پُوری کرنی ہوں گی ـــــ تاہم جو لوگ کسی وجہ سے رُکن نہیں بننا چاہتے اور متفق ہی رہنا پسند کرتے ہیں ان سے ہم یہ درخواست کرتے ہیں کہ براہِ کرم وہ صرف متفق نہ رہیں بلکہ کارکن متفق بنیں۔ کارکن متفقین آج تک

بھی ہمارا قیمتی سرمایہ رہے ہیں، اور اب جو نئے لوگ اس زمرے میں آئے ہیں ان کو بھی ہم ایک قیمتی سرمایہ سمجھتے ہیں ان میں سے بکثرت لوگوں نے جماعت کے لئے مال، وقت، محنت کا اتنا ایثار کیا ہے، اور جماعت کی دعوت کو پھیلانے، اس کی حمایت میں عام رائے کو تیار کرنے اور مخالفتوں کے کانٹوں کو صاف کرنے کا اتنا کام کیا ہے کہ ہم ان کا شکریہ ادا کرنے سے قاصر ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہی ان کو اجر دینے والا ہے۔

اب ناخواندہ عوام میں شعور اور بیداری پیدا کرنے کے لئے جو کام ہمیں کرنا ہے اس کے لئے کارکن متفقین کی زیادہ سے زیادہ کثیر تعداد کا تعاون ہمیں درکار ہے۔"

۱۸ر فروری ۱۹۷۱ء

۱۹۷۰ء کے انتخابات میں مغربی پاکستان میں پاکستان پیپلز پارٹی کامیاب ہوئی اور مشرقی پاکستان میں مجیب الرحمٰن کی پارٹی۔ انتخابات کے ان نتائج کو دیکھ کر مفتی عبدالحمید لدھیانوی صاحب نے دینی جماعتوں کے سربراہان کو خط لکھا۔ ان کا مطبوعہ خط مولانا محترم کے نام بھی آیا تھا۔ مفتی صاحب کا خط اور مولانا محترم کا جواب درج ذیل ہے:۔

از مفتی عبدالحمید لدھیانوی
۶/ ۱۰۸ سول لائن
ٹوبہ ٹیک سنگھ، لائل پور

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ مزاج گرامی!

انتخابات کا نتیجہ سامنے آنے کے بعد آپکا یا آپ کی جماعت کا ملکی و سیاسی مُعاملات میں کیا رویہ ہوگا ہے ـــــ اِسلامی آئین بنوانے کے لیۓ افراد اور جماعتوں کی انفرادی کوششیں بانسُود ہوں گی۔ اس مقصد کے لیۓ دینی و سیاسی اِسلام پسند پارٹیوں، علمائے حق اور اسلام کا غلبہ چاہنے والے تمام افراد کا متحدہ محاذ بنانا ناگزیر ہے۔ کیا آپ یا آپ کی جماعت اس کا ارادہ رکھتی ہے اور اس کو عملی جامہ پہنانے کے لیۓ آپ نے یا آپ کی جماعت نے کچھ کیا ہے یا آئندہ کرنا ہے؟

اسلام کی سربلندی، آئین و نظام اِسلامی کے لیۓ کما حقہ، متحدہ جدوجہد نہ ہونے کی سزا کے طور پر اقتدار پر جن ہاتھوں میں جا رہا ہے ان سے کسی خیر کی توقع ہرگز نہیں کی جا سکتی۔ آئین کے حسُن و قبح پر پاکستان اور پاکستان میں اِسلام کی رہی سہی اقدار کی بقاء کا بظاہر انحصار ہے۔ اس

لئے نہایت خلوص اور دِل سوزی سے استدعا ہے کہ خُدارا پُوری کوشش و تندہی کے ساتھ اِسلام پسند پارٹیوں (ماسوائے ان علماء سوء کے جنہوں نے سامراج دُشمنی کا بہانہ بنا کر عملاً آمریت و اشتراکیت کی پُشت پناہی اور اِسلام کی بیخ کنی کی جس کے نتیجہ میں مرزائیت کو پھلنے پھُولنے کا موقع مِلا) کو متحد کرنے کا بیڑا اُٹھائیں اور اپنی موجودہ قیمتی مساعی کو پسِ پُشت ڈال کر بھی صرف اور صِرف اس فریضہ کی انجام دہی پر کمربستہ ہوجائیں ورنہ جو کچھُ ہوگا آپ خود بہتر سمجھتے ہیں۔

آپ اپنی شخصیت اور کردار کی بنیاد پر یقیناً اس پوزیشن میں ہیں کہ اس عظیم تحریک کی ابتداء کریں۔ کیا عجب کہ اللہ تعالیٰ آپ کی ذاتِ گرامی کو پاکستان اور نظریۂ پاکستان کے تحفظ کا ذریعہ بنا دیں۔ ومَا ذٰلكَ علَی اللہِ بعزیز۔

والسلام مع الاحترام،

منتظر جواب، عبدالحمید۔

۶ر فروری ۱۹۷۱ء۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ابُوالاعلیٰ مودودی

۵۔ اے ذیلدار پارک، اچھرہ

لاہور ۱۲ (پاکستان)

۱۸ر فروری ۱۹۷۱ء

محترمی ومکرمی!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

آپ کا مطبوعہ گرامی نامہ مِلا۔ میں تمام حالات پر ٹھنڈے دل سے اور توجہ الی اللہ کے ساتھ غور کرتا رہا ہوں۔ میرا احساس یہ ہے کہ انتخابات کے

بدترین نتائج سامنے آجانے کے باوجود اس رویہ میں کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے جو ان نتائج کا سبب بنا ہے۔ مجھے خوف ہے کہ شاید اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی اور شدید تر چوٹ لگنے والی ہے جس کے بعد ممکن ہے کہ لوگوں کی آنکھیں کھل جائیں۔ سردست تو مجھے اس کے کوئی آثار نظر نہیں آ رہے ہیں کہ آنکھیں کھل گئی ہیں۔

خاکسار

ابوالاعلیٰ

۲۸/مارچ ۱۹۷۱ء

تفہیم القرآن کی طباعت کی تصحیح کے سلسلہ میں کبھی کبھار مولانا محترم مجھے سامنے بیٹھا لیتے اور ترجمہ پڑھواتے۔ میں پڑھتا جاتا اور مولانا کتابت شدہ کاپیاں دیکھتے جاتے۔ اِس طرح مختلف اوقات میں تقریباً پندرہ پاروں کا ترجمہ میں نے مولانا محترم کے سامنے پڑھا۔اس دوران میں اُردو تلفظ کی جو غلطیاں مجھ سے ہوتیں مولانا محترم ان کی تصحیح اس طرح فرماتے کہ اس فقرے کو دُہرا دیتے۔ کبھی ایک سے زیادہ مرتبہ بھی دُہراتے تاکہ میں اچھی طرح سمجھ جاؤں۔ ۲۸/ مارچ کو پوری "سُورۂ لقمان" کا ترجمہ پڑھ کر سُنایا۔

۲۹/مارچ ۱۹۷۱ء

آج پُوری "سُورۂ یُونس" کا ترجمہ تفہیم القرآن سے پڑھ کر سُنایا۔

۳۱/مارچ ۱۹۷۱ء

آج بعد نمازِ مغرب تقریباً سات بجے مولانا محترم کار پر سیر کیلئے تشریف لے گئے۔ میں بھی ساتھ تھا۔ مسلم ٹاؤن والی نہر کے ساتھ ساتھ یونیورسٹی نیو کیمپس سے گزرتے ہوئے نیاز بیگ ملتان روڈ تک چلے گئے۔ جوڑوں کے دردوں کی وجہ سے پیدل چلنا ممکن نہیں تھا، لیکن مُعالجین کی ہدایت کے مطابق محض ہوا خوری کے لیے کار پر سیر کے لیئے نکلے تھے۔ راستے کے مذاکرات کی ایک جھلک، مولانا محترم نے فرمایا:۔

"ابُوالخیر صاحب مجھ سے تین ساڑھے تین سال بڑے

ہیں۔ والد صاحب نے دو شادیاں کی تھیں۔ پہلی بیوی سے
ابُو محمد اور ابُو قاسم دو بھائی تھے۔ ان دونوں کا پاکستان
بننے سے پہلے ہی انتقال ہوگیا تھا۔ ان دونوں کا ایک ایک
لڑکا ہے۔ ان کی والدہ کے انتقال کے بعد والد صاحب نے
دوسری شادی کی جس سے ہم دو بھائی ہیں اور ایک بہن
تھی۔"

(گویا ابُو محمد اور ابُو قاسم مولانا محترم کے علاقائی بھائی تھے)

مِرزا ولی اللہ بیگ مولانا محترم کے سگے ماموں تھے۔ بنوٹ کے ماہر تھے ــــ مولانا نے ان سے بنوٹ سیکھا تھا۔ میں نے بنوٹ کے استعمال کے بارے میں سوال کیا تو مولانا نے فرمایا:۔

"زندگی بھر آج تک کسی سے لڑائی کی نوبت نہیں آئی۔
حتیٰ کہ سکول کے زمانے میں بھی لڑکوں کے ساتھ کبھی لڑنے
جھگڑنے کا اتفاق نہیں ہُوا۔"

حیدر آباد کے زمانۂ قیام میں مولانا اپنی موٹر کار خود چلاتے تھے اور پٹھانکوٹ میں اپنا تانگہ خود چلاتے تھے۔

یکم اپریل ۱۹۷۱ء

آج ٹھیک سات بجے شام کار میں سیر کے لیئے نکلے ــــ باغِ جناح کی طرف سے گنگا رام ہسپتال سوا سات بجے پہنچ گئے ڈاکٹر جمال الدین صاحب سے وقت پہلے سے طے تھا۔ وہاں آج سے کولہوں میں (Heat) کا علاج شروع کرانا تھا۔ پندرہ منٹ مشین سے (Heat) کولہوں میں پہنچائی گئی۔ وہاں سے نکلتے ہوئے مولانا محترم نے ڈاکٹر صاحب سے فرمایا کہ بل ساتھ ساتھ لینا ہے یا اکٹھا۔ ڈاکٹر صاحب نے مولانا کی

مرضی پر چھوڑا۔ مولانا نے آخر میں اکٹھا بل دینے کا کہا۔ راستے میں میں نے عرض کیا کہ یہ رفاہی ہسپتال ہے یہاں تو علاج مفت ہوتا ہے تو بل کس بات کا؟ مولانا محترم نے فرمایا کہ میرا یہ کام نہیں کہ مفت علاج کراؤں۔ مزید فرمایا کہ ۱۹۵۹ء کے آخر میں بھی میں نے اسی کمرے میں اور انہی ڈاکٹر صاحب سے شانے کے درد کا (Heat) سے علاج کرایا تھا۔

۲/اپریل ۱۹۷۱ء

حسبِ معمول شام کو کار میں سیر کے لیے نکلے۔ گنگا رام ہسپتال سے (HEST) لینے کے بعد نیو کیمپس کی طرف نکل گئے۔

میں نے تفہیم القرآن کے انگریزی ترجمہ کے بارے میں سوال کیا۔ مولانا محترم نے فرمایا۔ چودھری محمد اکبر صاحب ترجمہ کر رہے ہیں۔ کراچی میں پروفیسر خورشید صاحب کی نگرانی میں ظفر اسحاق انصاری صاحب بھی انگریزی میں تفہیم القرآن کا ترجمہ کر رہے ہیں جو یورپ میں چھپوایا جائیگا۔

میں نے اسی سلسلے کا دوسرا سوال کیا کہ چونکہ قرآنِ کریم کا انگریزی میں کوئی معیاری ترجمہ موجود نہیں ہے اس لیئے اگر تفہیم القرآن کا ترجمہ قرآنِ کریم کے ترجمہ کی حد تک آپ خود دیکھ لیں تو یہ بہتر ہوگا۔ اس لیئے کہ آپ اپنا مفہوم بیان کرنے کے لیئے جو الفاظ استعمال کرتے ہیں انگریزی میں اس کا ترجمہ کئی الفاظ سے کیا جاسکتا ہے لیکن ضروری نہیں کہ جو مفہوم آپ ادا کرنا چاہتے ہیں۔ مترجم بھی وہی سمجھ رہا ہو۔ اس لیئے الفاظ کے استعمال میں آپ کی رائے ضروری ہے۔ فرمانے لگے۔ اتنا وقت کہاں سے لاؤں اور اب تو صحت بھی اس کی متحمل نہیں رہی ہے۔ میری عادت ہے کہ جس چیز کو دیکھتا ہوں پوری توجہ سے دیکھتا ہوں۔ ابھی پچھلے دنوں منشور جماعت کا انگریزی ترجمہ دیکھنا پڑا تو اس میں بہت سی تبدیلیاں

کرنی پڑیں۔ جس میں کافی وقت صرف ہوا۔

۳/ اپریل ۱۹۷۸ء

آج کی سیر مختصر رہی۔ راستے میں اسی خبر کا تذکرہ رہا جس کی مذمت میں بیان دینے کے لیئے جلدی لوٹ آئے۔

عربی اخبارات کے مطابق مصر کی مجمع البحوث الاسلامی نے اپنے اجلاس میں قرار داد پاس کی ہے کہ "اُردن" اور "پاکستان" میں وفد بھیجا جائے جو پاکستان میں قتل عام کی مہم کو بند کرانے کی کوشش کرے۔ یہ قرار داد چونکہ بی بی سی اور انڈیا ریڈیو کے جھوٹے پروپیگنڈے سے متاثر ہوکر پاس کی گئی ہے اس لیئے اس کا نوٹس لینے کی ضرورت ہے۔ مولانا محترم نے اس مجلس کو تار بھی دیا ہے اور اُردو، عربی کے اخبارات میں اس کے خلاف آواز بھی اُٹھائی ہے۔ یاد رہے کہ اس مجلس کے پاکستانی رُکن مولانا محمد یوسف بنوری صاحب وہاں موجود تھے۔ مفتی محمود صاحب کو بھی دعوت نامہ آیا تھا مگر وہ کسی وجہ سے جا نہیں سکے۔

۵/ اپریل ۱۹۷۱ء

بعد مغرب گنگا رام ہسپتال سے ہوتے ہوئے نیو کیمپس کی طرف سیر کے لیئے حسب معمول کار پر نکل گئے۔ راستے میں مَیں نے سوال کیا مولانا، آپ کی شادی کس عمر میں ہوئی تھی؟ مولانا محترم نے فرمایا، ۳۴ سال کی عمر میں۔ میرا دوسرا سوال تھا اتنی دیر سے کیوں ہوئی؟ فرمایا۔ میرے معاشی حالات ٹھیک نہیں تھے اس لیئے میں اسے مسلسل ٹالتا رہا۔ آخر ایک روز خیال آیا کہ ۱۴ سال کی عمر تھی جب والد محترم کا

سایہ سر سے اُٹھ گیا تھا لیکن آج تک اللہ تعالیٰ دیے جا رہا ہے۔ آئندہ بھی وہی اسباب پیدا فرمائے گا۔ یہ خیال آتے ہی میں نے شادی کا فیصلہ کر لیا۔ نسبت تو پہلے سے طے تھی اور مسلسل تقاضے کے باوجود میں ہی ٹالتا چلا آ رہا تھا۔ جب میں نے اپنا ارادہ والدہ محترمہ پر ظاہر کیا تو انہوں نے فوراً ہی شادی کا انتظام کر دیا۔ میری اہلیہ میری خالہ زاد بہن ہیں اور بڑی صاحبِ قناعت خاتون ہیں۔ کئی سال تک ہماری یہ حالت رہی کہ دو دن سے زیادہ کے اخراجات ہمارے پاس نہیں ہوتے تھے۔ اس کے باوجود اہلیہ کے رکھ رکھاؤ اور سلیقہ شعاری سے کبھی کو یہ احساس بھی نہ ہوتا تھا کہ ہم تنگ دستی کی حالت میں بسر کر رہے ہیں۔ بہر حال خُدا کے فضل و کرم سے کسی کے زیرِ بار احسان ہونے کی نوبت نہیں آئی۔

ایک سوال تھا، آپ کی کوئی اولاد فوت بھی ہوئی ہے؟ فرمایا: اللہ تعالیٰ نے اس غم سے مجھے بچائے رکھا ہے۔ اَلحمدُللہ تمام بچے زندہ موجود ہیں ——— مولانا محترم کے چھ لڑکے ہیں اور تین لڑکیاں۔

۱۱ر اپریل ۱۹۷۱ء

مولانا محترم کے ساتھ مغرب کے بعد ہسپتال اور سیر کا سلسلہ جاری ہے۔ راستے میں بیماری کی حالت، مُلکی حالات اور ہلکے پھلکے موضوعات پر گفتگو ہوتی رہتی۔ ضمناً ذکر آگیا کہ:۔

۱۹۵۲ء میں مولانا محترم نے مغربی پاکستان بالخصوص پنجاب کا مفصل دورہ کیا تھا۔ دَورے کے دوران میں بیمار ہو کر واپس آ گئے تھے، مگر چند دن آرام کرنے کے بعد دورہ مکمل کیا۔

۵/ مئی ۱۹۷۱ء

حسبِ معمول سیر کے دوران میں تحریکِ پاکستان کے سلسلے میں گفتگو ہو رہی تھی۔ مسلمان سیاسی کارکنوں کی اس حرکت پر مولانا محترم نے سخت افسوس کا اظہار کیا جو انہوں نے مولانا مدنی کے ساتھ کی تھی۔ فرمایا کہ ایسی توہین آمیز حرکت کسی لیڈر کے ساتھ مناسب نہیں چہ جائیکہ مولانا مدنی مرحوم جیسے صاحب علم و فضل اور شریف النفس انسان کے ساتھ روا رکھی جائے۔ آج کی سیر میں پروفیسر حفیظ الرحمٰن احسن بھی ساتھ تھے اور یہ بات مولانا محترم نے انہی کے سوال کے جواب میں فرمائی تھی۔

۲۸/ مئی ۱۹۷۱ء

سیر کے دوران میں گزشتہ رات کی آندھی پر گفتگو ہو رہی تھی۔ مولانا محترم نے فرمایا کہ وہ اس وقت باہر لان میں بیٹھے تھے۔ بجلی بند ہو گئی، لان میں جو درخت ہیں ان میں سے ایک درخت کا ٹہنا ٹوٹ کر گر گیا۔ اس کے گرنے کی زور سے آواز آئی مگر اندھیرا ہونے کی وجہ سے کچھ پتہ نہ چلا کہ کیا ہوا ہے، تاہم میں اللہ کے بھروسے پر وہیں بیٹھا رہا کہ جو ہونا ہے ہو جائے گا۔ تھوڑی دیر بعد روشنی آ گئی۔

۳۰/ جون ۱۹۷۱ء

آج سیر کے دوران عجیب و غریب واقعات کا ذکر چل پڑا۔ چودھری محمد شفیع نے ایک واقعہ سنایا کہ ایک صاحب نے خود ان سے ذکر کیا کہ تقسیم ہندو پاک سے قبل وہ حج کے لیے گئے۔ وہاں بیت اللہ شریف میں ایک پنجابی خاتون غلافِ کعبہ پکڑ کر روزانہ اللہ تعالیٰ کا بہت شکر ادا کرتی ایک روز

ان صاحب نے پوچھ لیا کہ توبہ و استغفار کے بجائے شکر گزاری کا سبب کیا ہے اس پر اس خاتون نے اپنا واقعہ بیان کیا کہ : ہم جس جہاز میں آرہے تھے وہ غرق ہو گیا۔ کچھ لوگ اِدھر اُدھر کشتیوں اور تختوں پر چڑھ کر بچے۔ مجھے وہ خاتون کہتی ہیں کہ میں اور میرا نوجوان لڑکا ایک تختے پر سوار ہو گئے۔ دِن بھر اس پر بیٹھے سمندر پر تیرتے رہے۔ شام کے وقت ایک حبشی ایک اور تختے پر تیرتا ہوا ہمارے قریب آگیا۔ ہوا کی موافقت سے ہمارا اور اس کا تختہ بالکل ایک ساتھ مل گئے اور وہ پھدک کر ہمارے ہی تختے پر آگیا۔ نہ وہ ہماری زبان سمجھتا تھا اور نہ ہم اس کی۔ کچھ دیر خاموشی کے بعد اس نے میرے اُوپر دست درازی شروع کر دی۔ پھر اس نے یہ دیکھا کہ میرا لڑکا بھی مزاحمت کرے گا۔ اسے سمندر میں پھینک دیا اور خود میرے اُوپر حملہ آور ہونے لگا۔ میں نے اس کا مقابلہ کیا اور اس مزاحمت میں کپڑے بھی پھٹ گئے۔ اسی دوران میں سمندر کی ایک لہر آئی اور اس حبشی کو اپنی لپیٹ میں لے کر مجھ سے جدا کر کے لے گئی۔ رات بھر میں اکیلی سمندر میں تیرتی رہی۔ اگلے روز ایک جہاز دکھائی دیا۔ میں نے کپڑا ہوا میں لہرا کر اسے اپنی طرف متوجہ کیا، چنانچہ وہ میرے قریب آگیا اور مجھے پکڑ کر جہاز میں سوار کر لیا گیا۔ جہاز میں پہنچ کر لطفِ کریمی کا کیا منظر دیکھتی ہوں کہ میرا لڑکا وہاں موجود بیٹھا ہے۔ یہ واقعہ بیان کر کے وہ عورت کہتی ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کا کیوں شکر بجا نہ لاؤں جس نے اس شان سے میری آبرو بھی بچائی اور ہم دونوں کی جانیں بھی بچائیں اور اپنے گھر کا شرف زیارت بخشا۔

اس پر مولانا محترم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ حیرت انگیز طریقے سے بچاتا بھی ہے اور جس کی موت کا وقت آچکا ہوتا ہے اسے حیرت انگیز طریقے سے موت بھی دے دیتا ہے، چنانچہ دو واقعات انہوں نے بیان فرمائے:

۱۔ جہاز اپنی بلندیوں پر اُڑتا چلا جا رہا تھا۔ کہ اچانک اس کا ایمرجنسی گیٹ کھُلا اور گیٹ کے قریب بیٹھے ہوئے آدمیوں میں سے ایک آدمی نیچے گر گیا۔ اور جہاز اس واقعہ سے متاثر ہوئے بغیر محوِ پرواز رہا اور کسی دوسرے مسافر کو کوئی نقصان نہ پہنچا۔

۲۔ اسی طرح ایک جہاز میں آگ لگ گئی۔ پائیلٹ یہ سمجھ کر کہ جل کر مرنے کے بجائے چھلانگ کیوں نہ لگا دوں۔ موت تو آ ہی گئی ہے لیکن جلنے کے بجائے چھلانگ لگا کر مرنا بہتر ہے، چنانچہ اس نے اٹھارہ ہزار فٹ کی بلندی سے چھلانگ لگا دی۔ اس وقت نیچے برف باری ہو رہی تھی اور برف ابھی نرم تھی۔ چنانچہ پہلے وہ ایک درخت میں آ کر لگا جس پر نرم نرم برف پڑی ہوئی تھی اور پھر آہستہ سے زمین پر آ گیا اور اسے کوئی تکلیف نہ پہنچی۔ صحیح وسلامت زمین پر اُتر گیا۔

چودھری شفیع صاحب نے ایک دوسرا واقعہ یہ سُنایا کہ ایک بس میں ایک عورت اپنے دُودھ پیتے بچے کو کھڑکی سے باہر پیشاب کرا رہی تھی کہ بس کا ایکسیڈنٹ ہو گیا۔ جھٹکا لگنے سے بچہ اس عورت کے ہاتھ سے چھوٹ کر باہر گر گیا جس سے اس کی جان بچ گئی اور اس کی ماں اس حادثے میں ہلاک ہو گئی۔

خود چودھری صاحب کو اسی طرح کار کا ایک حادثہ پیش آ چکا ہے۔ کشتی میں سوار تھے۔ کشتی کو حادثہ پیش آیا۔ سب نے چھلانگیں لگا دیں۔ چودھری صاحب نے بھی چھلانگ لگائی اور اپنا بیگ جس میں رسید بُکیں اور کچھ جماعتی ضروری کاغذات تھے یہ کہہ کر کہ تو بھی اللہ کے سپرد اور میں بھی، کشتی ہی میں چھوڑ کر دریا میں کود گئے۔ جوں توں کر کے کنارے پر لگے اور بیگ جس کے ہاتھ لگا اس نے تھانے میں دے دیا چونکہ اس پر پتہ لکھا ہوا تھا اس لئے وہ بھی سلامت واپس مل گیا۔

۱۷ اگست ۱۹۷۱ء

آج دورانِ سیر میں سوال تھا کہ کیا آپ نے کبھی سائیکل بھی چلائی ہے؟ جواب نفی میں تھا۔ سائیکل چلانا نہیں آتا۔ البتہ پیدل چلنے کا موقع بارہا ملا ہے۔ پٹھانکوٹ کے قیام کے زمانے میں بطورِ سیر مولانا روزانہ پانچ چھ میل پیدل چلتے تھے۔ ۱۹۵۱ء میں جب سیلاب آیا، مولانا نے فرمایا کہ میں سیالکوٹ سے لاہور آرہا تھا۔ کاموئنکے کے قریب سڑک ٹوٹی ہوئی تھی اس لیئے بس نے وہیں اُتار دیا۔ آگے پانی تھا' چنانچہ جوتے ہاتھ میں لے لیے اور پانی میں چلنا شروع کر دیا' ایک اور صاحب بھی بس میں سے میرے ساتھ اُترے تھے اور وہ بھی پانی میں ساتھ چل رہے تھے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ سی آئی ڈی کے آدمی تھے جن کی میرے اُوپر ڈیوٹی تھی۔ پانی کہیں کہیں تو کمر تک آجاتا تھا۔ میرا بیگ ان صاحب نے اُٹھا لیا اور میں اپنے جوتے ہاتھ میں پکڑے کبھی پانی میں اور کبھی خشکی میں ننگے پاؤں چل کر شاہدرہ پہنچا۔ والد صاحب نے بچپن میں ننگے پاؤں چلنے سے منع کیا تھا چنانچہ میں کبھی ننگے پاؤں نہیں چلا تھا مگر اس روز ساری کسر نکل گئی۔

شاہدرہ پہنچے تو رانا جہانداد خاں، سپرنٹنڈنٹ پولیس، اپنی کار میں آرہے تھے۔ مجھے اس حال میں دیکھ کر حیران ہوئے اور مجھے اپنی کار میں منزل تک پہنچانے کے لیئے چلے ہی تھے کہ سامنے سے میری اپنی کار مجھے لینے کے لیئے آگئی اور میں ان کا شکریہ ادا کر کے اپنی کار میں بیٹھ گیا۔

۱۹۵۵ء میں پنجاب کا مفصل دورہ کیا تھا۔ سیالکوٹ، کیمبل پور، فتح جنگ، میانوالی، سرگودہا وغیرہ۔ سرگودہا میں پہنچا تو بخار آنا شروع ہو گیا تھا مگر تھوڑا سا آرام لینے کے بعد دورہ شروع کر دیا۔

۲۲ مارچ ۱۹۷۲ء

آج مغرب کے وقت مولانا گلزار احمد مظاہری صاحب، جناب حفیظ الرحمٰن احسن صاحب اور جناب عابد نظامی صاحب تشریف لائے۔ میری طرف سے ملاقات کرانے سے معذرت قبول کرتے ہوئے یہ حضرات واپس تشریف لے جانے ہی والے تھے کہ اتنے میں مولانا محترم نے انٹرکام پر مجھے اپنے دفتر میں یاد فرمایا۔ یہ حضرات بھی میرے پیچھے پیچھے مولانا محترم کے دفتر میں اس خیال سے داخل ہو گئے کہ ایک نظر مولانا کو دُور ہی سے دیکھ لیں گے، مگر یہ دیکھنا باقاعدہ مُلاقات کی صُورت اختیار کر گیا۔ بعد میں عابد نظامی صاحب نے اس ملاقات کی مختصر روداد ہفت روزہ آئین کے لیئے مرتب کی جو آئین کی ۲۸ مارچ کی اشاعت میں شائع ہوئی۔ ذیل میں آئین کے شکریہ سے زینت اشاعت ہے:

۲۲ مارچ کی شام کو ہمیں چند منٹ کے لیئے مولانائے محترم کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع میسّر آگیا۔ میرے ساتھ اس سعادت میں حصہ پانے والے دو اصحاب اور تھے۔ مولانا گلزار احمد مظاہری صاحب اور حفیظ الرحمٰن احسنؔ صاحب ——— ہم مرکزِ جماعت میں مولانائے محترم کے شعبۂ مراسلت کے انچارج جناب محمد سلطان صاحب سے مُلاقات کے بعد رُخصت ہو رہے تھے کہ مولانائے محترم نے انہیں کسی کام سے یاد فرمایا ——— یہی "حسنِ اتفاق" ہمیں سلطان صاحب کے ساتھ ساتھ مولانا کے پاس لے گیا۔

مولانا محترم اس وقت اپنے دفتر کے ساتھ ملحقہ کمرے میں دروازے کی طرف پشت کیئے ہوئے بید کی ایک کرُسی پر تشریف فرما تھے۔ ہم

تینوں مولانا سے سلام اور مصافحہ کے بعد ان کے قریب بیٹھ گئے ــــــ یہ امر بذاتِ خود وجہ اطمینان و مسرت تھا کہ مولانائے محترم پر سے مسلسل لیٹے رہنے کی پابندی معالج حضرات نے ختم کر دی تھی اور اب مولانا کُرسی پر تشریف فرما تھے لیکن سب سے زیادہ جو چیز موجب طمانیت و سکون ہوئی وہ مولانائے محترم کے چہرے کی بشاشت اور شگفتگی کی وہ سدا بہار کیفیت تھی جس کو ایک نظر دیکھنے کے بعد یہ گمان نہیں ہوتا کہ مولانا محترم بیماری کے ایک شدید حملے سے گزر کر آئے ہیں یا اب بھی بیماری کی حالت میں ہیں اور ان کے معالجین نے انہیں ہر طرح کی ذہنی اور جسمانی محنت سے روک رکھا ہے ــــــ

مولانا گلزار صاحب کے ایک سوال کے جواب میں مولانا محترم نے ارشاد فرمایا :-

"اب کچھ روز سے ڈاکٹر صاحبان نے بستر سے اُٹھ کر بیٹھنے اور سہارا لے کر یہاں کُرسی تک آنے کی اجازت دی ہے ــــ لیکن کیفیت یہ ہے کہ جب پہلے روز میں بستر پر اُٹھ کر بیٹھا تو نقاہت سے میرا سر چکرانے لگا ـــــ پھر دوسرے موقع پر تکیہ کی ٹیک لگا کر بمشکل دس منٹ کے لیئے بیٹھ سکا ــــــ اب اتنا ہے کہ کسی چیز کا سہارا لے کر کُرسی تک آجاتا ہوں اور کچھ دیر کے لیئے بیٹھتا ہوں "

"مولانا ! یہ اس قدر نقاہت بیماری کے حملے کی وجہ سے ہے یا مسلسل لیٹے رہنے کا بھی اس میں دخل ہے ؟" حفیظ الرحمٰن احسن صاحب نے سوال کیا۔

مولانا نے فرمایا :

"ہاں یہ حالت مسلسل لیٹے رہنے کی وجہ سے بھی ہے۔

اگر ایک صحت مند آدمی بھی مسلسل لیٹا رہے تو اس کے اعضاء کمزور ہو جاتے ہیں۔ پھر اس مسلسل لیٹنے کی پابندی کی وجہ سے گزشتہ دنوں سے میری (ARTHRITIS) کی تکلیف بھی بڑھ گئی ہے تاہم اب ڈاکٹروں نے اس کے لئے دوا استعمال کرنے کی اجازت دے دی ہے۔"

"مولانا آپ اپنے دفتر میں کام کرنے کے قابل ہو جائینگے؟" مولانا گلزار صاحب نے عرض کیا۔

مولانا نے فرمایا:

"ابھی تو وقت لگے گا ـــــ کمزوری بہت زیادہ ہے۔"

"آج کل آپ کے مطالعہ کی کیفیت کیا ہے؟" ـــــ میں نے عرض کیا

مولانا نے فرمایا:

"بس کچھ ہلکا پھلکا لٹریچر (LIGHT LITERATURE) دیکھتا ہوں۔ وہ بھی زیادہ دیر تک نہیں۔ لیٹے لیٹے تھوڑا بہت پڑھ لیتا ہوں۔"

اب ہمیں مولانا محترم کی خدمت میں بیٹھے چند منٹ ہو چکے تھے۔ اس خیال سے کہ مولانا کے آرام میں خلل نہ پڑے ہم نے اجازت لی اور ایک زندگی بخش کیفیت اپنے دلوں میں سمیٹتے ہوئے اُٹھے۔

ہم کمرے سے باہر آئے تو ہمارا تاثر یہ تھا کہ ایسی حالت میں جب کہ مُعالجین کی طرف سے مُلاقاتوں پر پابندی ہے، مولانا محترم سے یہ مُلاقات ہمارے لئے یقیناً ایک نعمت غیر مترقبہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

۳۱ / مارچ ۱۹۷۴ء

۳۱ / مارچ کو جماعتِ اسلامی پاکستان کے مرکز منصورہ نے جو منظر دیکھا وہ اس بستی کے چند ناقابلِ فراموش مناظر میں سے ایک تھا۔ اس روز وہاں کے در و دیوار جہاں دِلوں کی گہرائیوں سے بلند ہونے والے نعروں سے گونج اُٹھے، وہاں ہزاروں انسانوں کے جذبات آہوں میں ڈھل گئے۔ کتنے ہی ایسے تھے کہ اپنی چیخوں پر قابو نہ پا سکے۔

مولانا سید ابُو الاعلیٰ مودودیؒ اپنی زندگی کے آخری سالانہ اجتماعِ جماعت سے خطاب کے لیئے تشریف لائے تھے۔ حمد و صلوٰۃ کے بعد فرمایا:

"میرے عزیز رفقاء، اور محترم حاضرین!

اللہ تعالیٰ کا بے انتہا شکر ہے کہ اس نے ایک مرتبہ پھر مجھے اپنی زندگی میں جماعتِ اسلامی کے رفقاء کو یکجا دیکھنے کا موقع عطا کیا۔ میری دلی خواہش یہ تھی کہ میں نہ صرف اس اجتماع کے سارے اجلاسوں میں شریک ہوتا، بلکہ یہاں آپ کے کیمپ میں آپ کے ساتھ ٹھہرتا اور آپ لوگوں سے فرداً فرداً ملنے کا موقع مجھے نصیب ہوتا لیکن چار پانچ سال کی مسلسل بیماری نے مجھے اتنا خستہ اور زار و نزالہ کر دیا ہے، اور میری طاقتوں کو اس بری طرح ختم کر دیا ہے کہ میں اس آخری اجلاس میں بھی بڑی مشکل سے پہنچا ہوں، چنانچہ میں نہیں کہہ سکتا کہ اس وقت آپ کے سامنے کتنی دیر تقریر کر سکوں گا، کیونکہ زیادہ دیر تک بات کر کے بھی تھک جاتا ہوں (یہاں میرے نوجوان عزیزوں نے اپنی محبت کی وجہ سے

میرا استقبال کر کے مجھے بہت تھکا دیا ہے اور گویا ادھ موا کر کے مجھے یہاں پہنچایا ہے اگر وہ خاموشی سے مجھے یہاں آجانے دیتے تو شاید کچھ طاقت میرے اندر باقی رہتی اور میں نسبتاً زیادہ وقت آپ سے خطاب کر سکتا)

دوسری چیز، جس پر میں اللہ تعالیٰ کا بے انتہا شکر گزار ہوں، یہ ہے کہ میری زندگی ہی میں مخلص اور آزمودہ کار کارکنوں کی ایک ٹیم نے جماعت کی تنظیم اور اس کی قیادت کو سنبھال لیا ہے اور میں دُنیا سے یہ اطمینان لیئے ہوئے رُخصت ہوں گا کہ میں جماعت کا نظام بھروسے کے قابل آدمیوں کے ہاتھ میں دے کر جا رہا ہوں۔ جماعتِ اسلامی پاکستان کے موجودہ امیر میاں طفیل محمد صاحب میرے نہایت قدیم رفقاء میں سے ہیں اور سالہا سال میرے ساتھ کام کرتے رہے ہیں۔

اِسی طرح مجلسِ شوریٰ بھی جماعت کے آزمودہ کار لوگوں پر مشتمل ہے۔ ان کی رائے اور دیانت پر بھی بھروسہ کیا جاسکتا ہے اور ان کی عقل و فکر و فہم پر بھی اعتماد کیا جا سکتا ہے، اس لیئے میں اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے میرے دُنیا سے رُخصت ہونے سے پہلے پہلے یہ انتظام کر دیا ہے کہ میرے بعد بھی جماعت اسی طرح سے انشاء اللہ چلتی رہے گی جس طرح میری امارت کے زمانے میں چلتی رہی ہے۔

مجھے اس وقت اپنے وہ رفقاء بھی یاد آرہے ہیں جو جماعتِ اِسلامی کے ستون تھے، جو جماعت کے بہترین کارکن تھے اور جنہوں نے سالہا سال جماعت کی خدمات انجام دیں، مگر کچھ کو

اللہ نے اپنے دامنِ رحمت میں بُلا لیا اور کچھ کو اعداء نے اللہ تعالیٰ کے دامنِ رحمت میں پہنچا دیا۔ اللہ تعالیٰ ان سب کی مغفرت فرمائے۔ آمین۔

مجھے اس بات کا بھی سخت رنج ہے کہ یہ اجتماع جماعتِ اِسلامی پاکستان کا نہیں بلکہ محض جماعتِ اسلامی مغربی پاکستان کا اجتماع ہے اور جماعتِ اسلامی مشرقی پاکستان کی نمائندگی اس میں نہیں ہے، الّا یہ کہ کچھ حضرات جو مشرقی پاکستان سے تعلق رکھتے ہیں وہ یہاں موجود ہیں ـــــ مشرقی پاکستان اندرونی اور بیرونی دُشمنوں کی سازشوں اور بیرونی جارحانہ مسلح مداخلت کے ذریعے سے زبردستی ہم سے الگ کیا گیا۔ تحریکِ اسلامی سے تعلق رکھنے والے لوگوں نے آخر وقت تک اپنی جانیں لڑائیں کہ کسی طرح اس خطۂ زمین کو کفر کی گود میں جانے سے بچایا جا سکے۔ ہزاروں افراد نے جن کی صحیح تعداد بھی ہمیں معلوم نہیں، اس عظیم جدوجہد میں اپنی جانیں قربان کر دیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی قربانیوں کو قبول کرے اور ان کو شہادت کا مرتبہ عطا فرمائے۔ اسی طرح ہزاروں خاندان گھر سے بے گھر ہو گئے ہمیں اب کچھ معلوم نہیں کہ ان میں سے کون کس حالت میں ہے، لیکن ہمیں پُورا یقین ہے کہ جس آدمی نے بھی اس نصب العین کو، ایک مرتبہ قبول کر لیا ہے، جس کے لئے جماعتِ اِسلامی کام کر رہی ہے، وہ مر جائے گا مگر اس نصب العین سے انشاء اللہ ہٹے گا نہیں اور اس کے لئے کوشش کرنے اور جان لڑانے سے انشاء اللہ باز نہیں آئے گا۔ اب یہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم اور اس کے رحم پر منحصر ہے کہ وہ خطہ پھر ہمارے

ساتھ مل کر پُورا پاکستان وجود میں آئے گا یا نہیں کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ ہی کی مشیّت اور اس کی مرضی پر موقوف ہے لیکن انشاء اللہ ہماری طرف سے یہ کوشش برابر جاری رہے گی کہ ہم پاکستان کو پُورا پاکستان بنائیں اور کبھی وہ وقت بھی آئے جب جماعتِ اسلامی مغربی پاکستان کا نہیں بلکہ جماعتِ اِسلامی پاکستان کا اجتماع ہو۔ وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ۔

جماعتِ اسلامی ______

جس غرض کے لیئے قائم ہوئی ہے وہ ایک اور صِرف ایک ہے، اور وہ یہ ہے کہ دنیا میں اللہ کے دین کو پوری طرح سے، پوری زندگی میں نافذ کیا جائے۔ اس کے سوا اس جماعت کا اور کوئی مقصد اور نصب العین نہیں ہے۔ جو شخص بھی اس جماعت سے وابستہ ہے، خواہ وہ رُکن کی حیثیت سے وابستہ ہو، یا کارکن اور متفق کی حیثیت سے وابستہ ہو، اسے یہ بات کبھی فراموش نہیں کرنی چاہیئے کہ جماعتِ اسلامی کا اصل مقصد دینِ حق کو مکمل طور پر خُدا کی زمین پر غالب کرنا ہے۔ اگر ہم سیاسی کام بھی کرتے ہیں تو اقتدار حاصل کرنے یا دوسری سیاسی اغراض کے لیئے نہیں کرتے بلکہ اس غرض کے لیئے کرتے ہیں کہ ان رُکاوٹوں کو دُور کیا جائے جو دینِ حق کے قیام میں مانع ہو رہی ہیں اور جمہوری ذرائع سے ملک کے اندر اسلامی انقلاب برپا کرنے کا راستہ ہموار ہو سکے۔"

اس خطاب کا آخری حصہ تھا:

"...... انقلابی تحریکوں کی زندگی میں ایک وقت ایسا بھی آتا

ہے جب لوگوں کے اندر ان کے پھیلائے ہوئے خیالات اس قدر مضبوطی سے جم جاتے ہیں اور ان کے اندر ایک عزم ایسا راسخ ہو جاتا ہے کہ اس کے بعد پھر کوئی طاقت ان کے مطلوبہ نظام کو آنے سے نہیں روک سکتی ۔ وہ ہر راستے سے آتا ہے ، اور ایسے راستوں سے آتا ہے جن کو بند کرنے کا خیال بھی کبھی کسی کے دماغ میں نہیں آسکتا ۔ اس لیئے آپ اس بات کی فکر نہ کریں کہ آپ جس نظام کے لیئے جدوجہد کر رہے ہیں وہ یہاں کیسے آئے گا ! آپ کا اصل کام یہ ہے کہ اپنا فرض نہایت خلوص اور جانفشانی کے ساتھ ادا کرتے چلے جائیں اور آپ کی واحد فکر آپ کا وہ کام ہو جسے آپ کو انجام دینا ہے ۔ یہ کام آپ صرف اسی صورت میں انجام دے سکتے ہیں جبکہ آپ کے اپنے اخلاق اس سانچے میں ڈھلے ہوئے ہوں جو اس نظام کا تقاضا ہے ۔ جب آپ اسلام کی طرف دعوت دینے کے لیے اُٹھیں گے تو لوگ یہ دیکھیں گے کہ ہمیں یہ دعوت دینے والے خود کیسے ہیں ۔ اگر آپ کے اخلاق اور سیرت و کردار میں کوئی خرابی ہوئی یا آپ کے اندر ایسے لوگ موجود ہوئے جو کسی درجہ میں بھی نظم کی خلاف ورزی کرنے والے ہوں تو اس صورت میں آپ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکیں گے ۔ اس لیئے یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لیجئے کہ اسلامی انقلاب کے لیئے جدوجہد کرنے کے کچھ تقاضے ہیں ۔ اسلامی نظام کے قیام کی جدوجہد کرتے وقت آپ کو جن چیزوں کو خاص طور پر پیشِ نظر رکھنا ہوگا وہ یہ ہیں کہ :

• آپ کے اخلاق نہایت بلند ہوں۔
• آپ کی زندگی پوری طرح اسلام کے سانچے میں ڈھلی ہوئی ہو۔
• آپ کے اندر نظمِ جماعت کی کامل اطاعت پائی جاتی ہو۔
• آپ جماعت کے دستور کی پوری طرح پابندی کرنے والے ہوں۔

اور اس کے ساتھ ساتھ :

• آپ عوام الناس کے اندر پھیل کر زیادہ سے زیادہ لوگوں کو اپنا ہم خیال بنانے کے لیے ہر لحظہ کوشاں ہوں اور چاہے یہ کام آپ کو پچاس سال بھی کرنا پڑے لیکن آپ لگن کے ساتھ اسے کرتے چلے جانے کا مصمم ارادہ رکھتے ہوں تو ـــــ انشاء اللہ کوئی طاقت اس ملک کو اسلامی ملک بننے سے نہیں روک سکے گی۔

بس مجھے اس وقت جو کچھ عرض کرنا تھا وہ میں نے مختصر طور پر عرض کر دیا ہے۔"

۵ر اپریل ۱۹۷۴ء

۵ر اپریل کو مولانا گھٹنوں کے درد کے علاج کے سلسلہ میں امریکہ کے لیے روانہ ہوئے۔ مولانا محترم کے صاحبزادہ ڈاکٹر احمد فاروق ساتھ تھے۔
۵ر اپریل کا بقیہ دن کراچی میں گزارا۔
۶ر اپریل کو لندن پہنچے۔ تھوڑی دیر کے لیے جہاز سے باہر تشریف لائے اور استقبال کے لیئے آنے والے سینکڑوں رفقاء سے مختصر اجتماعی ملاقات کی۔

لندن سے روانہ ہوتے ہی دل پر بوجھ محسوس ہُوا اور تھوڑی دیر میں بے چینی بڑھ گئی، لیکن جہاز میں کوئی علاج ممکن نہیں تھا' البتہ آکسیجن کا انتظام ہوگیا اور اللہ کے فضل سے وہ مؤثر ثابت ہوئی اور نیویارک پہنچنے تک حالت سنبھل گئی۔

بفیلو (Buffalo) میں ڈاکٹر احمد فاروق کے ہاں قیام کے دوران میں ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا۔ جب صحت کچھ بہتر ہونے لگی تو مصروفیات کا آغاز بھی ساتھ ہی ہوگیا۔
۵ر اگست ۱۹۷۴ء کو کنیڈا کے شہر ٹورنٹو، جس کی ۲۱، ۲۲ لاکھ کی آبادی میں تقریباً پچیس ہزار مسلمان آباد ہیں، کے اسلامک سنٹر ہال میں ایک بڑا اجتماع ہُوا جس سے مولانا محترم نے خطاب فرمایا۔ مولانا محترم کی تقریر کا متن ہفت روزہ آئین لاہور، میں چھپا تھا اور اب کتابچے کی صورت میں شائع ہوگیا ہے۔

-●-

۲۰، ۲۱ر اگست ۱۹۷۴ء

۲۰ر اگست کو مولانا محترم امریکہ سے کراچی پہنچے۔ ۲۱ر اگست کو فاروقی مسجد سعود آباد کراچی میں کارکنوں کے عظیم اجتماع سے خطاب فرمایا:

"جو لوگ اللہ کی راہ میں استقامت دکھاتے ہیں وہ برابر آگے بڑھتے رہتے ہیں۔ کوئی بڑی سے بڑی طاقت بھی ان کا راستہ نہیں روک سکتی کوئی تکلیف اور کوئی دُکھ ان کے لئے زحمت کا باعث نہیں بنتا۔ وہ اپنی قربانیوں پر رنج یا افسوس نہیں کرتے، بلکہ خوش ہوتے ہیں کہ اس راہ میں انہیں بھی کسی قابل سمجھا گیا ـــــ جب ان کے دِلوں میں خُدا کے سوا کسی کا ڈر نہیں رہتا تو اسٹین گنیں، آنسو گیس اور لاٹھیاں ان کا راستہ نہیں روک سکتیں۔ انہیں اس کی بھی کوئی پروا نہیں ہوتی کہ خُدا کی راہ سے ہٹنے والوں کو کتنی دولت یا کیسا عہدہ ملتا ہے، کون وزیر اعظم یا صدر بنتا ہے اور کِسے محلّات اور خزانے ملتے ہیں۔ ان کی نگاہ میں ایسی کسی چیز کی کوئی وقعت نہیں ہوتی۔ ان کے نزدیک اصل قدر وہی ہوتی ہے جو اللہ کے ہاں ہو ـــــ

حضرات!

اللہ کی راہ میں ڈٹ جانے والوں کے لئے فرشتے مدد لاتے ہیں، لیکن اس طرح نہیں کہ آپ کو تختِ شاہی پر بٹھا دیں۔ آپ اپنے راستے پر استقامت کے ساتھ گامزن رہیں گے، تو وہ آپ کو ہر مرحلے پر کامیاب کریں گے۔ اگر آپ

اللہ کے سوا کسی کی پروا نہ کریں۔ اس کی رضا کے سوا کسی کی خوشنودی آپ کے پیشِ نظر نہ ہو تو آپ یقین رکھیں کہ آپ ضرور غالب آئیں گے۔ صرف اللہ پر بھروسہ، اپنے مقصدِ حیات کے لیے مسلسل ایثار و قربانی اور استقامت کیساتھ مسلسل جدوجہد ہی آپ کو کامیابی سے ہمکنار کر سکتی ہے۔ یہی بات میں دُنیا بھر میں اِسلام کے لیے کام کرنے والوں سے کہتا ہوں اور یہی میری نصیحت تحریکِ اسلامی کے کارکنوں کے لیئے بھی ہے۔"

۲۲ر اگست ۱۹۷۴ء کو کراچی یونیورسٹی کے کنووکیشن گراؤنڈ میں طلباء کی عظیم الشان ریلی سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

"اس ملک کے نوجوانوں سے مجھے کہنا ہے کہ اس ملک کو مکمل دارُالاسلام بنانا ان کی ذمّہ داری ہے۔ آپ صرف زبان سے ہی نہیں بلکہ اپنے کردار، اخلاق اور طرزِ زندگی سے بھی اسلام کی ترجمانی کریں۔ آپ مغرب کی علمی ترقی ٹیکنالوجی اور تحقیقات سے پُورا پُورا فائدہ اُٹھائیں لیکن مغربی تہذیب کی بُرائیوں سے دُور رہیں جو معاشرے کو زوال کی طرف لے جاتی ہیں۔

میرے عزیزو!

میں سمجھتا ہوں کہ یہ اس سرزمین پر اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم ہے کہ جہاں تملم برسرِ اقتدار زور آور طاقتوں نے الحاد، بے دینی اور فسق و فجُور کا علم بلند کرنے میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی۔ وہاں نوجوانوں کے اندر پاکیزہ جذبات، اللہ کے دین کے ساتھ لگاؤ اور دینِ کا صحیح فہم اور شعور موجود ہے یہ سب اللہ

کے فضل کے سوا کسی ذریعے سے نہیں ہو سکتا۔ اب آپ اپنی اس ذمہ داری کو پُوری طرح محسوس کریں جو مسلمان ہونے اور پاکستان کے وارث ہونے کی بدولت آپ پر عائد ہوتی ہے ـــــ دُنیا میں ایسا کوئی کلمہ آج تک بلند نہیں ہوا جس کو بلند کرنے کے لئے لوگوں نے جان، مال، وقت اور صلاحیتیں وقف نہ کی ہوں اور ہر وہ قربانی نہ دی ہو جس کی ان کے نصبُ العین کو ضرورت ہو۔ ایمان والوں کو چاہیئے کہ کسی طاقت سے نہ دبیں اور اللہ کے کلمے کو دبانے کے لئے جو طاقت بھی اُٹھے اس سے ٹکرا جائیں، چاہے وہ کیسی ہی بڑی طاقت کیوں نہ ہو، کیونکہ اگر اللہ آپ کے ساتھ ہے تو سب سے بڑی طاقت آپ کے ساتھ ہے ـــــ میں اللہ سے دُعا کرتا ہوں کہ اس کھیتی کو جو بڑی محنتوں سے تیار ہوئی ہے۔ مزید نشوونما عطا فرمائے۔ بار الٰہا! اس کے اندر وہ تمام پھل لا جو تیری قدرت میں ہیں' اسے تمام بُرائیوں سے بچا۔ ان میں اعلیٰ درجہ کے اخلاق، جرأت اور بہادری پیدا فرما کہ یہ کبھی طاقت سے نہ دبیں اور صلاحیت، حکمت اور جرأت سے ملک میں اسلامی نظام لانے کی جدوجہد کریں"

-●-

۲۳ر اگست ۱۹۷۴ء

آج مولانا محترم علاج کے بعد امریکہ سے واپس لاہور پہنچے۔ اسی شام رشید پارک اچھرہ میں ایک اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے دوسرے اُمور کے ساتھ ساتھ معاشرتی مقاطع کے موضوع کو لیا جس کے بارے میں سرکاری حلقے کہہ رہے تھے کہ اسلام میں مُعاشرتی مقاطع کا کوئی جواز نہیں۔

اس کا پسِ منظر یہ ہے کہ ۲۹ر مئی ۱۹۷۴ء کو ربوہ ریلوے اسٹیشن پر نشتر میڈیکل کالج کے مسلمان طلبہ پر قادیانیوں نے حملہ کیا۔ انہیں گاڑی سے اُتارا اور پلیٹ فارم کے فرش پر لٹا کر ان میں سے بعض پر وحشیانہ تشدد کا مظاہرہ کیا۔ اگلے دن اخبارات میں یہ خبر چھپی تو پُورے ملک میں کہرام مچ گیا۔ قادیانیوں کے خلاف نفرت اور انتقامی جذبات بھڑک اُٹھے اور پُورا ملک سراپا احتجاج بن گیا۔ جب یہ چیز قومی اسمبلی میں زیرِ بحث آئی اور ساری قوم کی طرف سے قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کا مطالبہ کیا گیا تو نیشنل اسمبلی پاکستان نے متفقہ طور پر مرزا غلام احمد قادیانی کے پیروکاروں کو غیر مسلم قرار دے دیا۔

مولانا محترم اس زمانے میں علاج کے سلسلہ میں امریکہ میں تھے۔ جب اگست میں واپس تشریف لائے تو ملک میں یہ بحث چل رہی تھی۔ اس ضمن میں بعض علماء کی طرف سے قادیانیوں کی سرکشی کے واقعات کے پیشِ نظر اور اصُولی حیثیت سے بھی ان کا معاشرتی مقاطعہ کرنے کی اپیل کی گئی تھی۔ اس سلسلے میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے مولانا نے فرمایا:۔

"مُعاشرتی مقاطعہ کا تو سب سے زیادہ مشہور واقعہ

خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں پیش آچکا ہے۔
جنگِ تبوک میں تین مخلص مسلمان جو ہمیشہ جہاد میں شریک
ہوتے رہے سستی کے باعث شریک نہ ہو سکے، وہ منافق
نہیں تھے۔ سچے مومن تھے، رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم یہ
یقین رکھتے تھے کہ وہ سچے مسلمان ہیں، لیکن اسکے باوجود
ایک جہاد کے موقع پر پیچھے رہ جانے کی بنا پر ان کا مقاطعہ
کرنے کا حکم دیا گیا۔ اس مقاطعہ میں نہ صرف یہ کہ عام لوگوں
کو ان سے سلام کلام کرنے سے منع کر دیا گیا بلکہ آخر میں ان
کی بیویوں کو بھی حکم دے دیا گیا کہ وہ بھی ان سے الگ ہو
جائیں۔ پچاس دن تک ان کا مقاطعہ جاری رہا۔ اس کے
بعد کون یہ کہنے کی جرأت کر سکتا ہے کہ اسلام میں معاشرتی
مقاطعہ نہیں ہے۔ اگر مخلص مسلمانوں کا مقاطعہ بھی جائز ہے
اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کرایا ہے تو وہ لوگ
جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ایک نئی نبوّت لے کر
کھڑے ہوئے ہیں۔ اِن کا مقاطعہ کیوں نہیں ہو سکتا —— پھر
رسول اللہؐ کے بڑے بڑے صحابیوں نے جن میں حضرت ابوبکر
صدیق، حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت علی اور تمام
بڑے بڑے صحابہ رضوان اللہ علیہم شامل تھے۔ مسیلمۂ کذاب
کے خلاف اِس لیئے جنگ کی کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ
وسلم کے بعد نبوّت کا مدعی تھا۔ اس کے خلاف جنگ کی تو
کوئی وجہ اس کے سوا نہیں تھی۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ
وسلم کی نبوت کو تسلیم کرتا تھا اور تسلیم کر کے کہتا تھا کہ ان کے
ساتھ میں بھی شریک کیا گیا ہوں (معاذ اللہ) اس کے کلمہ میں

محمد رسول اللہ کے الفاظ شامل تھے۔ ان کے بعد پھر وہ اپنا نام لگاتا تھا۔ اس کے باوجود اس سے جنگ کی گئی اور آپ مقاطعہ پر اعتراض کر رہے ہیں ـــــ پھر غضب یہ ہے کہ ساری مسلمان قوم کو جو یہاں رہتی ہے۔ یزیدیت کا الزام دے دیا گیا ہے حالانکہ یزیدیت کے مرتکب تو کچھ دوسرے لوگ ہیں۔ یزیدیت کے اعمال تو کچھ دوسرے لوگ کر رہے ہیں۔ مسلمان قوم بیچاری کیا یزیدیت کرے گی۔ یہ اس حالت میں جو کچھ کر سکتی ہے وہ یہی ہے کہ ان حکمرانوں سے یہ کہے کہ ان لوگوں کو کم از کم مسلمانوں سے الگ تو کر دو۔ ان سے ہر گز کوئی یہ مطالبہ نہیں کرتا کہ ان کے خلاف جنگ کرو۔ وہ تو صرف یہ کہہ رہے ہیں کہ ان کو ہم مسلمانوں سے الگ کر دو اور آپ اس کے لئے بھی تیار نہیں۔ اس کے لئے بھی آپ بہانے کرتے ہیں اور دورے کر کر کے مسلمانوں کے خیالات بدلنے کی کوشش کرتے ہیں۔"

یکم ستمبر ۱۹۷۴ء

یکم ستمبر کو شاہی مسجد لاہور میں ختم نبوت کنونشن سے خطاب کرتے ہوئے مولاناؒ نے ایک بار پھر دو ٹوک انداز میں مسلمانوں کا متفقہ موقف دہرایا۔ وہ نقاہت کی وجہ سے اور بہت زیادہ تھک جانے کے باعث اس عظیم الشان اجتماع میں اپنا تحریری خطاب پورا نہیں پڑھ سکے، لیکن چونکہ حاضرین میں خطاب کی چھپی ہوئی کاپیاں تقسیم کر دی گئی تھیں۔ اس لیے ان کی پوری بات منظرِ عام پر آ چکی تھی۔ انہوں نے فرمایا:

"یہ معاملہ جو اس وقت اسمبلی میں زیرِ بحث ہے، اپنے

اندر کوئی پیچیدگی نہیں رکھتا، بلکہ کھلے آسمان کی طرح صاف اور عیاں ہے۔ جس شخص کو دین کی معمولی واقفیت بھی حاصل ہو وہ جانتا ہے کہ اسلام میں نبوّت ایک فیصلہ کُن چیز ہے۔ اگر نبی سچا ہو اور کوئی اس کو نہ مانے تو کافر۔ اور اگر وہ جھوٹا ہو اور کوئی اسے مان لے تو کافر۔ بہر حال ایک دعویٰ نبوّت کے بعد یہ کسی طرح ممکن ہی نہیں ہے کہ اس کے ماننے والے اور اس کا انکار کرنے والے ایک اُمت میں جمع ہو سکیں۔ نئی نبوّت ایک سنگین دیوار ہے۔ جو دونوں گروہوں کے درمیان ہمیشہ کے لئے حائل ہو جاتی ہے اور انہیں نہیں ملنے دیتی۔ جب تک کہ وہ منہدم نہ ہو جائے۔ ہر نبوت اپنے ماننے والوں کو ایک الگ اُمّت بناتی ہے اور نہ ماننے والوں کو قطعی طور پر ان سے جُدا کر دیتی ہے۔۔ یہ تو ہے بجائے خود نبوت کی اصُولی حیثیت، لیکن اسلام میں اس امر کا قطعاً کوئی امکان نہیں ہے کہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبوت کا دعویٰ لے کر اُٹھنے والا کوئی شخص سچا نبی ہو سکے، اس لیے کہ قرآنِ حکیم، احادیثِ صحیحہ اور اجماعِ اُمّت کی رُو سے حضور اکرم صلّی اللہ علیہ وسلم اللہ کے آخری نبی ہیں۔ صحابہ کرام نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبوت کا دعویٰ کرنے والے کسی شخص سے بھی یہ نہیں پوچھا کہ اس کے نبی ہونے کی دلیل کیا ہے بلکہ بالاتفاق اس کو جھوٹا مدعی قرار دے کر اس سے اور اس کے ماننے والوں سے جنگ کی اور ان کو وہ حقوق بھی نہیں دیئے جو اسلامی قانون میں مسلح بغاوت کرنے والے مسلمانوں یا ذِمّیوں کو دیئے جاتے ہیں۔ پھر صحابہ رضی اللہ عنہم کے دور

سے آج تک ۱۴ سو برس تک کی مدت میں ہر زمانے کے مسلمان اس بات پر متفق رہے ہیں اور اس میں کبھی کوئی اختلاف نہیں ہوا ہے کہ بعثتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا السلام کے بعد نبوت کا دعویٰ کرنے والا ہر شخص جھوٹا ہے کافر ہے اور اس پر ایمان لانے والا بھی کافر ہے، حتیٰ کہ ایسے مدعی سے اس کی نبوّت کی دلیل پوچھنا بھی کفر ہے، کیونکہ دلیل پوچھنے کے معنی یہ ہیں کہ آدمی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبوت کا دروازہ کھلا سمجھ رہا ہے اور اسے کھلا سمجھنا بجائے خود قرآن و حدیث اور اجماع کی حیثیت سے کفر ہے ــــ اب دیکھئے ایک طرف تو دعویٰ نبوّت بعد از خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق اسلام کا یہ صریح اور متفق علیہ حکم ہے۔ اور دوسری طرف یہ ناقابلِ انکار واقعہ ہے کہ مرزا غلام احمد نے نبوّت کا دعویٰ کیا۔ اپنی "نبوّت" تسلیم کرنے کی لوگوں کو دعوت دی، نہ ماننے والوں کو کافر قرار دیا اور ماننے والوں کی ایک الگ اُمّت بنائی جس کا کوئی فرد اپنے باپ کا جنازہ بھی نہیں پڑھ سکتا اگر وہ اس نئی "نبوّت" پر ایمان نہ لایا ہو۔ سوال یہ ہے کہ یہ مدعی آخر سچا کیسے ہو سکتا ہے؟ اور جب یہ سچا نہیں ہے تو اس کے کافر ہونے اور اس کی تصدیق کرنے والے سب لوگوں کے کافر ہونے میں شک کی کیا گنجائش ہو سکتی ہے؟ اور اس نئے "نبی" کی یہ اُمّت مسلمانوں ہی کے اندر ایک فرقہ کیسے قرار پا سکتی ہے جبکہ وہ اسلام کی سرحد توڑ کر خود اس سے باہر نکل چکی ہے؟"

۱۴ر ستمبر ۱۹۷۴ء

۱۴ر ستمبر کو ۵۔ اے ذیلدار پارک میں اس کامرانی کے سلسلے میں ایک تقریب منعقد ہوئی۔ اس میں جب مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کو خطاب کی دعوت دی گئی تو انہوں نے کہا:

"حضرات مَیں اس مجلس میں صرف سامع کی حیثیت سے حاضر ہوا تھا۔ لیکن بیٹھنے کے بعد پکڑ لیا گیا۔ میں اپنی کمزوری کے باعث زیادہ دیر تک بول نہیں سکتا لیکن یہ موقع ایسا ہے کہ انکار کی ہمت نہیں ہے۔ میں اپنی بچی کھچی طاقت سمیٹ کر جو کچھ کہہ سکتا ہوں وہ آپ کے سامنے عرض کیے دیتا ہوں۔"

انہوں نے فرمایا:

"میں مسٹر بھٹو سے کہتا ہوں کہ آپ ایسا کام نہ کریں جس کے متعلق اُردو میں محاورۃً کہا جاتا ہے کہ بکری نے دودھ بھی دیا لیکن مینگنیاں ڈال کر۔ قوم کا ایک مطالبہ تھا، اسمبلی نے اس کے مطابق کام کیا اور ایک فیصلہ قرار پاگیا۔ اس کے بعد یہ پکڑ دھکڑ اور گرفتاریاں کیوں؟ ان تمام لوگوں کو اب فوراً رہا کیا جانا چاہیئے۔ یہ لوگ ایک ایسا مطالبہ کرتے ہوئے گرفتار کیے گئے تھے جسے اسمبلی اور حکومت نے درست تسلیم کر لیا ہے۔ پھر انہیں گرفتار کرنے اور گرفتار رکھنے کا کیا جواز ہے؟

ایک بات میں خود مرزا ناصر احمد صاحب سے بھی کہتا ہوں۔ میں ان سے کہتا ہوں کہ آپ اپنی عاقبت کی فکر کیجئے۔ ہمیں کوئی خوشی اس بات کی نہیں ہے کہ کسی کو دائرۂ اسلام

سے خارج کیا جائے۔ ہمیں تو دلی خوشی اس بات کی ہوگی کہ جو لوگ اس کفر کی گود میں چلے گئے تھے وہ واپس دائرۂ اسلام میں آجائیں۔ میں مرزا ناصر احمد کو بھی اس بات کی دعوت دیتا ہوں۔ جو دلیلیں وہ پیش کر رہے ہیں ان کے متعلق وہ خود جانتے ہیں کہ وہ کس قدر پوچ اور لغو ہیں۔ جس بات کو قرآن مجید میں صاف صاف بیان کر دیا گیا ہے، جس بات کو خدا کے آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے مکمل طور پر اپنے اُمت کو سمجھا دیا ہے اور جس پر چودہ سو سال سے اُمّت کا اجماع چلا آرہا ہے آپ اس صداقت کے خلاف چل کر اپنی عاقبت کیوں خراب کرتے ہیں؟

مجھے اس سلسلے میں عام لوگوں سے بھی کچھ کہنا ہے۔ ان سے میری گزارش یہ ہے کہ آپ کو جب قادیانیوں سے سابقہ پیش آئے تو انہیں دلسوزی کے ساتھ اسلام کی دعوت دیجئے اور انہیں دائرۂ اسلام میں واپس آنے کے لیئے کہیئے۔ اس کام میں قرآنِ مجید کی اس آیت کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھیئے ـــــ
اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ۔

اس کے بعد بھی اگر وہ باز نہ آئیں تو اللہ کے ہاں آپ بری الذمہ ہیں۔"

۹ر جنوری ۱۹۷۵ء

سُرخ پوش لیڈر خاں عبدالغفار خان مولانا سے ملنے کے لیئے تشریف لائے۔ کوئی گھنٹہ بھر مُلاقات رہی۔

۲۵ر جنوری ۱۹۷۵ء

ایک امریکن پادری مولانا سے ملاقات کے لیئے مغرب کے بعد تشریف لائے۔ مختلف مسائل پر گفتگو ہوتی رہی۔ سوشلزم، عیسائیت اور اسلام موضوع گفتگو رہا —— مولانا محترم نے اسلام کا تعارف کرایا اور اس کی بنیادی تعلیمات بیان کیں۔ تصوف پر بھی مختصر بات چیت ہوئی۔ ساری گفتگو انگریزی میں تھی۔

۲۶ر جنوری ۱۹۷۵ء

ایک صاحب نے سوال کیا کہ جماعتِ اسلامی میں متفقین کو ووٹ دینے کا حق کیوں نہیں دیا گیا؟

مولانا محترم نے فرمایا: ہم تو انہیں رُکنیت کا حق دیتے ہیں کہ آگے بڑھیں اور جماعت کے تمام مُعاملات میں حصّہ لیں لیکن وہ خود ایک مقام تک آکر رُک جاتے ہیں۔ جماعت جو فیصلے کرتی ہے اس کی ذمّہ داری ارکانِ جماعت پر ہوتی ہے۔ متفقین کو ووٹ کا حق دینے کا مطلب یہ ہوگا کہ ان کو فیصلہ کرنے کا حق تو دیا جائے۔ رہی اس کے نفاذ کی ذمّہ داری اور جوابدہی تو وہ اس سے مستثنیٰ رہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ بات کسی ضابطے کی رُو سے درست نہ ہوگی"

۲۸/ جنوری ۱۹۷۵ء

دست شناسی (پامسٹری) کے بارے میں بات ہو رہی تھی۔ مولانا محترم نے فرمایا کہ اس علم سے قیافہ کی حد تک کام لیا جا سکتا ہے۔ جس طرح چہرے سے اور تحریر سے قیافہ شناسی کا کام لیا جاتا ہے۔ پیش گوئی اور مستقبل کی خبریں دینا جائز نہیں" پھر فرمایا "میں نے اس موضوع پر دو چار کتابیں پڑھی رہیں"۔

۲۹/ جنوری ۱۹۷۵ء

حضرت ابوسفیانؓ اور حضرت معاویہؓ کے متعلق سوال کیا گیا کہ بعض لوگوں کے نزدیک یہ حضرات دل سے ایمان نہیں لائے تھے۔

مولانا نے فرمایا کہ حضرت ابوسفیان کے بارے میں بعض علماء کا خیال ہے کہ شروع شروع میں انہیں اسلام پر کامل اعتماد و یقین نہیں تھا، لیکن بعد میں یہ کیفیت نہیں رہی تھی ____ مگر حضرت معاویہؓ کے متعلق ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ ان کے اخلاصِ ایمانی میں کسی نے شبہ ظاہر نہیں کیا"۔

یزید کی نامزدگی کے بارے میں مولانا نے فرمایا کہ یہ حضرت معاویہؓ کی غلطی تھی۔ حضرت معاویہؓ کا یہ کہنا کہ یزید کی نامزدگی میں ملک و ملت کی بہتری تھی اور حالات کا تقاضا یہ تھا کہ ایسا کیا جاتا۔ اس سے چھوٹے پیمانے پر یہ مثال ہے کہ میں جماعت کی امارت سے استعفیٰ دیکر اپنے بیٹے کو اس منصب کے لیئے نامزد کر دیتا اور کہتا کہ جماعت کی بھلائی اسی میں ہے، تو ظاہر ہے یہ بات غلط ہوتی اور آگے چل کر مفاسد کا باعث بنتی"۔

۳۰/ جنوری ۱۹۷۵ء

محترم میاں طفیل محمد امیر جماعتِ اسلامی پاکستان، چنیوٹ میں ختمِ نبوت کانفرنس میں شرکت کے بعد واپس تشریف لائے۔ عصر کی مجلس میں اپنے دورے کی مختصر روداد بیان فرمائی۔ اس کانفرنس میں محترم میاں صاحب نے خطاب بھی فرمایا اور ایک اجلاس کی صدارت بھی کی تھی۔

میاں صاحب نے فرمایا کہ جامعہ محمدی شریف سے مولانا محمد ذاکر صاحب نے چنیوٹ آدمی بھیج کر محمدی شریف آنے کی ہمیں دعوت دی، چنانچہ ہم صبح وہاں چلے گئے۔ انہوں نے گیارہ بجے جلسہ کا اہتمام کر رکھا تھا۔ وہاں محترم میاں صاحب کو سپاس نامہ پیش کیا گیا۔ جس کے جواب میں میاں صاحب نے مفصل تقریر فرمائی۔ اس سفر میں مولانا مفتی سید سیاحُ الدین کاکاخیل اور مولانا گلزار احمد مظاہر بھی میاں صاحب کے ساتھ تھے۔ ان دونوں حضرات نے بھی مختصر خطاب کیا۔

۳۱/ جنوری ۱۹۷۵ء

آج مجلس میں مولانا غلام حقانی صاحب امیر جماعتِ اسلامی سوات موجود تھے۔ انہوں نے زلزلہ زدہ علاقے بیشام میں زلزلہ کی کیفیات اور جماعتِ اسلامی کے کارکنوں کی سرگرمیوں کا قدرے تفصیل کے ساتھ تذکرہ کیا۔

جماعت کے کارکن دو تین سو کی تعداد میں ہر وقت وہاں کیمپوں میں موجود رہتے ہیں اور پیدل چل کر پہاڑوں میں آبادیوں تک پہنچ کر امدادی کام کر رہے ہیں۔

جماعتِ اسلامی کے چودہ کیمپ سرگرمِ عمل ہیں جبکہ دوسری سیاسی یا

مذہبی کسی جماعت کا کوئی کیمپ نہیں ہے، البتہ فوجی دستے وہاں موجود ہیں اور کام کر رہے ہیں۔ پیپلز پارٹی کا ایک ہی کیمپ تھا جو بدنظمی کا شکار ہو گیا ہے۔

جماعتِ اسلامی کے خلاف مذہبی طبقوں کی طرف سے جو فضا پیدا کر دی گئی تھی وہ صاف ہو رہی ہے، اس لئے کہ الیکشن کے زمانے میں تو وہ لوگ موجود تھے مگر اب کہیں نظر نہیں آتے۔ خدمت کے اس وسیع میدان میں تنہا جماعتِ اسلامی ہی سرگرمِ عمل ہے۔ اس بنا پر اس موجودہ پریشان حالی اور درماندگی میں کام آنے والی جماعت کے بارے میں لوگوں کی غلط فہمی دُور ہو گئی ہے۔

یکم فروری ۱۹۷۵ء

مجلس میں ایک صاحب نے سوال کیا جو بیعِ سَلَم کے بارے میں تھا۔ جواب میں مولانا محترم نے فرمایا کہ بیعِ سَلَم میں ضروری ہے کہ:
"جنس متعین کر دی جائے، مقدار متعین کر دی جائے، وقت مقرر کر دیا جائے، اور بھاؤ طے کر دیا جائے۔ نیز ضروری ہے کہ قیمت اسی وقت ادا کر دی جائے۔ اس کے بغیر بیعِ سَلَم صحیح نہ ہوگی"
اِس پر ایک صاحب نے سوال کیا کہ ظاہری شرائط پُوری ہوں مگر خریدار کی نیت ٹھیک نہ ہو، وہ اس سے ناجائز فائدہ اُٹھانا چاہتا ہو تو کیا حکم ہے۔ مولانا نے فرمایا کہ اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے گھوڑا بالکل صحیح سالم ہو مگر اس میں روح نہ ہو"
ایک سوال زمین گروی رکھنے کے بارے میں تھا کہ اس سے فائدہ اُٹھایا جاسکتا ہے یا نہیں۔ مولانا نے فرمایا کہ اس سے جو فائدہ اُٹھایا جائے اسے زیرِ زمین میں سے منہا کیا جائے، ورنہ وہ سود میں شمار ہوگا"

مولانا نے بیان فرمایا کہ ایک مرتبہ سفر میں ایک صاحب نے جو فوجی افسر تھے، مجھے بتایا کہ فوج میں آپ کے لٹریچر پر پابندی ہے۔ اس کا میں نے یہ حل نکالا ہے کہ آپ کی کتابوں کے ساتھ قادیانیوں کی، منکرینِ حدیث کی اور کچھ کتابیں سوشلزم کی جمع کر رکھی ہیں۔ ایک بار میری مخبری ہوگئی کہ میں آپ کی کتابیں پڑھتا ہوں اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ میرے پاس وہ موجود ہیں، چنانچہ جب مجھ سے سوال کیا گیا تو میں نے اقرار کر لیا اور کہا کہ آپ میرے ساتھ میری قیام گاہ پر چلیے۔ جب وہ پہنچے اور مذکورہ بالا تمام کتابیں دیکھیں تو میں نے کہا کہ مجھے کچھ

دیجئے کہ ان میں سے کون کون سی کتابیں میں اپنے پاس نہیں رکھ سکتا۔ یہ سوال سُن کر وہ خاموشی سے چلے گئے اور کوئی جواب نہ دیا"۔

۴ فروری ۱۹۷۵ء

آج سے ۲۲ سال قبل مولانائے محترم کو کار کے حادثے میں بائیں ٹانگ پر چوٹ لگ گئی تھی۔ جس سے پنڈلی پر اگزیما ہو گیا تھا۔ ۲۲ سال کے بعد اب پھر چند روز سے اگزیما کی تکلیف ہے۔ اسکے علاج کے سلسلے میں بات ہو رہی تھی، ایک صاحب نے سوال کیا کہ اُس وقت جس دوا سے افاقہ ہُوا تھا وہی اب بھی استعمال کر لی جائے۔ مولانا محترم نے فرمایا کہ اُس وقت دوا سے نہیں دُعا سے افاقہ ہُوا تھا۔ پھر فرمایا کہ دو خاص موقعوں پر میں نے دُعا کی جس کا اثر میں نے خود اپنی ذات پر دیکھا ہے:-

(۱) اکتوبر ۱۹۴۸ء میں جب مجھے گرفتار کیا گیا، اس وقت مجھے پتھری کی سخت تکلیف تھی۔ ان دنوں ایک دوا استعمال کر رہا تھا اور اس کا اثر بھی کچھ ظاہر ہونے لگا تھا کہ گرفتار ہو گیا اور وہ دوا جاری نہ رکھ سکا۔ ایک روز لائل پور (فیصل آباد) جیل میں مثانے کی پتھری پیشاب کی نالی کے آگے آ گئی اور اس سے پیشاب بند ہو گیا۔ بڑی تکلیف ہوئی۔ لیکن میں ان ظالموں سے تعاون نہیں لینا چاہتا تھا۔ اس وقت میں نے اللہ تعالٰی سے دُعا کی، چنانچہ سولہ گھنٹے سے بند پیشاب خود بخود کُھل گیا اور وہ پتھری نہ معلوم کس کونے میں دبک گئی۔ بیس سال تک پھر اس کی تکلیف نہیں ہوئی۔ ۲۰ سال کے بعد ایک روز معمولی سی تکلیف پر جب ایکس رے کرایا گیا تو وہ بڑے اخروٹ جتنی نوکدار پتھری بن چکی تھی جسے بعد میں لندن میں آپریشن سے نکلوایا گیا تھا۔

(۲) دوسرا واقعہ اگزیما کی تکلیف کا تھا۔ مارچ ۱۹۵۳ء میں جب مجھے گرفتار کیا گیا تو اس وقت میں اگزیما کی تکلیف میں مبتلا تھا اور وہ شدید نوعیت اختیار کر چکا تھا۔ اس حالت میں مجھے گرفتار کر کے لاہور قلعے میں نظر بند کر دیا گیا۔ اب پھر وہی صورت پیش آئی۔ میں اپنی تکلیف کا ذکر کر کے کوئی رعایت نہیں لینا چاہتا تھا۔ اس موقع پر بھی میں نے اللہ تعالیٰ ہی سے دُعا کی، چنانچہ آہستہ آہستہ وہ تکلیف خود بخود ختم ہوگئی اور ایک مہینہ بعد جب مجھے سنٹرل جیل میں منتقل کیا گیا تو اس وقت تک وہ تکلیف بالکل رفع ہو چکی تھی۔

۵/ فروری ۱۹۷۵ء

مولانائے محترم کے خط بنام قاسم رضوی کے حوالے سے سقوط حیدر آباد کے متعلق سوال کیا گیا۔ مولانا نے فرمایا کہ حیدر آباد چاروں طرف سے ہندوستان میں گھرا ہوا ہے۔ انگریز نے اسے فوجی حیثیت سے مضبوط نہیں ہونے دیا تھا اور خود سکندر آباد میں بہت بڑی فوجی چھاؤنی قائم کر کے ہر وقت اس کے سر پر سوار رہتا تھا۔

اس صُورتِ حال میں قاسم رضوی صاحب مسلمانوں کو تقاریر کے ذریعہ سے مشتعل کر کے ایک ایسے راستے پر ڈال رہے تھے جس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا تھا کہ مسلمانوں کا قتلِ عام ہو، چنانچہ میں نے اپنے خط میں وضاحت سے انہیں بتایا تھا کہ ان کا موقف اور طریق کار صحیح نہیں ہے۔

ہندوستان کے ساتھ جنگی لحاظ سے حیدر آباد کی پوزیشن یہ ہے کہ وہاں کے مسلمان بھاگنا بھی چاہیں تو ان کے لیے کوئی راستہ نہیں۔ چاروں طرف ہندوستان ہے اور خود حیدر آباد کی دیہاتی آبادی میں مُسلمان

آبادی برائے نام تھی۔ دیہات میں زیادہ تر ہندو آباد تھے۔ ان حالات میں حیدرآباد کے مسلمانوں کو ہندوستان کے ساتھ جنگ کا مشورہ دینا ان کی خیر خواہی نہیں تھی بلکہ ان کی تباہی کا سامان تھا۔

چاند پر امکانی آبادی کے پیشِ نظر قبلے کے بارے میں ایک صاحب نے سوال کیا تو جواباً مولانا نے فرمایا کہ:

إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ۔۔۔۔۔۔سے اشارہ ملتا ہے کہ چاند پر پہنچ کر سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کے نام پر ایک عمارت بنا دی جائے اور اسے بطور قبلہ استعمال کیا جائے۔"

۷ر فروری ۱۹۷۵ء

جوڑوں کے درد کا ذکر ہو رہا تھا۔ ایک صاحب نے فرمایا کہ مولانا آپ مالش کرائیں، شاید اس سے کچھ افاقہ ہو جائے۔ مولانا نے فرمایا کہ مجھے اس کی عادت نہیں ہے۔ یہاں تک کہ پَیر دبوانے کی بھی عادت نہیں ہے۔ زندگی بھر میں نے کبھی پَیر نہیں دبوائے، البتہ مُعالجین کے کہنے پر کبھی مالش کرائی ہے تو اس سے پنڈلیوں پر ورم آجاتا ہے۔

پھر فرمایا کہ میری حالت تو یہ ہے کہ اگر تکیہ تک بدل جائے تو نیند نہیں آتی، چنانچہ سفر میں یہ مشکل پیش آتی رہی ہے۔"

۸ر فروری ۱۹۷۵ء

اَرضُ القرآن کے سفر کا ذکر ہو رہا تھا۔ مولانا محترم نے کوہِ طور پر جانے کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ کوہِ طور پر اب تک وہ درخت موجود ہے جس سے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کلام فرمایا تھا۔ بالکل سَر سبز ہے۔ ہم اس کے پتے لائے تھے جو اَب بھی ہمارے پاس

موجود ہیں۔

درخت کے گرد چار دیواری بنی ہوئی ہے۔ درخت تک جانے کی عام اجازت نہیں ہے۔ ہم اجازت لے کر درخت تک گئے تھے۔"

سوال کیا گیا کہ پہاڑ تو اللہ تعالیٰ کی تجلّی پڑنے سے جل گیا تھا؟

مولانا نے فرمایا کہ کوہِ طور پر حضرت موسیٰ کھڑے تھے۔ جہاں انہوں نے "اَرِنِی" کہا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے سامنے والے پہاڑ پر تجلّی ڈالی۔ وہ جل نہیں گیا تھا۔ بلکہ ریزہ ریزہ ہو گیا تھا۔"

۱۲ فروری ۱۹۷۵ء

خوابوں کا ذکر ہو رہا تھا۔ مولانا محترم نے فرمایا کہ بعض خواب تو اتنے سچے ہوتے ہیں کہ ہو بہو پورے ہو جاتے ہیں۔"

انہی صاحب نے سوال کیا کہ مولانا کیا آپ کو بھی خواب آتے ہیں؟ جواب تھا کہ کئی کئی برس گزر جاتے ہیں، مجھے کوئی خواب نہیں آتا۔"

ڈارون کے نظریۂ ارتقاء کے بارے میں ایک صاحب نے سوال کیا کہ ہمارے ہاں یونیورسٹی میں بی۔ ایس۔ سی کے کورس میں اسے پڑھایا جاتا ہے۔"

مولانا نے فرمایا کہ **ڈارون** کا نظریۂ ارتقاء سائنس سے تعلق نہیں رکھتا۔ سائنس تو حقیقت اور مشاہدے سے بحث کرتی ہے اور **ڈارون** کی تھیوری بہت سے قیاسات پر مبنی محض ایک نظریہ ہے اور ظاہر ہے کہ ہزار قیاسات بھی ایک مشاہدے کے برابر نہیں ہو سکتے۔"

۲۰ فروری ۱۹۷۵ء

این آئی ٹی کے بارے میں سوال تھا کہ آیا ان میں حصّہ لینا جائز

ہے یا نہیں؟

مولانا نے فرمایا کہ احتیاط یہ ہے کہ جب تک اس کے بارے میں پوری معلومات نہ ہوں خاموشی اختیار کی جائے۔ کوئی صاحب اس کی پوری تفصیل لکھ کر دیں تاکہ اس کے ہر پہلو پر غور کر کے کوئی رائے قائم کی جا سکے۔"

گھروں میں جو کمیٹیاں ڈالی جاتی ہیں ان کے بارے میں فرمایا کہ ان میں کوئی چیز ناجائز نہیں، البتہ زبانی اعتماد پر جھگڑے سے بچنے کے لئے تحریری معاملہ کرنا چاہیئے۔ قرآنِ کریم کی تعلیم یہی ہے کہ ایسے معاملات کو تحریر کر کے اس پر شہادتیں بھی ثبت کر لی جائیں۔"

(سُورۂ بقرہ آیت ۲۸۲ میں اسکی تفصیلی ہدایت موجود ہے)

۲۱ر فروری ۱۹۷۵ء

مولانا نے بتایا کہ وہ سردیوں میں گرم فُل انڈرویر استعمال کرتے ہیں۔" اب کے سال ایک تو خود امریکہ میں خریدا تھا اور ایک لڑکے نے بھیج دیا تھا، مگر جب اسے استعمال کیا تو اس سے الرجی ہو گئی ——— کبھی ان چیزوں سے بھی الرجی ہو جاتی ہے جس سے عام طور پر نہیں ہوتی۔"

فرمایا، تقدیر پر ایمان لانا ضروری ہے لیکن جزئیات میں سے کسی جزئیے پر ذہنی اطمینان نہ ہو تو کوئی مضائقہ نہیں۔ الحمد للہ مجھے اس پر کامل یقین و اطمینان ہے اور اس کے کسی جز میں کوئی تردد کسی درجے میں نہیں۔

مشیتِ ایزدی اور رضائے خداوندی میں فرق ہے۔ کفر اور شرک بھی جب تک مشیتِ الٰہی نہ ہو نہیں ہو سکتا لیکن اللہ کی رضا اس میں نہیں۔ اس کی رضا صرف ایمان و اطاعت میں ہے۔

تقدیر دو قسم کی ہے:
مُبْرَم اور مُعَلّق۔
مُبْرَم اٹل ہے اور مُعلق میں تبدیلی ہو سکتی ہے، لیکن اسے اللہ
ہی تبدیل کرتا ہے۔"

۲؍مارچ ۱۹۷۵ء

ایک سوال کے جواب میں مولانا محترم نے فرمایا کہ ۵؍مارچ ۱۹۵۳ء کو گورنر ہاؤس (لاہور) میں ایک میٹنگ ہوئی۔ گورنر آئی آئی چندریگر تھے۔ انہوں نے کہا کہ آپ عوام سے پُرامن رہنے کی اپیل کریں — یہ قادیانیوں کو اقلیت قرار دینے کی پہلی تحریک کا زمانہ تھا — اس پر میں نے کہا کہ ان حالات میں مشتعل عوام کو صرف اس صُورت میں پُرامن رہنے پر آمادہ کیا جاسکتا ہے کہ حکومت اعلان کرے کہ وہ مطالبات پر غور کرنے اور کسی بہتر اور مناسب حل کے سلسلہ میں عوامی نمائندوں سے بات کرنے کے لیئے تیار ہے، اس پر گورنر صاحب نے فرمایا کہ اس سلسلہ میں وزیراعظم خواجہ ناظم الدین صاحب کو لکھا جائے، چنانچہ میں نے ایک خط کا ڈرافٹ تیار کیا جسے جزئی تبدیلیوں کے ساتھ منظور کر لیا گیا۔ گورنر صاحب نے فرمایا کہ آج ہی اس بارے میں وزیراعظم سے بات کرتا ہوں۔ ہم لوگ گھر پہنچ کر کسی خوش آئند بات سننے کے متوقع تھے۔ کہ اسی رات لاہور میں مارشل لاء کا اعلان کر دیا گیا۔"

سعودی عرب میں مزارات گرانے کے متعلق گفتگو ہو رہی تھی مولانا نے فرمایا کہ میں اس زمانے میں "الجمیعۃ" دہلی، کا ایڈیٹر تھا اور میں نے اس وقت اس کی مخالفت میں لکھا تھا۔ میں نے لکھا کہ حرمین شریفین ساری دُنیا کے مسلمانوں کے لیئے یکساں مقدس اور قابلِ احترام مقامات ہیں۔ وہاں کی یادگاریں ایک تاریخی اور مقدس اہمیت کی حامل ہیں۔ انہیں جُوں کا توں رہنے دیا جائے۔ میرے ان مضامین کی مخالفت میں مولانا غلام رسول مہر صاحب نے "زمیندار" لاہور، میں مضامین

لکھے۔"

کئی سال سے سعودی حکومت نے لونڈیوں کی خرید وفروخت بند کر دی ہے۔ اب وہاں کوئی لونڈی نہیں رکھ سکتا۔ شروع شروع میں جب میں وہاں گیا تو وہاں کے علماء سے اس مسئلے پر مفصل گفتگوئیں ہوئیں۔ بڑی مشکل سے وہ قائل ہوئے۔ پھر انہوں نے اپنی حکومت کو آمادہ کیا تب جاکر یہ سلسلہ بند ہُوا۔"

۴ مارچ ۱۹۷۵ئہ

سوال تھا، اہلِ منبر و محراب مدت ہائے دراز سے مسلسل آپ کے خلاف الزام تراشیاں کرتے چلے آرہے ہیں۔ یہاں تک کہ آپ کی صاحبزادیوں کے بارے میں بھی انہوں نے ناشائستہ باتیں کیں، تو کیا آپ پر اس کا کوئی ردِ عمل نہیں ہوتا۔ اور کوئی پریشانی اور مایوسی نہیں ہوتی؟

جواب تھا کہ میں ان باتوں پر غور نہیں کرتا کہ لوگ میرے بارے میں کیا کہہ رہے ہیں۔ بس اپنے کام سے غرض رکھتا ہوں۔ میں نے تو اس کام کو حق سمجھ کر شروع کیا تھا اس لیے مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ میں اس پر مطمئن ہوں۔"

سوال تھا کہ جس طرح قرآنِ کریم کی تفاسیر ہیں اس طرح اُردو میں احادیث کا ترجمہ اور تشریح بھی ہے؟

مولانا نے فرمایا کہ علامہ وحید الزمان مرحوم نے صحاح ستہ کا ترجمہ کیا تھا جس کے ساتھ کچھ ضروری تشریح بھی ہے اور لغات الحدیث بھی لکھی تھی۔ میرے پاس ان کا یہ مجموعہ تھا جو والد ماجد کی یادگار بھی

تھا، مگر میرے جیل کے زمانے میں بہت سی کتابیں غائب ہوتی رہیں
ان میں ایک یہ مجموعہ بھی تھا جس کے کھو جانے کا مجھے دُہرا افسوس ہے۔
ایک تو احادیث کا عُمدہ مجموعہ ہونے کی بنا پر اور دوسرے والد ماجد کی یادگار
ہونے کی حیثیت سے!"

۵ر مارچ ۱۹۷۵ء

ایک صاحب کا سوال تھا کہ تحریک اسلامی کا کام آپ نے کب
شروع کیا؟"

مولانا محترم نے فرمایا کہ ۱۹۳۸ء میں اِسلامی نظام کا پُورا نقشہ
میرے ذہن میں آگیا تھا جس میں آج تک ترمیم و اضافہ کی ضرورت
محسوس نہیں ہوئی، البتہ عملاً کام کچھ عرصہ بعد شروع ہوُا۔

ایک سوال تھا کہ الجمیعۃ کے نام سے آج کل دہلی سے جو
پرچہ نکل رہا ہے کیا یہ وہی پرچہ ہے آپ جس کے ایڈیٹر رہے ہیں؟"
مولانا نے فرمایا، جی ہاں یہ وہی پرچہ ہے۔ یہ ۱۹۲۵ء کے
اوائل میں نکلنا شروع ہوُا۔ میں آغاز ہی سے اس کا ایڈیٹر تھا۔ اور اس
وقت جمعیت علماءِ ہند کے خیالات سے مجھے اتفاق تھا۔ ۱۹۲۸ء میں مجھے
ان سے اختلاف پیدا ہوُا اور اخبار سے میں علیحدہ ہوگیا۔ "الجہاد فی
الاسلام" اسی زمانے کی تصنیف ہے۔ اس وقت سے اب تک انٹرنیشنل
لاء میں بہت کچھ تغیر ہو چکا ہے اور میں اس نقطۂ نظر سے اس کتاب پر
نظرِ ثانی کا ارادہ رکھتا تھا مگر فرصت نہیں مل سکی۔

علامہ اقبالؒ سے ملاقات کے بارے میں ایک سوال کیا گیا تو فرمایا
علامہ اقبال مرحوم کی دعوت پر میں ۱۶ر مارچ ۱۹۳۸ء کو دارالاسلام

متصل پٹھانکوٹ، مشرقی پنجاب آگیا تھا اور مُلاقات سے پہلے ہی ۲۱؍ اپریل کو ان کا انتقال ہوگیا۔ جس کا مجھے صدمہ ہُوا۔ اکتوبر ۱۹۳۷ء میں لاہور میں میری ان سے تفصیلی مُلاقات ہوئی تھی جس میں یہ بات طے ہوگئی تھی کہ میں حیدر آباد سے پنجاب منتقل ہو جاؤں۔ انہوں نے کہا تھا کہ وہ دارُالاسلام میں سال میں چھ مہینے آکر ٹھہرا کریں گے۔"

تبلیغی جماعت کے بارے میں فرمایا:

شدھی کی تحریک کے جواب میں مولانا محمد الیاس مرحوم (بانی تبلیغی جماعت) نے میوات میں نہایت خاموشی سے کام شروع کیا تھا۔ ایک مرتبہ میں خود بھی مولانا مرحوم کے ساتھ میوات گیا تھا اور ان کے کام کو قریب سے دیکھا تھا۔ اس پر میں نے ترجمان القرآن میں ان کی خدمات کو سراہا تھا اور کچھ تجاویز بھی لکھی تھیں۔ میرا مضمون چھپنے سے تبلیغی جماعت کا ہندوستان بھر میں تعارف اور چرچا ہوگیا۔ اس سے پہلے بہت کم لوگ اس سے متعارف تھے۔"

۱۲؍ مارچ ۱۹۷۵ء

گاڑیوں میں رش کے متعلق مجلس میں گفتگو ہو رہی تھی۔ مولانا محترم نے فرمایا کہ جنگِ عظیم دوم کے بعد گاڑیوں اور بسوں میں رش شروع ہُوا۔ جو اَب تک بڑھتا ہی چلا جا رہا ہے۔ اس سے قبل حالت یہ تھی کہ کئی بار گاڑی کے سفر میں پورے ڈبے میں مَیں اکیلا سفر کر رہا ہوتا تھا۔ کبھی کہیں سے راستے میں ایک دو آدمی سوار ہو جاتے تھے۔"

۱۴؍ مارچ ۱۹۷۵ء

متعدی بیماریوں کی بات ہو رہی تھی اس پر مولانا نے اپنے دو واقعات

سنائے:۔

جب ہم بھوپال میں تھے تو وہاں ہیضے کی وبا پھیل گئی۔ میرے بڑے بھائی صاحب بھی اس میں مبتلا ہو گئے تھے۔ میں تنہا گھر میں انکا تیمار دار تھا، چنانچہ جب تک وہ تندرست نہیں ہو گئے مَیں مسلسل ان کے پاس رَہا ـــــ مگر اللہ کے فضل سے میں اس متعدی بیماری سے محفوظ رَہا۔

حیدر آباد کے زمانے میں طاعون کی وبا پھیلی۔ روزانہ سینکڑوں جنازے اُٹھتے تھے۔ اس کے باوجود کہ ہمارے گھر سے بھی طاعون کے چوہے برآمد ہوئے مگر ہم محفوظ رہے۔

حضورؐ کا فرمان بڑی حکمت پر مبنی ہے کہ جہاں وبا پھیل جائے وہاں جاؤ نہیں، لیکن اگر پہلے سے وہاں موجود ہو تو وہاں سے بھاگو نہیں۔ اگر وہاں سے چلے جانے کی ہدایت ہوتی تو مریضوں کی دیکھ بھال اور مرتے والوں کی تجہیز و تکفین اور تدفین کرنے والا کوئی نہ رہتا۔ یہ چیز اِسلامی اخلاقیات سے بعید تھی۔

-●-

۱۷/مارچ ۱۹۷۵ء

آج مرکز جماعتِ اسلامی پاکستان اچھرہ میں کشمیریوں کے حقِ خود ارادیت (Self Determination) کی تائید و حمایت میں جلسہ ہُوا۔

بانیٔ جماعتِ اِسلامی پاکستان مولانا سید ابُوالاعلیٰ مودودیؒ نے صدارت کی۔ میاں طفیل محمد امیر جماعتِ اسلامی پاکستان نے خطاب فرمایا۔ آپ سے پہلے امیر جماعت پنجاب چودھری غلام جیلانی صاحب نے بھی جلسہ سے مختصر خطاب کیا۔

آخر میں مولانا محترم نے صدارتی خطاب فرمایا۔ پندرہ منٹ کے صدارتی خطاب کا متن درج ذیل ہے:۔

"آج سے بائیس تیئس سال پہلے کی بات ہے، یہ مُعاملہ قریب قریب طے شُدہ سمجھا جارہا تھا کہ سوڈان اور مصر مل کر ایک مملکت بن جائیں۔ دونوں ملکوں کی معیشت ایک دوسرے سے وابستہ تھی اور مذہب بھی دونوں کا ایک ہی تھا، اس لیے دونوں طرف یہ محسوس کیا جارہا تھا کہ ہمیں مِل کر ایک ملک بن جانا چاہیئے، مگر جب مصر میں فوجی انقلاب برپا ہوگیا۔ اور اس کے ساتھ ہی اہلِ مصر کے بنیادی حقوق سلب کرلیئے گئے اور لوگوں سے تحریر و تقریر کی آزادی چھین لی گئی، تو یک لخت سوڈان کی رائے ایسی تبدیل ہوئی کہ مصر کے ساتھ اس کے اتحاد کا سرے سے کوئی سوال ہی باقی نہ رہا۔ زمانۂ قریب کی یہ تاریخی مثال مجھے اس لیئے یاد آرہی ہے کہ کشمیر کے معاملے میں ہمارا سارا مقدمہ اس یقین پر مبنی ہے کہ اگر اہلِ کشمیر کو حقِ خود

ارادیت حاصل ہو، تو وہ لازماً پاکستان کے ساتھ ملنے کا فیصلہ کریں گے، کیونکہ ہماری اور ان کی معیشت بھی ایک دوسرے سے وابستہ ہے اور اسلام کا رشتہ بھی ہمارے اور ان کے درمیان مشترک ہے۔ ہمارا یہ یقین بجائے خود خواہ کتنا ہی درست ہو، لیکن جو حالات ہمارے مُلک میں پیدا ہو رہے ہیں، ان میں اہلِ کشمیر بہر حال یہ سوچنے پر مجبور ہوں گے کہ کیا وہ اپنی قسمت ایک ایسے ملک کے ساتھ وابستہ کریں جس میں لوگوں کا گلا گھونٹ دیا گیا ہو، ان کے حقوق سلب کر لیئے گئے ہوں، اور وہ اتنی آزادی بھی نہ برت سکیں جتنی ایک ظالم حکومت کے اقتدار میں ان کو حاصل ہو؟ اور کیا اسلام کا رشتہ انہیں اُس مُلک سے وابستہ کرتا ہے جہاں اسلام کے بجائے سوشلزم کی باتیں ہو رہی ہوں؟ اِس لیئے اہلِ کشمیر کے حقِ خود ارادیت کا مطالبہ لے کر اُٹھنے کے ساتھ ہمیں محض اس مفروضے پر ہی اعتماد نہ کر لینا چاہیئے کہ انہیں جب یہ حق حاصل ہوگا، تو وہ ضرور ہمارے ساتھ ہی ملنے کا فیصلہ کریں گے، بلکہ ہمیں اپنے اندر کوئی کشش بھی ایسی پیدا کرنی چاہیئے جو انہیں ہماری طرف مائل کر سکے۔ جس اسلام کا رشتہ ہمیں ان سے ملاتا ہے، وہ اسلام واقعی ہمارے ہاں کار فرما نظر آنا چاہیئے۔ جس آزادی کی ہر قوم کو ہوا اور پانی کی طرح ضرورت ہوتی ہے، وہ یہاں پائی جانی چاہیئے۔ یہ چیزیں اگر ہمارے ملک میں موجود ہوں، تو ان سے اہلِ کشمیر کے دلوں میں ہمارے لیئے زبردست کشش پیدا ہو

سکتی ہے اور وہ ہمارے ساتھ الحاق کے لیئے دل کھول کر زبردست جدوجہد کر سکتے ہیں، لیکن اگر پوزیشن یہ ہو کہ جہاں جہاں اِسلام موجود ہو، وہاں سے بھی نکالا جا رہا ہو اور پورے مُلک کو ایک قید خانے میں تبدیل کیا جا رہا ہو، تو پاکستان کی طرف ان کی کشش کو کم کرنے کے ہم خود ذمہ دار ہوں گے۔

آج مقبوضہ کشمیر میں جہاں ہر دس آدمیوں پر ایک سپاہی مسلط ہے۔ حق خود ارادیت کا دن منایا جا رہا ہے اور پاکستان میں آج ہی ہم ان کے سامنے یہ مظاہرہ کر رہے ہے کہ انہیں خود ارادیت کا حق دلوانے کے لیئے ہم یہاں نہ برسرِ عام کوئی جلوس نکال سکتے ہیں، نہ کسی کھُلے میدان میں کوئی جلسہ کر سکتے ہیں۔ کیا اس سے مقصُود اہلِ کشمیر کو یہ بتانا ہے کہ حقِ خود ارادیت حاصل کرکے اگر وہ ہمارے مملک کے ساتھ ملنے کا فیصلہ کرنا چاہتے ہوں، تو اس صُورتِ حال سے انہیں دوچار ہونا پڑے گا؟

ایک قوم کے لیئے یہ کوئی نئی بات نہیں کہ کوئی قریب یا دُور کا ہمسایہ مُلک زبردستی اس کے کسی علاقے پر قبضہ کر لے یا اس کے کسی حق پر دست درازی کرے، اور وہ اتنی طاقت نہ رکھتی ہو کہ اس سے اپنا چھینا ہُوا علاقہ واپس لے سکے یا اپنا سلب شدہ حق حاصل کر سکے۔ ایک باعزت اور خود دار قوم کو ایسی حالت سے سابقہ پیش آجائے، تو وہ انتظار کرے گی اور اُس مسئلے کو مرنے نہیں دے گی چاہے اس میں پچاس سال لگیں یا سو سال، لیکن ہم نے اپنے ہاں

اس کے بالکل برعکس طرزِ عمل دیکھا ہے۔ ہمارے ملک کے ایک حصے مشرقی پاکستان کو زبردستی ہم سے الگ کیا گیا۔ ہم اپنے حکمرانوں سے بار بار کہتے رہے کہ اس علیحدگی کو تسلیم نہ کرو، مگر دُنیائے اسلام سے ایک بارات منگائی گئی اور اس میں یکایک بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کا اعلان کر دیا گیا۔ پھر جس شخص نے دُشمنوں سے ساز باز کر کے مشرقی پاکستان کو الگ کروایا تھا، اسے بُلا کر دولہا کی طرح اس کا استقبال کیا گیا۔ اس سے ہمیں خدشہ ہے کہ تھوڑے بہت مظاہرے کر کے کہیں کشمیر کی موجودہ تقسیم کو بھی تسلیم نہ کر لیا جائے۔ سات کروڑ مُسلمانوں کے علاقے کی علیٰحدگی کو جس فیاضی کیساتھ تسلیم کیا گیا ہے۔ اس کے آگے چالیس پچاس لاکھ کشمیریوں کی حیثیت ہی کیا ہے۔

اگر کشمیر کے مُعاملہ میں فی الواقع کوئی سنجیدگی ہے تو صِرف ہڑتال کرنے اور یوم منانے پر اکتفا نہ کیا جائے، بلکہ حکومت کی طرف سے کوئی عملی قدم بھی اُٹھایا جائے۔ معاہدۂ شملہ کی خلاف ورزی خود بھارت نے کی ہے۔ اس نے یکطرفہ طور پر آپ سے گفت و شنید کیئے بغیر ایک متنازعہ مُعاملہ طے کر ڈالا ہے۔ اس لیئے اب پاکستان پر مُعاہدۂ شملہ کی پابندی باقی نہیں رہی ہے۔ خود بھٹو صاحب نے تسلیم کیا ہے کہ وہ اس مسُلے کو اقوامِ متحدہ میں لے جا سکتے ہیں، لیکن ایسا نہ کرنے کے لیے وہ یہ عذر پیش کرتے ہیں کہ اس طرح چین کو خواہ مخواہ پریشانی پیش آئے گی اور روس کے ساتھ اس کی کشمکش بڑھ جائے گی۔ سوال یہ ہے کہ کیا

چین نے آپ سے ایسی کوئی بات کہی ہے؟ اُس کا حال تو یہ ہے کہ آپ کے بنگلہ دیش تسلیم کر لینے کے بعد بھی اس نے جارحیت کی اِس پیداوار کو تسلیم نہیں کیا اور کشمیر کے مُعاملے میں بھی اس کا جو تازہ بیان شائع ہُوا ہے اُس میں کُھلم کُھلا سرکاری طور پر کشمیریوں کے حقِ خود ارادیت کی تائید کی گئی ہے۔

ہڑتال اور یومِ خود ارادیت منانے سے اگر قوم کا دِل بہلانا مقصُود نہیں ہے اور اس سے آگے بھی کچُھ کرنے کا ارادہ ہے، تو وہ معلوم ہونا چاہیئے۔ پاکستان میں کوئی ایک شخص بھی ایسا نہ مِلے گا جو کشمیر کے لوگوں کو حقِ خود ارادیت دِلوانے کا حامی نہ ہو۔ وزیرِ اعظم اس مقصد کے لیئے کوئی عملی تجویز اپنے ذہن میں رکھتے ہوں تو قوم کو اعتماد میں لیں' نمائندہ اصحاب کی کانفرنس بُلائیں۔ مسئلے کے ہر پہلو پر غور کر کے باہمی مشاورت سے کوئی قدم اُٹھائیں۔ انشاءاللہ اس کام میں پُوری قوم ان کا ساتھ دے گی"

۲۰/مارچ ۱۹۷۵ء

ماموں کانجن، ضلع فیصل آباد سے ایک صاحب مُلاقات کے لیے آئے۔ ان کے ساتھ علاقہ نورستان کے ایک صاحب اور بھی تھے۔ ان صاحب نے اپنا واقعہ بیان کیا کہ آج سے تقریبًا پندرہ سال قبل میری لڑکی کا دماغی توازن بگڑ گیا تھا جس کے لیئے آپ سے دُعا کرائی تھی۔ اللہ کے فضل سے وہ لڑکی صحت یاب ہوگئی اور اَلْحَمْدُ لِلّٰہ آج تک اسکی حالت بالکل ٹھیک ہے۔ میں جب لاہور آتا ہوں وہ آپ سے دُعا کرانے کی تاکید کرتی ہے۔ اور واپسی پر پوچھتی ہے کہ میں نے آپ سے دُعا کرائی تھی یا نہیں۔ ایک بار تو باصرار میرے ساتھ آپ کو دیکھنے کے لیئے آئی تھی۔"

۲۱/مارچ ۱۹۷۵ء

فرمایا کہ آج کل میں صرف ایک گھنٹہ اخبارات پڑھنے میں صَرف کرتا ہوں۔ اِس لیئے جو چیز نظر سے چوک جائے اس کے پڑھنے کی نوبت پھر نہیں آتی۔

مولانا محترم ان دنوں درج ذیل اخبارات روزانہ دیکھتے ہیں:۔
"نوائے وقت"، "جنگ"، "مشرق"، "وفاق"، "امروز"، "حریت"، "دعوتِ دہلی" (بھارت)۔
اور انگریزی کے
(ڈان) Dawn کراچی، (پاکستان ٹائمز) "Pakistan Times" لاہور۔ ان میں سے نوائے وقت، پاکستان ٹائمز اور جنگ کا باقاعدہ مُطالعہ کرتے۔ باقی اخبارات کو سَرسَری دیکھ لیتے۔

۲۲ر مارچ ۱۹۷۵ء

آج مولانا محترم کی مجلس میں پروفیسر عبدالغفور احمد صاحب ایم۔ این۔ اے (ممبر نیشنل اسمبلی)، سیکرٹری جنرل متحدہ محاذ (UDF) اور ڈاکٹر محمد یعقوب ایم۔ پی۔ اے (ممبر پراونشل اسمبلی) صوبہ سرحد، بھی موجود تھے۔ سیاسی حالات پر گفتگو رہی۔

۲۳ر مارچ ۱۹۷۵ء

ایک صاحب نے اپنا ایک خواب بیان کیا اور تعبیر پوچھی۔
مولانا محترم نے فرمایا کہ میں خوابوں کی تعبیر نہیں جانتا۔ تعبیرِ خواب کا علم سراسر وہبی ہے جسے کتابوں سے پڑھ کر حاصل نہیں کیا جا سکتا، چنانچہ بغیر علم کے محض ظن و تخمین سے کام لینا پڑتا ہے۔ اس لیے میں نے اس پر کبھی توجہ نہیں دی۔

انبیاء علیہم السلام کے خواب تو روزِ روشن کی طرح ہوتے ہیں۔ ان کی تعبیر بھی اللہ تعالیٰ خود ہی القا کر دیتا ہے۔ تعبیرِ خواب کا معاملہ ہو تو حضرت یوسف علیہ السلام کا ذکر ناگزیر ہو جاتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت میں حضرت ابن سیرین تعبیرِ خواب کے امام تھے۔"

۲۸ر مارچ ۱۹۷۵ء

آج نمازِ عصر کے بعد مولانا محترم کی زیرِ صدارت اسلامی جمعیت طلبہ کے زیرِ اہتمام شاہ فیصل شہید کی شہادت پر تعزیتی اجلاس ہوا۔ مولانا محترم نے نصف گھنٹہ خطاب فرمایا اور شاہ فیصل شہید کی دینی و ملی خدمات کو خراجِ تحسین پیش کیا۔"

۳۰ مارچ ۱۹۷۵ء

آج جماعتِ اسلامی صوبہ پنجاب کے زیرِ اہتمام ہونے والی پانچ روزہ تربیت گاہ کے چوتھے روز نمازِ عصر کے بعد سوال و جواب کی نشست ہوئی۔ مولانا محترم نے شرکاءِ تربیت کے سوالوں کے جوابات دیے۔

۳۱ مارچ ۱۹۷۵ء

آج نعیم صدیقی صاحب کے منجھلے لڑکے مصباح الایمان کی دعوتِ ولیمہ تھی۔ مولانا محترم ۸۔ اے ذیلدار پارک ان کے ہاں تشریف لے گئے۔ گفتگو کے دوران میں فرمایا:۔

"پٹھان کوٹ میں تقریباً میری آدھی لائبریری رہ گئی تھی جس میں بہت سے کٹنگ اور مُسَوَّدے[۱] اور یادداشتیں تھیں۔"

اچھرے والے مکان کے بارے میں فرمایا "اب تو یہاں بہت آبادی ہو چکی ہے، لیکن ہم جب یہاں آئے تھے تو ہماری کوٹھی سے آگے دُور دُور تک کوئی عمارت نہیں تھی۔ ناہموار کھلی زمین پڑی تھی۔ میں صبح کے وقت بچوں کے ساتھ اِدھر سیر کو آیا کرتا تھا (اشارہ تھا، ۸۔ اے ذیلدار پارک کی طرف) اب تو گنجان آبادی ہو گئی ہے۔"

اس مجلسِ ولیمہ میں نوابزادہ نصراللہ خاں، مجید نظامی، ڈاکٹر وحید قریشی سابق پرنسپل ایم۔ اے۔ او کالج اور دیگر پروفیسر صاحبان، وکلاء اور سیاسی کارکنان اور صحافی شامل تھے ———— مولانا محترم واپسی پر

---

[۱] مُسَوَّدَہ اور مُسَوِّدَہ دونوں طرح اہلِ زبان کے نزدیک درست ہے۔ لیکن مولانا محترم بالالتزام مُسَوَّدَہ ہی بولتے تھے۔

رانا ظفراللہ صاحب کی کار میں واپس آئے۔ رانا صاحب خود کار چلا رہے تھے۔

۲/ اپریل ۱۹۷۵ء

مُسدس حالی کا ذکر ہو رہا تھا۔ مولانا نے فرمایا کہ اس موضوع پر آج تک اس مرتبے کی اور کوئی کتاب نہیں لکھی گئی نیز حضورؐ کی نعت میں حالی نے کمال یہ کیا ہے کہ کوئی چیز شریعت کے خلاف نہیں کی۔ حالانکہ شاعری میں عام طور پر مبالغہ اور تجاوز ہو ہی جاتا ہے ——— حالی شیعہ خاندان سے تعلق رکھتے تھے مگر خود سُنی ہو گئے تھے"

۳/ اپریل ۱۹۷۵ء

مولانا عبدالسلام نیازی مرحوم مولانا محترم کے اساتذہ میں سے ہیں۔ ایک صاحب نے ان کے بارے میں سوال کیا۔

مولانا نے فرمایا کہ مولانا عبدالسلام صاحب فلسفہ و معقولات کے ماہر تھے۔ نہایت شیوہ بیان اور طلیق اللسان کہ گھنٹوں ان کی تقریر سُن کر بھی آدمی سیر نہیں ہوتا تھا۔ میرے والد ماجد کے بہت عقیدت مند تھے۔ والد صاحب مرحوم نے میرے بچپنے ہی میں ان سے کہہ دیا تھا کہ اسے عربی پڑھانا۔ چنانچہ بچپن میں بھی مَیں نے ان سے پڑھا ہے۔ پھر "الجمیعتہ" دہلی کی ادارت کے زمانے (۲۸-۱۹۲۵ء) میں جب مَیں نے عرض کیا کہ کچھ کتابیں رہ گئی ہیں انہیں پڑھنا چاہتا ہوں تو فوراً مان گئے۔ فرمایا: صبح کی اذان کے وقت میرے مکان پر آجایا کرو۔ ان کا مکان ہمارے مکان سے تقریباً ڈیڑھ میل کے فاصلے پر تھا۔ میں باقاعدگی سے صبح کی اذان کے ساتھ ہی ان کے دروازے پر موجود ہوتا۔ کسی روز اگر

ان کی طبیعت آمادہ نہ ہوتی تو اندر ہی سے فرمادیا کرتے: "سید بادشاہ" آج طبیعت حاضر نہیں ہے۔

مرحوم سلسلۂ چشتیہ سے وابستگی رکھتے تھے۔ "نیازی" کی نسبت بھی ایک بزرگ نیاز احمد بریلوی سے عقیدت کی بنا پر تھی۔ وہ بزرگ چشتی تھے۔ ہمارا خاندان ہندوستان میں سلسلۂ چشتیہ کا پیش رو ہے۔ اس بنا پر وہ سن رسیدگی اور اُستاد ہونے کے باوجود میری بہت عزت کرتے اور اس بنا پر مجھے "سید بادشاہ" کہہ کر پکارتے۔

۸ر اپریل ۱۹۷۵ء

آج ایک صاحب نے علامہ اقبال مرحوم کے ساتھ ملاقات کے بارے میں سوال کیا۔

مولانا نے فرمایا کہ دو چار ملاقاتیں ان سے ہوئی تھیں۔ انہی کے کہنے پر میں پنجاب منتقل ہوا تھا۔ ان کے ساتھ پہلی ملاقات ۱۹۲۹ء میں حیدر آباد دکن میں ہوئی تھی جب مرحوم وہاں تشریف لے گئے تھے۔ میں اُس زمانے میں حیدر آباد ہی میں تھا۔ اس وقت مرحوم میری کتاب "الجہاد فِی الاسلام" پڑھ چکے تھے۔ پھر ۱۹۳۷ء میں دو ایک ملاقاتیں ہوئیں۔ مرحوم ترجمانُ القرآن باقاعدگی سے پڑھتے تھے۔ اور جب آنکھوں میں تکلیف ہوگئی تو پڑھوا کر سنتے تھے۔"

آج ریڈیو پاکستان لاہور کے نمائندوں نے بعد نمازِ مغرب مولانا محترم سے تقریباً دو گھنٹے انٹرویو ریکارڈ کیا جسے ریڈیو کے لائبریری سیکشن میں محفوظ رکھا جائے گا۔ تقریباً چالیس سوالات و جوابات پر مشتمل یہ انٹرویو بہت اہمیت کا حامل ہے۔ ریڈیو پاکستان کی طرف سے یہ انٹرویو جناب

ضیاءُ الاسلام انصاری اور جناب عبدالقادر حسن نے لیا ــــــ نیز یہ انٹرویو
حفیظ الرحمٰن احسن صاحب نے بھی ریکارڈ کیا تھا اور پھر انہی کے توسط
سے ترجمانُ القرآن کی ایک خصوصی اشاعت میں شائع ہُوا۔

۱۵/ اپریل ۱۹۷۵ء

آج مولانا محترم آرام اور آب و ہوا کی تبدیلی کی غرض سے دو ہفتے
کے لیئے اسلام آباد تشریف لے گئے۔ اسلام آباد میں مولانا کا قیام اپنے
برادرِ نسبتی جناب ناظر شمسی صاحب کے ہاں رہے گا۔ اہلیہ محترمہ بھی ساتھ
گئی ہیں۔

۲۸/ اپریل ۱۹۷۵ء

مولانا محترم تقریباً دو ہفتے اسلام آباد میں قیام کے بعد آج واپس
تشریف لے آئے ہیں ــــــ آج کے بعد عصر کی نشست میں زیادہ تر گفتگو
صحت کے بارے میں رہی۔ مولانا نے فرمایا کہ آرام کا موقع وہاں بھی
نہیں مِلا۔ وہاں بھی عصر کی نشست میں روزانہ تین چار سو آدمی ہوتے تھے۔
کبھی یہ تعداد دوگنی ہو جاتی اور آخری روز تو ہزار سے زاید افراد ہونگے۔
حضورؐ کی نعت کے بارے میں ایک سوال کے جواب میں فرمایا کہ
مولانا حالیؔ نے نعت میں نہایت درجہ احتیاط ملحوظ رکھی ہے۔ ان کی نعت
"اے خاصۂ خاصانِ رسل وقتِ دعا ہے" بہت اچھی نعت ہے۔ پھر فرمایا کہ
شیخ سعدیؒ کے یہ مشہور نعتیہ شعر:

بَلَغَ العُلٰی بِکَمَالِہٖ   کَشَفَ الدُّجیٰ بِجَمَالِہٖ
حَسُنَتْ جَمِیعُ خِصَالِہٖ   صَلُّوا عَلَیْہِ وَآلِہٖ

بھی بہترین نعت ہے۔"

۷؍مئی ۱۹۷۵ء

مولانا نے فرمایا کہ چند روز پہلے ایک صاحب میرے پاس آئے۔ (نام نہیں بتایا) انہوں نے ایک بال پوائنٹ پن مجھے دیا اور کہا کہ مَیں تاشقند (روسی ترکستان) گیا تھا وہاں ایک صاحب مجھے پاکستانی سمجھ کر علیحدگی میں ملے۔ انہوں نے آپ کو سلام کہا ہے اور یہ پَن آپ کے لئے بھجوایا ہے۔ اپنا نام اور پتہ انہوں نے نہیں بتایا تھا۔"

۱۰ر مئی ۱۹۷۵ء

سوالات (صوبہ سرحد) کے دو اڑھائی سو طلبہ کا ایک وفد مولانائے محترم سے ملنے کے لئے آیا۔ ان کے مختلف سوالات کا جواب دیتے ہوئے مولانا نے فرمایا:

"جب ایک معقول اور دل لگتی بات کو عمدہ اخلاق کے لوگ لے کر کھڑے ہوں اور سخت سے سخت ظلم وستم سہنے کے باوجود اپنی بات ہر حالت میں لوگوں کے سامنے پیش کرتے چلے جائیں، تو لازمی طور پر اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اخلاقی برتری اور دعوت کی معقولیت وصداقت اپنی فطری طاقت سے آگے بڑھتی چلی جاتی ہے۔ اس تحریک کے مخالف اس کے کارکنوں پر جتنا ظلم کرتے ہیں، اتنے ہی وہ ملک کے رہنے والے شریف النفس اور نیک طبع لوگوں کی نظر سے گرتے چلے جاتے ہیں اور ان کے مقابلے میں تحریک کے کارکن جتنی ہمت اور ثابت قدمی کے ساتھ ظلم برداشت کرتے چلے جاتے ہیں اور اپنی حق پرستی کی راہ سے بال برابر بھی نہیں ہٹتے، اتنی ہی ان کی قدرومنزلت عام دیکھنے والوں ہی میں نہیں، بلکہ خود دشمنوں کی صفوں میں بھی بڑھتی چلی جاتی ہے۔ پھر جب فیصلہ کن مقابلے کا وقت آتا ہے تو قدم قدم پر ان لوگوں کی ہمدردیاں بھی تحریک کے کارکنوں کے کام آتی ہیں جو دشمنوں کے جبر کی وجہ سے خاموش بیٹھے تھے، مگر دل سے اس دعوت کے حامی تھے۔ یہاں تک کہ چند مٹھی بھر ہٹ دھرم دشمن ہی میدان میں رہ جاتے ہیں جن کا ساتھ دینا تو درکنار

ان کے پیچھے رونے والا بھی کوئی نہیں ہوتا۔

یہ وہ سبق ہے جو ہم کو رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوتِ حق کے مطالعے سے حاصل ہوتا ہے۔ اس لیئے تحریکِ اسلامی کے کارکنوں کو اسلامی نظام برپا کرنے کیلئے جمہوری اداروں کی مٹی پلید ہونے اور شہری آزادیاں سلب ہوجانے اور بنیادی حقوق کچل دیئے جانے پر ہمت ہار کر نہیں بیٹھ جانا چاہیئے بلکہ کام کی نئی راہیں تلاش کر کے اپنی منزل کی طرف پیش قدمی جاری رکھنی چاہیئے۔"

ایک سوال کے جواب میں مولانا نے فرمایا:۔

"پڑھے لکھے لوگ، بالخصوص جدید تعلیم یافتہ نوجوان بڑی حد تک ہماری دعوت کو سمجھ چکے ہیں۔ اب ان کا کام یہ ہے کہ عوام الناس کے اندر پھیل کر اُس زبان میں یہ دعوت اُن کے سامنے پیش کریں جسے وہ سمجھ سکتے ہوں اور انہیں اپنا ہمنوا بنانے کی کوشش کریں۔" انہوں نے کہا کہ اس کام میں بڑی مشکل یہ پیش آرہی ہے کہ عوام کو جھوٹے وعدوں اور پُرفریب باتوں سے دھوکا کھانے کی عادت ڈال دی گئی ہے جسے چھڑانا سخت محنت طلب کام ہے۔ ایک فریبی سے تلخ تجربات اُٹھا کر وہ اس سے بیزار ہو بھی جائیں، تو کسی دوسرے فریبی سے دھوکا کھانے کے لیئے تیار رہتے ہیں۔ اور کوئی اگر سبز باغ دکھانے کے بجائے سنجیدگی کے ساتھ ایسا پروگرام ان کے سامنے پیش کرے، جو حقیقت پر مبنی ہو تو اس کی باتیں ان کے دل کو نہیں لگتیں۔ اس حالت میں محض کامیابی کو اپنا مقصود بنانے والے تو ایک فریب کار

گروہ کو شکست دینے کے لیئے اس سے بڑھ کر فریب کاری پر اُتر آتے ہیں، مگر جن لوگوں کو ملک کی اصلاح کرنی ہے ان کے لیئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے کہ صبر کے ساتھ آہستہ آہستہ عوام کی اس بُری عادت کو بدلنے کی کوشش کرتے چلے جائیں۔ غالب امکان اسی بات کا ہے کہ پے دَر پے تلخ تجربات کے بعد آخرکار ان لوگوں کو عقل آجائے گی اور یہ معقول باتیں سننے اور قبول کرنے کے لیئے تیار ہوجائیں گے، لیکن اگر انہوں نے دھوکے ہی کھانے کا فیصلہ کر لیا ہو تو پھر بہتر یہی ہے کہ ان کی یہ خدمت دوسرے لوگ ہی انجام دیتے رہیں۔ ہمیں بہرحال خُدا کے ہاں اپنا نام فریب کاروں میں نہیں لکھوانا ہے۔"

ایک اور سوال کے جواب میں کامیابی کے صحیح تصور کی وضاحت کرتے ہوئے مولانا محترم نے قرآنِ پاک سے حضرت لُوط علیہ السّلام کی مثال دی۔ انہوں نے کہا:۔

"وہ سالہا سال اپنی قوم کو راہِ راست پر لانے کی کوشش کرتے رہے مگر اس قوم کے کسی ایک فرد نے ان کی دعوتِ اصلاح قبول نہ کی، حتیٰ کہ جب اللہ تعالیٰ نے اس پر عذاب نازل کرنے کا فیصلہ فرمایا تو پُورے ملک میں اہلِ ایمان کا صرف ایک گھر پایا جاتا تھا، اور وہ گھر خود حضرت لُوط علیہ السّلام کا تھا، اور اس میں بھی ان کی اپنی بیوی ایمان لانے والی نہ تھی۔ اب کیا یہ کہا جائے گا کہ حضرت لُوطؑ ناکام ہو گئے؟ نہیں، بلکہ ناکام وہ قوم ہوئی جس نے ان کی بات نہیں مانی، وہ بہرحال کامیاب تھے، کیونکہ انہوں نے اپنا

فرض پوری طرح انجام دے دیا۔ اس مثال سے کامیابی و ناکامی کا اِسلامی تصور اچھی طرح سمجھا جا سکتا ہے۔ حق کی دعوت کو اپنی زندگی کے آخری سانس تک پیش کرتے چلے جانا ہی ایک حق پرست انسان کی اصل کامیابی ہے۔ قوم اگر اس حق کو قبول کر لے جسے وہ پیش کر رہا ہے تو قوم بھی کامیاب ہو جائے گی، لیکن اگر وہ اسے رد کر کے باطل کے پیچھے چل پڑے تو ناکام وہ ہوگی نہ کہ وہ شخص جو اسے حق کی طرف بُلا رہا تھا، البتہ اگر وہ دُنیا میں کامیابی حاصل کرنے کی خاطر خود حق سے منحرف ہو جائے اور ہر طرح کے ناجائز ہتھکنڈے استعمال کرنے لگے تو چاہے دُنیا کی ساری کامیابیاں اسے حاصل ہو جائیں، خُدا کے ہاں وہ یقیناً ناکام و نامُراد ہو کر رہے گا"

پاکستان کی اسمبلیوں سے حزبِ اختلاف کے بائیکاٹ کے بارے میں ایک سوال کے جواب میں مولانا نے فرمایا:۔

"دُنیا میں جہاں بھی پارلیمانی طرزِ حکومت رائج ہے وہاں اکثریت ہی حکومت کرتی ہے اور اقلیت حزبِ اختلاف بن کر رہتی ہے، لیکن یہ مثال پیش کرنے کا شرف پہلی مرتبہ ہمارے ملک ہی کو حاصل ہُوا ہے کہ اکثریت نے اقلیت کو تنگ کرتے کرتے اتنا بے بس کر دیا کہ آخر کار وہ بائیکاٹ کرنے پر مجبور ہو گئی۔ اس کارِ خیر کا اصل مقصد اب کُھل کر زبانوں پر آ رہا ہے کہ اقلیت اسمبلی کی نشستیں خالی کرے، تاکہ ضمنی انتخابات اور آزاد کشمیر کے انتخابات سے جو "گراں قدر" تجربات حاصل ہوئے ہیں ان سے کام لیکر پوری

اسمبلی اکثریت کی اسمبلی ہو جائے اور حزبِ اختلاف کے
خرخشے سے مستقل نجات حاصل کر لی جائے۔ آخر اس سے
زیادہ مثالی پارلیمانی نظام اور کون سا ہو سکتا ہے جس
میں ہر مسودۂ قانون پیش ہوتے ہی پاس ہوتا چلا جائے
اور مہینوں کا کام دو دِن ہی میں انجام دے کر فراغت حاصل
کر لی جائے۔"

ان حالات میں ملک سے دلچسپی رکھنے والے لوگوں کے اندر پیدا
ہونے والی مایوسی کے بارے میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے
مولانا نے کہا:۔

"میرے پاس تو مایوسی آج تک کبھی نہیں پھٹکی، بلکہ یہ
لفظ میری لغت ہی سے خارج ہے۔ دوسرے لوگ جو
مایوس ہو رہے ہیں ان سے بھی میں یہ کہتا ہوں کہ ہمیشہ
اللہ سے اچھی اُمیدیں رکھتے ہوئے حق و صداقت کو سربلند
کرنے کے لیئے جان توڑ جدّوجہد کرتے چلے جاؤ اور اپنی
طرف سے کوشش کا حق پُوری طرح ادا کر دینے کے بعد
نتیجہ اللہ پر چھوڑ دو۔ ضروری نہیں ہے کہ تمہاری خدمت کے
نتائج تمہارے جیتے ہی برآمد ہو جائیں۔ تم اگر ایک حق
پرست کی طرح اپنا فرض انجام دیتے ہوئے مر بھی جاؤ تو
تمہاری حیثیت اس شخص کی سی ہوگی جو حج کے لیئے گھر سے
نکلے اور دورانِ سفر ہی میں اس کی زندگی کا آخری وقت آ
جائے۔ جس طرح وہ حج کے ثواب سے محروم نہ رہے گا۔
اسی طرح تم بھی راہِ حق کی جدّوجہد کے ثواب سے محروم نہ
رہو گے۔"

ایک اور سوال کے جواب میں مولانا نے فرمایا۔

"اسلام میں محض زبان کسی قومیت کی بنیاد قرار نہیں پاتی۔ اگر ایسا ہوتا تو حضور نبی کریمؐ اور ابو جہل اور ابو لہب ایک دوسرے کے دشمن نہ ہوتے۔ اس کے برعکس اللہ اور رسُول کو ماننے والے ایک قوم قرار پائے۔ جن میں عربی بولنے والوں کے شانہ بشانہ حضرت سلمان فارسیؓ بھی تھے۔ اور خُدا اور رسُول کا انکار کرنے والے الگ قوم قرار پائے۔" مولانا نے مزید فرمایا کہ اسلام کسی خاص زبان کو بولنے سے منع نہیں کرتا۔ پٹھان پشتو بولیں، بلوچ بلوچی بولیں، پنجابی اور سندھی اپنی اپنی زبانیں بولیں۔ وہ اپنے مادری زبانوں میں ترقی یافتہ ادب اور علوم و فنون پیدا کریں، اس لیئے کہ ہماری قومیت کا فرق اسلام اور کفر کی بنیاد پر ہو گا۔ لسانی قومیت کی بہت بڑی چوٹ ہم مشرقی پاکستان میں کھا چکے ہیں۔ وہاں تقسیم کے بعد سے برابر پروپیگنڈہ کیا گیا کہ بنگالی زبان بولنے والے ایک قوم ہیں اور نہ بولنے والے دوسری قوم، حتیٰ کہ بڑھتے بڑھتے اس پروپیگنڈے نے مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کی دشمنی کا رنگ اختیار کر لیا، لیکن اسلام ایسی لسانی قومیت کا قطعی انکار کرتا ہے۔ یہ کُفر ہے۔ اسلام سے دشمنی اور جاہلیت کی طرف دعوت ہے"

مولانا نے چاروں صوبوں کے کارکنوں کو ہدایت کی کہ قومی سالمیت و یکجہتی کے خلاف جس وقت ایسی آواز کسی جگہ اُٹھائی جائے اسی وقت اس کی ڈٹ کر مخالفت کی جائے۔

مولانا نے بات جاری رکھتے ہوئے فرمایا۔

"یہ زمین خُدا کی ہے اور خُدا کی زمین پر خدا کا دین پورے کا پُورا قائم اور غالب کرنا ہر مُسلمان کی ذمہ داری ہے" انہوں نے کہا کہ ایک شخص کا ایک ہی دین ہو سکتا ہے۔ کسی کے دس دس دین نہیں ہو سکتے بلکہ اس دور کے جتنے بھی ازم ہیں خواہ وہ سوشلزم، کیپٹلزم یا کمیونزم یا کچُھ اور ہوں ان کے مقابلے میں اسلام کو غالب کرنا ہماری بنیادی ذمہ داری ہے۔ انہوں نے کارکنوں پر زور دیا کہ وہ لوگوں کو خُدا کی اطاعت کے سوا دوسروں کی اطاعت اور بندگی سے نکالیں اور انہیں اللہ کے دین کی طرف زیادہ سے زیادہ مؤثر طریقے سے دعوت دی جائے۔ ہماری ذمّہ داری ہے کہ ہم یہاں دین کو مکمل صُورت میں قائم کرنے کے لیئے اپنی تمام صلاحیتیں وقف کر دیں اور تمام خلافِ اسلام روایات اور قوانین کو مسلسل اور منظم جدوجہد کے ذریعے مٹا کر اللہ کے دین کو جاری و ساری کریں"۔

۲۶ مئی ۱۹۷۵ء

جناب الطاف گوہر صاحب نے اپنے زمانۂ نظر بندی میں مولانا محترم کی تفسیر تفہیم القرآن کا مطالعہ کیا اور حاصل مطالعہ کے طور پر "Translations from the Quran" کے نام سے انگریزی زبان میں ایک کتاب مرتب کی۔ چھپنے سے پہلے انہوں نے کتاب کا مسودہ مولانا محترم کی خدمت میں پیش کیا تاکہ وہ اسے ایک نظر دیکھ لیں۔ مولانا محترم نے اس میں کہیں کہیں اصلاحیں تجویز کیں۔ اس پر جناب الطاف گوہر نے مولانا محترم کو شکریہ کا خط لکھا۔ مولانا محترم نے خط کے جواب میں یہ وضاحت فرمائی کہ انہوں نے ان تبدیلیوں کی ضرورت کیوں محسوس کی۔ جناب الطاف گوہر کا انگریزی خط اور مولانا محترم کا اُردو میں جواب درج ذیل ہیں:۔

26 B National Highway
Defence Housing Society
Karachi

May 6, 1975

My Dear Maulana,

Assalamo Alaikum.

I am most grateful to you for going through "Translations from the Quran" with so much care and thoroughness. I know how extremely valuable your time is and it was, indeed most gracious of you to have found it possible to examine the text of the book. I have adopted the changes suggested by you with great respect and gratitute. Not in deference alone but because in every instance the change you have made is a distinct improvement.

With respectful regards,

Yours most sincerely
ALTAF GAUHAR

Syed Abul Ala Maududi
Zaildar Park Ichhra,
Lahore.

ابو الاعلیٰ مودودی
۵۔اے ذیلدار پارک۔اچھرہ
لاہور۔ (پاکستان)

محترمی ومکرمی السلام علیکم ورحمۃ اللہ

آپ کا عنایت نامہ مورخہ ۶ مئی ۱۹۷۵ء کو ملا۔ میں آپ کا بہت شکر گزار ہوں کہ میں نے آپ کی کتاب میں جو اصلاحات تجویز کی تھیں انہیں آپ نے پسند اور قبول فرمایا۔ یہ کتاب باہر کی دنیا کے اہلِ علم اور خصوصاً مستشرقین کے حلقوں میں بھی پہنچے گی۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ اس کے مضامین اور دلائل ہی نہیں بلکہ اس کی علمی شان بھی ان کے حلقوں کو متاثر کرے۔

خاکسار

ابو الاعلیٰ

۲۷ / مئی ۱۹۷۵ء

آج اُردن کے سفیر برائے پاکستان جناب ابراہیم القطان مولانائے محترم سے ملنے کے لئے تشریف لائے۔ کوئی گھنٹہ بھر ملاقات رہی ـــــ انہوں نے اُردن کے ولی عہد شاہ حسَن اور ان کی پاکستانی اہلیہ کا سلام پہنچایا اور ان کی طرف سے مزاج پُرسی کی۔ شاہ حسَن اور ان کی اہلیہ تفہیمُ القرآن کے ذریعے سے مولانا محترم سے متعارف ہوئے ہیں۔ تفہیمُ القرآن باقاعدہ ان کے زیرِ مطالعہ ہے۔

۳۰ / مئی ۱۹۷۵ء

سفید چینی (کھانڈ) کی بازار میں نایابی کی وجہ سے مولانا کئی روز سے دیسی شکّر (گڑ کی شکر) استعمال کر رہے ہیں کیونکہ دیسی کھانڈ (چینی) زیادہ ناقص آ رہی ہے۔

رات تین بجے مولانا کو اضطراب اور بے چینی سی ہوئی اور کچھ دیر بعد بڑی مقدار میں قے ہوئی۔ فرمانے لگے یہ غالباً دیسی شکّر ہی کا اثر ہے جس سے صفرا پیدا ہو گیا ہے ـــــ ایک حکیم صاحب نے جو مجلس میں موجود تھے۔ لیموں کے استعمال کا مشورہ دیا۔ مولانا نے فرمایا کہ لیموں مجھے بالکل موافق نہیں ہے۔ سرکہ بھی استعمال نہیں کرتا۔ ہاں کبھی کبھار سرکہ پیاز ڈال کر استعمال کر لیتا ہوں۔ انہوں نے لسی کے بارے میں کہا کہ یہ صفرا کو کاٹتی ہے۔ مولانا نے فرمایا کہ لسی بھی میرے مزاج کے موافق نہیں، البتہ شدید گرمی کے زمانے میں کبھی کبھار پی لیتا ہوں۔

حکیم صاحب نے کھیرا کھانے کی تجویز پیش کی تو مولانا نے فرمایا کہ میں

کھیرا ابھی نہیں کھا سکتا، البتہ ککڑی کھا لیتا ہوں۔ کھیرا نہایت ٹھنڈی تاثیر رکھتا ہے۔

آج بتایا کہ داد (اگزیما) کی تکلیف نہیں رہی۔

یکم جون ۱۹۷۵ء

فرمایا کہ ہفتہ بھر سے عجیب کیفیت ہے۔ بھوک لگتی ہے مگر جب کھانا کھانے بیٹھتا ہوں تو طبیعت کھانے پر بالکل آمادہ نہیں ہوتی بلکہ سر چکرانے لگتا ہے۔ زبردستی تھوڑا بہت کھا لیتا ہوں مگر کھانے میں کوئی مزہ نہیں آتا ——— کچھ عرصہ قبل بھی اس طرح کی کیفیت پیدا ہو گئی تھی ——— کھانے کے بعد آئس کریم کھانی شروع کر دی تھی جس سے وہ کیفیت درست ہو گئی، شاید اب پھر ایسا ہی کرنا پڑے گا۔

ایک صاحب نے سوال کیا کہ ایسا کیوں ہے؟ زیرِ لب فرمایا، غالباً اب رزق اُٹھایا جا رہا ہے۔

۶/جون ۱۹۷۵ء

آج جڑانوالہ سے تیس چالیس معززین کا ایک وفد مولانا محترم سے مُلاقات کے لیئے آیا۔ ۱۰/بجے صبح مولانا کی قیام گاہ پر کوئی ایک گھنٹہ ان سے بات چیت رہی اور مولانا نے ان کے سوالات کے جوابات دیئے۔

۱۵/جون ۱۹۷۵ء

۱۔ جماعتِ اسلامی آزاد کشمیر کا تیس پنتیس افراد پر مشتمل ایک وفد صبح دس بجے مولانا سے ملا۔ وفد کے قائد جماعتِ اسلامی آزاد کشمیر کے

امیر مولانا عبدالباری صاحب تھے۔

۲۔ متحدہ جمہوری محاذ کے قومی کنونشن میں آئے ہوئے چاروں صوبوں سے مختلف حضرات اور جماعتِ اسلامی کے کارکنان کے ساتھ بعد نمازِ عصر مولانا محترم کی نشست ہوئی۔ تقریباً پانچ سو افراد پر مشتمل اس منتخب نمائندہ اجتماع سے مولانا محترم نے پہلے مختصر خطاب فرمایا بعد میں سوالات کے جوابات دیئے۔

۱۷ر جون ۱۹۷۵ء

مجلس میں خواب کی تعبیر کا ذکر ہو رہا تھا۔ مولانا محترم نے فرمایا کہ انبیاء علیہم السّلام کے خوابوں کے سوا اور کسی کا خواب حجّت نہیں ہے۔

اس پر مولانا نے اپنا ایک واقعہ بیان فرمایا:۔

"حیدر آباد (دکن) میں ایک بڑے قابل وکیل تھے جو بعد میں جج بھی ہو گئے تھے۔ انہوں نے قادیانی مذہب اختیار کر لیا۔ میری ان سے رسم و راہ تھی۔ ایک روز میں نے ان سے قادیانی ہو جانے کا سبب پوچھا تو انہوں نے کہا کہ میں نے حضورؐ کو خواب میں دیکھا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ مرزا صاحب حضورؐ کی گود میں بیٹھے ہیں۔ اس کے بعد میں کیوں مرزا صاحب کو نبی نہ مانوں۔ اس پر ان سے بہت گفتگو ہوئی اور انہیں بہت سمجھایا کہ یہ محض شیطان کا فریب ہے۔ جس پر وہ خاموش ہو گئے، مگر قادیانیت سے تائب نہ ہوئے۔"

۱۸/ جون ۱۹۷۵ء

سوال تھا کہ تحریکِ اقامتِ دین کا خیال آپ کے ذہن میں کیسے آیا؟ مولانا نے فرمایا کہ دینی معلومات تو پہلے سے تھیں مگر رائج الوقت دینداری کے بارے میں بہت سی باتیں ذہن قبول نہیں کرتا تھا۔ چوں کہ بچپن میں عربی پڑھی تھی۔ اس لیے جب ذہنی شعور کچھ پختہ ہُوا تو خود براہِ راست قرآنِ کریم اور عربی تفاسیر کا مُطالعہ کیا جس سے آہستہ آہستہ دین کا تصوّر واضح اور پختہ ہوتا گیا۔

جو قرآنِ کریم والد مرحوم کے زیرِ تلاوت رہتا تھا وہ اب بھی میرے پاس موجود ہے۔ اس کے حاشیے پر والد مرحوم کے نوٹس بھی ہیں اور میں نے بھی بہت سے نوٹس اس پر لکھ رکھے ہیں۔"

ایک سوال تھا کہ زمانۂ طالبِ علمی میں آپ کوئی کھیل بھی کھیلتے تھے؟ فرمایا، جی ہاں فٹ بال، کرکٹ اور جمناسٹک کھیلا کرتا، مگر اب ان کے قواعد و ضوابط بھول چکا ہوں"۔

۲۵/ جون ۱۹۷۵ء

فرمایا کہ پہلے علم کلام کا نام "فقہ اکبر" تھا۔ اس موضوع پر اِسی نام سے سب سے پہلے امام ابُوحنیفہؒ نے مختصر رسالہ لکھا۔ بعد میں متکلمین نے اس فن میں بہت سے اضافے کیے اور مفصّل کتابیں لکھیں"

۲۶/ جون ۱۹۷۶ء

۱۔ توہینِ عدالت کے سلسلے میں ایک صاحب نے سوال کیا کہ اسلام میں اس کی کیا حیثیت ہے؟ فرمایا کہ عدالت کو یہ تحفظ حاصل ہونا چاہیئے

اور اسلام کی رو سے یہ جائز ہے؟"

—— بتایا گیا کہ ہندوستان میں جماعت اسلامی ہند نے اُردو کے علاوہ بھی ان زبانوں میں اسلامی لٹریچر مہیا کر دیا ہے جن زبانوں کو ہندو پڑھتے ہیں، مثلاً ہندی، مرہٹی، ٹامل، ملیالم وغیرہ۔ جس کے نتیجے میں پڑھے لکھے ہندو اسلام سے متاثر ہو رہے ہیں۔ ابھی پچھلے دنوں ایک برہمن ڈاکٹر مسلمان ہوئے ہیں۔

۲۔ آج (۵۔ اے ذیلدار پارک میں) مرکز کی اسٹاف میٹنگ میں نئے مرکز کا نام تجویز کرنے کا معاملہ زیرِ بحث آیا، چنانچہ بہت سے مجوزہ ناموں میں سے "منصورہ" پر اتفاق ہوگیا۔ آغازِ کار میں یہ نام راقم الحروف نے تجویز کیا تھا جس کی تائید محترم خلیل احمد حامدی صاحب نے فرمائی۔ میٹنگ کے بعد جملہ رفقائے مرکز محترم امیر جماعت میاں طفیل محمد صاحب کی معیت میں مولانا محترم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان کے سامنے یہ نام پیش کیا۔ مولانا محترم نے اسے پسند کیا اور اس کی توثیق فرما دی۔ بعد میں مٹھائی تقسیم کی گئی۔

۲۹/ جون ۱۹۷۵ء

مرکز اور مرکزی سٹاف آج منصورہ منتقل ہو گئے۔ پُرانے مرکز ۵۔ اے ذیلدار پارک میں مولانا محترم تنہا رہ گئے۔ (اس وقت سے مولانا کی رحلت تک راقمُ الحروف مولانا محترم کے پرائیویٹ سیکرٹری کی حیثیت سے ان کی خدمت میں رہا۔)

۳۰/ جون ۱۹۷۵ء

آج عصر کی کھلی نشست میں امیرِ جماعتِ اسلامی میاں طفیل محمد صاحب

اور نائب امیر مولانا جان محمد عباسی صاحب دوسرے حاضرین کے ساتھ فرشی نشست پر بیٹھے تھے۔ ایک صاحب نے جماعت کی پالیسی کے بارے میں سوال کیا تو مولانا محترم نے فرمایا کہ ایک طرف امیرِ جماعت بیٹھے ہیں اور دوسری طرف نائب امیر۔ انہی سے پوچھ لیجئے۔ میں تو ریٹائرڈ آدمی ہوں۔" نیز ازراہِ تفنن طبع فرمایا کہ بغیر پنشن کے ریٹائر ہُوا ہوں۔"

مولانا جان محمد عباسی صاحب تو اکثر عام حاضرین میں آکر بیٹھ جایا کرتے ہیں البتہ میاں صاحب کبھی کبھار کچھ دیر کے لئے اگر مجلس میں آتے ہیں تو ان کے لئے دوسری کرسی رکھ دی جاتی ہے، لیکن آج وہ بھی چٹائی پر بیٹھ گئے۔ اس وقت نائب امیر بھی موجود تھے۔ اس طرح مولانا کی آج کی محفل میں قِران السعدین ہوگیا۔۔۔۔ آج گفتگو زیادہ تر سیاسی حالات پر رہی۔

یکم جولائی ۱۹۷۵ء

آج ۸، ۱۰ سال کے ایک بچے نے ننھا سا سوال کیا کہ مولانا صاحب کیا والدین کو اپنے بچوں کو مارنے کا حق ہے؟

مولانا نے مسکراتے ہوئے فرمایا، جس حد تک بچے سیدھے ہو جائیں، شرارتوں سے باز آجائیں اور پڑھنے سے جی نہ چرائیں۔ اس حد تک والدین کو یہ حق ہے۔ اس سوال و جواب سے حاضرین بہت محظوظ ہوئے۔

۲ جولائی ۱۹۷۵ء

۔۔۔۔ کشف کے بارے میں ایک سوال کے جواب میں فرمایا

کہ عام طور پر آدمی کسی چیز کے بارے میں جو جو تصور اپنے ذہن میں قائم کر لیتا ہے وہی متشکل ہو کر خواب میں یا کشف میں سامنے آجاتا ہے ـــــ بیعت کے بعد آدمی اپنے مُرشد کے بارے میں عقیدت و محبت کے غلو میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ پھر وہ اپنے مُرشد کے بارے میں یہ بات ماننے کے لیئے آمادہ نہیں ہوتا کہ اس سے بھی کسی غلطی کا صدور ہو سکتا ہے اور پھر کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ ؎

بہ مے سجادہ رنگین کن گرت پیر مغاں گوید۔

اس سلسلے میں مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کی شاید واحد مثال ایسی ہے کہ انہوں نے ایک شرعی مسئلے میں حضرت حاجی امداد اللہؒ سے عرض کیا تھا کہ ہم آپ کے پاس رُوحانی فیض کے لیئے حاضر ہوتے ہیں جہاں تک علمِ شریعت کا تعلق ہے وہ ہم آپ سے زیادہ جانتے ہیں۔"

دُعا و تسبیحات کے متعلق ایک سوال کے جواب میں فرمایا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے تین بار، ۳۳ بار اور زیادہ سے زیادہ ایک سو بار تک اذکار یا دُعاؤں کا پڑھنا ثابت ہے۔ آدمی سوچ سمجھ کر کوئی تسبیح یا ذکر چند بار کرے تو وہ بے سمجھے بوجھے کے ہزار بار سے بہتر ہے۔ عبدیت کا شعور تو سمجھ کر پڑھنے ہی سے پیدا ہوتا ہے۔"

۱۹ جولائی ۱۹۷۵ء

مولانا نے فرمایا:۔

ایوب خاں اور محترمہ فاطمہ جناح کے صدارتی انتخاب کا سوال سامنے آیا تو ہم نے اس مرحلے پر یہ واضح کر دیا تھا کہ ہم محترمہ فاطمہ جناح کے حق میں کیوں رائے دے رہے ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ کوئی پسندیدہ شکل نہیں تھی۔ لیکن ملک کو ایک بڑی تباہی سے بچانے کے لیئے ہم یہ

صُورت اختیار کرنے پر مجبور تھے ـــــــ ان دنوں ایک موقع پر خود محترمہ نے مجھُ سے کہا کہ آپ میرے صدارتی اُمیدوار ہونے کو ایک ناگزیر بُرائی قرار دیتے ہیں ـــــــ میں نے ان سے کہا کہ یہ بات آپ کو ناگوار نہ ہو۔ ہمارے نزدیک اس انتخاب کی اصل حیثیت یہی ہے۔ بہرحال مقابل میں جو بُرائی ہے ہم ملک کو اس سے بچانا چاہتے ہیں"

۲۳ ؍جولائی ۱۹۷۵ء

ایک صاحب کتّے کے کاٹے کا دَم کرانے کے لئے تو اس موضوع پر بات چھڑ گئی۔ مولانا محترم نے فرمایا کہ یہ خاندانی چیز ہے جو اللہ تعالیٰ کی عطا ہے۔ ہمارے خاندان کا کوئی مرد باولے کتّے کے کاٹنے سے ہونے والے زخم پر پانی سے کلی کر دے تو وہ زخم درست ہو جاتا ہے۔ یہ کام باؤلے پن کے دَورے یعنی ہَلک اُٹھنے سے پہلے پہلے کیا جاتا ہے؛ البتہ ایک موقع پر والدِ محترم نے ایک ہندو برہمن پر ہَلک اُٹھنے کے بعد بھی ایسا کیا تھا اور وہ ٹھیک ہو گیا تھا۔ اس رات والد صاحب رات بھر سوئے نہیں تھے اور اللہ تعالیٰ سے دُعا کرتے رہے تھے کہ اے اللہ میں نے تیرے بھروسے پر خاندانی روایت کے خلاف یہ عمل کیا ہے، تو اسے درست فرما دے۔

اس سلسلے میں ہمیں گرُدہ کھانے سے پرہیز بھی ہے۔ اسلئے ہمارے خاندان میں گرُدے نہیں کھائے جاتے"

۲۹ ؍جولائی ۱۹۷۵ء

آج کی مجلس بڑی دلچسپ رہی۔ سیلون (سری لنکا) کے ایک صاحب شریکِ مجلس تھے۔ انگریزی میں انہوں نے بہت سے سوالات

پوچھ ڈالے۔ مولانا محترم نے ان کے جوابات بھی انگریزی میں دیئے۔ انگریزی سوال و جواب کے بعد ایک صاحب نے جو عرب طالب علم تھے، عربی میں چند سوالات پوچھے۔ انہیں عربی میں جواب دیا گیا۔ اس سے پہلے اُردو میں گفتگو ہو رہی تھی۔ اس طرح آج کی مجلس میں تین زبانیں ذریعہ اظہار کے طور پر استعمال کی گئیں۔

-●-

یکم اگست ۱۹۷۵ء

جامعہ سلفیہ لائل پور (اب فیصل آباد) کے طلبہ کا سات رُکنی وفد مُلاقات کے لیئے آیا۔ ارکانِ وفد نے مدارس کے نصاب اور ماحول کے بارے میں چند سوالات کیئے جن کے جواب مولانا نے دیے۔

آج کی مجلس میں ایک خاص چیز دیکھنے میں آئی۔ ایک پٹھان نے جو پشتو لہجے میں ٹوٹی پھوٹی اُردو بول رہا تھا۔ مولانا سے علیحدگی میں بات کرنے کا تقاضا کیا۔ اسے سمجھایا گیا کہ جو بات کرنی ہے یہیں کر لو، مگر وہ نہ مانا۔ بالآخر حاضرینِ مجلس نے رضاکارانہ طور پر کہا کہ ہم تھوڑی دیر کے لیئے اُٹھ جاتے ہیں۔ مولانا اس کی بات سُن لیں، چنانچہ ۲۵، ۳۰ آدمی دس پندرہ منٹ کے لیئے منتشر ہو گئے۔ جب خاں صاحب نے اپنی بات مکمل کر لی تب سب لوگ دوبارہ مولانا کے گرد حسبِ سابق جمع ہو گئے۔ وہ صاحب سلام کر کے خوشی خوشی چلے گئے۔

۳ر اگست ۱۹۷۵ء

چند نوجوان طلبہ مجلس میں موجود تھے جو غالباً پہلی بار آئے تھے۔ ٹی۔وی انٹینا کی طرف اشارہ کر کے ایک نوجوان نے سوال کیا کہ موجودہ ٹی۔وی کے بعض پروگرام تو نہایت درجہ فحش اور بد اخلاقی اور جرائم کو فروغ دینے والے ہوتے ہیں، کیا ان کا دیکھنا جائز ہے؟

مولانا محترم نے فرمایا کہ جو پروگرام آج کل دکھائے جا رہے ہیں ان کا دیکھنا ہرگز جائز نہیں ہے۔ ہمارے ہاں اصلاحی اور تربیتی پروگرام تو غالباً بالکل ہی نہیں دکھائے جاتے۔ ہم تو امریکہ سے بھی آگے نکل

گئے ہیں۔ وہاں بھی بہت سے پروگرام قومی سطح پر تربیتی، معلوماتی اور اصلاحی ہوتے ہیں۔"

پھر فرمایا" میرا انداز تبلیغ جارحانہ کے بجائے ہمدردانہ اور خیرخواہانہ ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ میرے بچے ایسے گندے پروگرام از خود اپنے اندرونی جذبہ سے ترک کریں ورنہ میں اگر بند کردوں گا تو وہ اپنے عزیزوں اور دوستوں کے ہاں دیکھ آئیں گے اور مجھے گھر میں اپنے راستے میں ایک رکاوٹ سمجھیں گے۔ میں اپنے بچوں سے یہی کہتا ہوں کہ دیکھو نماز پڑھو تو خُدا کی پڑھو۔ میری نماز کبھی نہ پڑھنا"
(یعنی جو نماز میرے ڈر سے پڑھی جائے گی وہ خُدا کی نہ ہوگی)

۱۵ر اگست ۱۹۷۵ء

آج بنگلہ دیش کے پہلے صدر شیخ مجیبُ الرحمٰن کی حکومت کا تختہ اُلٹ دیا گیا۔ شیخ مجیبُ الرحمٰن کو اس کے بعض ساتھیوں اور اہلِ خانہ سمیت گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا۔

نئے صدر خوندکر مشتاق احمد نے، جو مجیب حکومت میں مختلف وزارتوں اور عہدوں پر فائز رہنے کے بعد آج کل وزیرِ تجارت تھے، پہلا کام یہ کیا کہ بنگلہ دیش کا غیر اسلامی لادینی دستوری نام بدل کر اسلامی جمہوریہ بنگلہ دیش رکھ دیا۔

—— آج امیر جماعت محترم میاں طفیل محمد صاحب نئے مرکز کی قیام گاہ میں منتقل ہوئے۔ مرکزی اسٹاف پہلے منتقل ہو چکا تھا۔ نمازِ جمعہ سے قبل اجتماعی کھانے کا پروگرام تھا جس کا اہتمام مرکزی اسٹاف نے مشترکہ طور پر کیا۔ صاحبزادہ محمد ابراہیم صاحب کے ہاں کھانا تیار ہوا اور انہی کے ہاں کھایا گیا۔

محترم امیر جماعت کے حکم سے راقم الحروف نے جمعہ کا خطاب کیا اور نماز پڑھائی۔

۲۴/ اگست ۱۹۷۵ء

مولانا محترم نے فرمایا:۔

"میری عادت ہے کہ نمازِ عصر کے بعد چائے کی ایک پیالی پیتا ہوں۔ یہ عادت اس حد تک ہے کہ اگر نمازِ عصر سے پہلے چائے پینے کا اتفاق ہو جائے تو نماز کے بعد پھر ایک کپ پیتا ہوں ——— صبح ناشتے کے بعد سے دوپہر کے کھانے تک، جو ڈیڑھ بجے کھاتا ہوں، درمیان میں کچھ نہیں کھاتا پیتا۔ اس دوران میں چائے نہیں پیتا۔ اِلّا یہ کہ کوئی مہمان ہوں اور ان کے ساتھ چائے پینی پڑے۔ ایک وقت میں چائے کا ایک ہی کپ پیتا ہوں۔ ہاں البتہ پیاس لگنے پر ٹھنڈا پیتا ہوں۔"

۲۵/ اگست ۱۹۷۵ء

ایک سوال کے جواب میں فرمایا کہ تفہیم القرآن میں جتنے نقشے ہیں وہ میں نے خود بنائے ہیں اور عمارات اور مقامات وغیرہ کے فوٹو چودھری غلام محمد صاحب مرحوم کے تیار کردہ ہیں۔ سفر ارض القرآن میں چودھری صاحب مرحوم ساتھ تھے۔

انجیل برناباس کا ذکر آیا تو فرمایا کہ اسے عیسائیوں نے غائب کر دیا ہے۔ لندن کی ایک لائبریری میں اس کا ایک نسخہ موجود ہے جو کسی کو وہاں بیٹھ کر پڑھنے کے لئے بھی نہیں دیا جاتا۔ ہمارے ایک دوست جو وہاں کسی لائبریری میں لائبریرین ہیں، انہوں نے وہ نسخہ عاریتہً

حاصل کیا اور پورے نسخے کا فوٹوسٹیٹ بنوالیا۔ یہ فوٹوسٹیٹ میرے پاس موجود ہے۔ یہ نسخہ (ITALINN) زبان میں ہے اور اس کے ساتھ اس کا انگلش ترجمہ ہے جو ۱۹۰۶ء میں آکسفورڈ پریس میں شائع ہوا تھا۔

اس انجیل میں عیسائیت کے ان تمام عقائد کا، جو سینٹ پال نے رائج کئے تھے، رَد موجود ہے۔ نیز برنا باس خود لکھتا ہے کہ رفعِ مسیحؑ کے وقت وہ خود موقع پر موجود تھا۔

موجودہ انجیلیں اس زبان میں نہیں جو حضرت عیسٰی علیہ السّلام کی زبان تھی (یعنی آرامی) بلکہ چاروں انجیلیں اصل گریک (GREEC) میں ہیں۔ باقی انہی کے تراجم ہیں ـــــ پہاڑی کا وعظ ہر انجیل میں مختلف ہے۔

ـــــ الیجاہ محمد کا جانشین اس کا بیٹا ویلس محمد مصر کا پڑھا ہُوا ہے اور صحیح اِسلامی تعلیمات سے واقف اور متاثر ہے ـــــ الیجاہ نبوت کا مدعی تھا۔"

۷ر اکتوبر ۱۹۷۵ء

جماعتِ اسلامی کے نئے مرکزِ جماعت منصُورہ میں مولانا محترم نے عیدُالفطر کے اجتماع سے خطاب فرمایا۔ منصُورہ میں یہ پہلی عیدُالفطر تھی۔ نمازِ عید جناب خلیل احمد حامدی صاحب نے پڑھائی۔ شہر سے اتنی دُور خلافِ توقع عید کا یہ خاصا بڑا اجتماع تھا، چنانچہ نمازِ عید کے لئے جو انتظامات کیئے گئے وہ ناکافی ثابت ہوئے۔

۱۲ر اکتوبر ۱۹۷۵ء

مولانا محترم نے آج نئے مرکزِ جماعت منصُورہ میں عشیدِ ملن

پارٹی سے خطاب فرمایا۔ بعد میں مرکزی دفاتر کی عمارت پر پرچم کشائی کی۔

۲۰/ اکتوبر ۱۹۷۵ء

منصورہ میں ہونے والی اسلامی جمعیت طلبہ کی ۲۳ ویں سالانہ کانفرنس سے مولانا محترم نے خطاب فرمایا۔

(یہ تقریر ترجمانُ القرآن کی اشاعت دسمبر ۱۹۷۵ء میں شائع ہو چکی ہے۔ بعد میں کتابچے کی صُورت میں شائع کی گئی جو "دَورِ نو کا چیلنج اور نوجوان" کے نام سے دستیاب ہے۔)

۲۲/ اکتوبر ۱۹۷۵ء

پنجاب یونیورسٹی سٹوڈنٹ یونین کے زیر اہتمام یونیورسٹی آڈیٹوریم (فیصل آڈیٹوریم) میں "سیرت کا پیغام" کے موضوع پر مولانا محترم نے تقریباً پون گھنٹہ خطاب فرمایا۔

(یہ خطاب پمفلٹ کی صُورت میں شائع ہو چکا ہے۔ اور کیسٹ کی صُورت میں بھی دستیاب ہے۔)

یونیورسٹی سٹوڈنٹ یونین کے صدر عبدالشکور صاحب نے مولانا کا شکریہ اُدا کیا اور حاضرین سے کہا کہ مولانا محترم کی یونیورسٹی میں تقریر کا اہتمام کرکے انھوں نے ایک وعدہ پُورا کر دیا ہے۔ مولانا کے استقبال پر نوجوانوں کا جوش دیدنی تھا۔ وائس چانسلر شیخ امتیاز علی صاحب نے مولانا کا استقبال کیا۔

—

۱۰ر نومبر ۱۹۷۵ء

مولانا محترم نے آج پاکستان کے وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو سے مُلاقات کی جو گورنر ہاؤس لاہور میں ہوئی اور تقریباً پون گھنٹہ جاری رہی۔ یہ مُلاقات خود وزیراعظم کی خواہش پر ہوئی تھی۔

۱۱ر نومبر ۱۹۷۵ء

آج لاہور کے ایک ہفت روزہ جریدے کو مولانا محترم نے انٹرویو دیا جس کا خلاصہ درج ذیل ہے :-

"اسلام ایک مکمل ترین ضابطۂ حیات ہے۔ اسے مختلف حصّوں میں تقسیم نہیں کیا جاسکتا۔ صرف اسلامی قوانین کے نفاذ کا نام اسلامی نظام کا نفاذ نہیں ہے، بلکہ زندگی کی اس پوری اسکیم کو نافذ کرنا ضروری ہے جو اسلام نے ہمیں دی ہے، اور قانون اس اسکیم کا ایک حصّہ ہے۔ جو مجموعے سے الگ کر کے نافذ کر دیا جائے تو یہ اسلامی نظام کا نفاذ نہ ہوگا، اگر ہم زندگی کے پورے نظام کو اسی طرح جاہلیت کی راہ پر چلنے دیں جس طرح وہ چل رہا ہے اور صرف اسلامی قانون کو عدالتوں کے ذریعے سے نافذ کر دیں تو اس کے وہ نتائج نہیں ہو سکتے۔ جو اسلام کو مطلوب ہیں۔ اس کی مثال کچھ ایسی ہے جیسے چولہے میں آگ جل رہی ہو۔ ہنڈیا چولہے پر رکھی ہو، اور ہم برف رکھ کر اسے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کریں۔ ٹھنڈی تو وہ تب ہو جب آگ اس کے نیچے سے نکال دی جائے ــــــ معاشرے میں برائیوں کے اسباب جوں کے توں رہیں اور ہم صرف قانون کے ذریعہ سے اصلاح کی کوشش کریں تو آخر اصلاح کیسے ہو جائے گی۔

ایک سہانی صبح یا کسی تابناک رات کو اسلامی قانون کے نفاذ کا اعلان کیا جاسکتا ہے مگر اس پر عملدرآمد کرنے

والی مشینری تو وہی ہوگی۔ جو اب تک کفر کا قانون نافذ کرتی رہی ہے، اور وہ لوگ بھی وہی ہوں گے جن کی عظیم اکثریت کو مدّت دراز کے غیر اسلامی اقتدار نے بگاڑ رکھا ہے۔ صرف ایک اعلان سے تو ان کے سینے ایمان کے نور سے اور ان کے ذہن اسلام کے علم سے، اور ان کی عادات و خصائل اسلامی اخلاق سے مزین نہیں کیے جا سکتے۔

برصغیر ہند میں جب انگریز آئے تو یہاں اسلامی تعلیم رائج تھی۔ مسلمانوں کی اپنی تہذیب قائم تھی، ان کا اپنا تمدن موجود تھا، ان کی اپنی روایات باقی تھیں، ان کی اخلاقی اقدار محفوظ تھیں۔ اور ملک میں اسلامی قانون نافذ تھا۔ اب دیکھیے کہ انگریزی اقتدار نے اس صورت حال کو کس طرح بدلا۔ اس نے صرف اتنا ہی نہیں کیا کہ ہمارے قانون کو منسوخ کر کے اپنا قانون جاری کیا۔ بلکہ اس نے ہر طرف سے ہمارے نظام زندگی پر حملہ کیا اور ہر پہلو سے ہمارا گھیراؤ کیا۔ اس نے ہمارے نظام تعلیم کی جگہ اپنا نظام تعلیم رائج کر کے اسی کو رزق اور ترقی کا ذریعہ بنا دیا۔ ہماری زبان پر اپنی زبان کو غالب کر دیا۔ ہماری تہذیب اور ہمارے تمدن کو حقیر بنا کر اپنی تہذیب اور اپنے تمدن کو عظمت و وقار کے مقام پر فائز کیا۔ ہمیں پیٹ کی مار دے کر ہماری گردن اقتدار کے آگے جھکائی اور ہمیں ضمیر، ایمان، غیرت، غرض اپنا سب کچھ بیچ ڈالنے کا خوگر بنا دیا۔ اپنے نظام معیشت کو ہم پر مسلّط کر کے کسب حلال کے راستے تنگ اور حرام خوری کے سارے راستے کھول دیئے۔ اپنے سیاسی نظام کو رائج

کر کے ہمارے تصورِ حکومت کو اس طرح فنا کیا کہ ہم یہ سوچنے
کے قابل ہی نہ رہے کہ ہمارا بھی کوئی سیاسی نظام ہے۔
قانون کی تبدیلی کے ساتھ یہ تمام تغیرات جب بُرپا ہوئے تو
انگریز کو کبھی یہ کہنے کی ضرورت پیش نہیں آئی کہ اپنا دین
بدلو، اپنے عقائد بدلو، اپنے افکار و نظریات بدلو، اپنی
اخلاقی اقدار بدلو، اپنی تہذیب بدلو۔ یہ سب کچھ ہم خود ہی
بدلتے چلے گئے۔ ہمارے ایمان و اخلاق کی جڑیں غیر محسوس
طریقے سے کھوکھلی ہوتی چلی گئیں۔ ہمارے لیے ہر حرام
حلال ہوتا چلا گیا اور حلال کی طرف ہماری رغبت مفقود ہوتی
چلی گئی۔ انگریز کے افکار و نظریات ہمارے ذہنوں پر مسلط
ہو گئے، اس کی زبان، اس کا لباس، اس کی تہذیب، اس
کے طرزِ زندگی کو ہم نے فخر کیساتھ قبول کر لیا اور ہم میں وہ
تمام فواحش وَباء کی طرح پھیل گئے جو انگریزی تہذیب کی
خصوصیات میں شامل تھے، مگر اس سے اندازہ کیا جاسکتا
ہے کہ ایک قوم بدلتی ہے تو کیسے بدلتی ہے۔

اب ذرا دیکھیے۔ انگریز کے رُخصت ہو جانے کے
بعد آزادی کے پہلے لمحے سے لے کر آج تک ہم نے آخر
ان چیزوں میں سے کس چیز کو تبدیل کیا ہے؟ تبدیل کرنا تو
درکنار ہم اسی راستے پر آگے ہی آگے بڑھتے چلے گئے
ہیں جس پر انگریز ہمیں ڈال گیا تھا۔ تعلیم وہی ہے. بلکہ
پہلے سے بدتر نتائج دکھا رہی ہے اور ہماری درس گاہوں
پر ایسے اُستادوں کی ایک کھیپ مسلط ہے جو نئی نسلوں
کو بے دین اور بدکردار بنانے پر تُلے ہوئے ہیں۔ اس

شراب کو، ہمارے ہاں مخلوط تعلیم کی روز افزوں ترویج دو آتشہ بنا رہی ہے۔ معاشی اور سیاسی نظام بھی ہمارے ہاں وہی ہے جو پہلے تھا، بلکہ اس کی خرابیوں میں بھی ہم پہلے سے زیادہ اُلجھتے چلے جا رہے ہیں اور اس گاڑی کے چلانے والے ذہن اس راہ سے ہٹ کر کسی دوسرے نظام کو ممکن تصور کرنے کے لئے بمشکل ہی تیار ہوتے ہیں۔ زبان اور تہذیب و تمدّن اور طرزِ زندگی پر آج بھی انگریزیت چھائی ہوئی ہے، بلکہ خود انگریز کے دورِ حکومت میں وہ اتنی نہ چھائی تھی۔ اس پر مزید عام وہ اخلاقی بگاڑ ہے۔ جو ہماری زندگی کے ہر گوشے میں پہلے سے بہت زیادہ پھیل چکا ہے اور پھیلتا چلا جا رہا ہے۔ ہماری انتظامیہ کی عظیم اکثریت رشوت، خیانت اور فرائض سے غفلت میں مبتلا ہے۔ ہمارے کاروباری طبقوں میں کم ہی ایسے ہیں جو حرام طریقوں سے دولت کمانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے دیتے ہوں۔ ہمارے وسائل نشر و اشاعت اور ذرائع ابلاغ بڑے پیمانے پر لوگوں میں فواحش، جرائم اور بدکرداری پھیلانے میں لگے ہوئے ہیں اور ہمارے معاشرے میں، نظام معیشت و سیاست میں اور ملکی نظم و نسق میں ان بُرائیوں کے محرکات اور مواقع زیادہ سے زیادہ بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ اگر حالات جُوں کے تُوں باقی رہیں تو کیا یہ ممکن ہے کہ ہم صرف اسلامی قوانین کو نافذ کر کے وہ مقصد حاصل کر سکیں جس کے لئے اسلام نے یہ قوانین

ہم کو دیے ہیں؟ بلکہ ان حالات کے باقی رہتے ہوئے
کیا اِسلامی قانون صحیح طور پر نافذ بھی ہو سکتا ہے؟ شریعت
کا فوجداری قانون تو ایک دن میں جاری کیا جا سکتا ہے،
مگر اس کے تحت مجرموں کو پکڑے گا کون؛ کیا یہی پولیس
جو انصاف کی دُشمن، مجرموں کی پُشت پناہ اور بے گناہوں
پر ظلم کرنے میں حد درجہ بے باک ہے؟ پھر عدالتوں کو وہ
شہادتیں کہاں سے ملیں گی جن سے کسی شخص کے مجرم یا
بے گناہ ہونے کا فیصلہ انہیں کرنا ہوگا۔ کیا وہ اس معاشرے
سے بہم پہنچیں گی جس میں جھوٹے گواہوں کی کوئی کمی
نہیں ہے؟ اس سے بھی بڑھ کر اہم سوال یہ ہے کہ اِسلام کا
منشا کیا اس طرح پُورا ہو سکتا ہے کہ ملک کا معاشی نظام
یہی رہے جو ڈاکے اور چوری کے محرکات سے لبریز ہے،
ملک میں قانون کو نافذ کرنے کی مشینری بھی یہی رہے جو
ان جرائم کے لیے پُورے مواقع فراہم کرتی ہے، اور ان
حالات میں جو لوگ ڈاکہ ڈالیں یا چوری کریں عدالتیں انہیں
شرعی سزائیں دے ڈالیں؟ نیز کیا اِسلام یہی چاہتا ہے
کہ فواحش کی اشاعت اسی طرح جاری رہے، ہیجان انگیز
فلم، تصویریں، لٹریچر اسی طرح سفلی جذبات کو اُکساتے رہیں،
بَنی سَنوری عورتیں اسی طرح برسرِ عام پھرتی رہیں، کالجوں،
کلبوں اور دوسرے بہت سے مقامات پر اختلاط مرد و
زن اسی طرح جاری رہے، اور ان حالات میں جو شخص زنا
کا ارتکاب کرے اس کی پیٹھ پر قانون کوڑے برسا دے!
اگر ان سوالات کا جواب نفی میں ہے، اور لازماً نفی ہی

میں ہونا چاہیئے تو پھر تسلیم کیے بغیر چارہ نہ رہے گا کہ اِسلام صرف اپنے قانون ہی کا نفاذ نہیں چاہتا بلکہ اپنی اس پوری سکیم کا نفاذ چاہتا ہے جو اس نے نظامِ زندگی کے لیے ہمیں دی ہے اور زندگی کے اس پورے ہنجار کی تبدیلی چاہتا ہے جو اس وقت ہمارے ملک میں پایا جاتا ہے۔

دراصل میں جو بات کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ اِسلامی قانون کے نفاذ، اور اِسلامی نظامِ زندگی کی ہمہ گیر اور ہمہ جہت تبدیلی کا کام ایک ساتھ کیا جائے۔ جس طرح انگریز نے ہر طرف سے ہمارے نظامِ حیات پر حملہ کرکے اور ہر پہلو سے اس کو گھیر کر اپنے سانچے میں اسے ڈھالا تھا اسی طرح اب ہمیں اس کی چھوڑی ہوئی پوری میراث پر ہر جہت سے حملہ کرنا چاہیئے اور ہر شعبۂ حیات میں اس کا قلع قمع کرکے اِسلام کے پورے نظام کو عملاً قائم کرنا چاہیئے۔ اس مقصد کے لیے قانون کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ جو اقدامات کرنے ضروری ہیں انہیں میں مختصراً بیان کرتا ہوں :-

۱۔ نظامِ تعلیم کو یکسر تبدیل کیا جائے اور علوم وفنون کے ہر شعبہ کا نصاب اسلامی نقطۂ نظر کے مطابق ترتیب دیا جائے۔ کوئی نظریاتی مملکت اپنی درسگاہوں میں نرسری سے لے کر اعلیٰ تعلیم تک کسی مرحلے اور کسی گوشے میں اپنے نظریے سے مختلف کسی علم یا فن یا ذہنی تربیت کے کسی طریقے کا دخل گوارا نہیں کرتی۔ مثال کے طور پر چین،

روس، اور دوسرے اشتراکی ممالک کے نظامِ تعلیم کو دیکھ لیا جائے۔ مغربی ممالک میں بھی کہیں ایسا نظامِ تعلیم نہیں پایا جاتا جو ان کی نسلوں کو ان کے بنیادی نظریات اور اصولوں سے منحرف کر دینے والا ہو۔

۲۔ درس گاہوں کے لیئے اُستادوں کے انتخاب میں سب سے مقدم یہ بات ہونی چاہیے کہ ہر اُستاد اسلام کا علم رکھتا ہو، اِسلامی نظریہ میں پختہ ہو اور عملاً بھی اِسلامی احکام کا پابند اور اسلامی اخلاق سے متصف ہو۔ ہماری کسی درسگاہ میں کسی ایسے اُستاد کا وجود گوارا نہ کیا جائے جو اِسلام کے خلاف نظریات رکھتا ہو اور اخلاقی حیثیت سے بھی اس کا کردار درست نہ ہو۔ کوئی صاحبِ عقل و دانش قوم دُنیا میں ایسی نہیں ہے جو اپنی اولاد کو دُشمن کے حوالے کر دیتی ہو تاکہ وہ ان کی لوحِ سادہ پر جو نقش چاہیں ثبت کر دیں، خواہ وہ اس کی موت کا پروانہ ہی کیوں نہ ہو۔

۳۔ مخلوط تعلیم غیر مُسلموں کی نگاہ میں خواہ کتنی ہی قابلِ قبول یا پسندیدہ ہو، اِسلام کے نقطۂ نظر سے وہ معاشرے کے لیے قطعی تباہ کُن ہے اور کوئی شخص جو ادنیٰ سی بھی اِسلامی حِس رکھتا ہو، ان نتائج کے لیئے ہرگز تیار نہیں ہو سکتا جو اس سے برآمد ہوتے ہیں، اور عملاً برآمد ہو رہے ہیں۔ جو لوگ اس کی حمایت کرنے والے ہوں وہ اسلام پر بڑا کرم کریں گے اگر یہ زہر ہلاہل مسلمانوں کی اولاد کو پلانے کے ساتھ اِسلامی قانون نافذ کرنے کے پاکیزہ عزائم کا اظہار

چھوڑ دیں۔ پاکستان کو اگر اسلامی مملکت بننا ہے تو یہاں لڑکیوں کی تعلیم کے لئے لازمًا الگ درسگاہیں اور یونیورسٹیاں بھی قائم ہونی چاہئیں۔

۴۔ لاء کالجوں کی تعلیم میں بلاتاخیر عربی زبان، قرآن، حدیث اور فقہ کی تعلیم کا پورا انتظام کیا جائے اور ہمارے قانون دانوں کو تقویٰ کی تربیت بھی دی جائے تاکہ آئندہ ہماری عدالتوں کو موزوں قاضی اور وکیل بہم پہنچ سکیں۔

۵۔ تمام ان اداروں میں جو ہمارے ہاں مختلف سرکاری ملازمتوں کی ٹریننگ کے لئے قائم ہیں اسلامی تعلیم اور اخلاقی تربیت کا انتظام کیا جائے تاکہ حکومت کو صرف کاردان ملازم ہی نہیں بلکہ ایسے ملازم مل سکیں جو ایماندار، خداترس، فرض شناس اور دین کا علم رکھنے والے بھی ہوں۔

۶۔ اس وقت جو لوگ سرکاری ملازمت میں ہیں انکے کردار کی چھان بین کی جائے۔ جو لوگ ناقابلِ علاج بدنیت ہیں ان کو رخصت کرکے اچھے کردار رکھنے والے نوجوانوں کو ملازمت میں لے لیا جائے اور باقی لوگوں کے لئے ہر مقررہ مدت کے بعد ایسے ریفریشر کورس جاری کئے جائیں جن میں ان کو اسلامی تعلیم و تربیت دی جائے۔

۷۔ تفتیشِ جرائم کے شعبے کو چھوڑ کر سی آئی ڈی کا پورا محکمہ پولیس سے الگ کر لیا جائے اور اسے اس کام پر مقرر کیا جائے کہ وہ تمام سرکاری محکموں، افسروں اور ملازموں کے طرزِ عمل کی نگرانی کرے اور حکومت کو ہر قسم کی بدعنوانیوں

کے بارے میں صحیح اطلاعات بہم پہنچائے۔ اس کے ساتھ حکومت کی دوسری انٹیلی جنس ایجنسیاں بھی اسی نگرانی کیلئے استعمال کی جائیں تاکہ خبر رسانی کا کوئی ایک ذریعہ حکومت کو غلط خبریں نہ دے سکے۔

۸۔ خلافِ اسلام نظریات اور فواحش اور جرائم کی اشاعت جن جن ذرائع سے بھی ہو رہی ہے ان کا سدباب کیا جائے۔ کوئی نظریاتی مملکت اس بات کو برداشت نہیں کر سکتی کہ اس کے بنیادی نظریے اور اس کے اخلاقی اصولوں کے خلاف کسی قسم کا پرچار کیا جائے۔ اس میں اگر کوئی استثنا ہو سکتا ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ دوسرے مذاہب کے لوگ اپنے مذہب کی تعلیمات پر مشتمل کتابیں اور رسائل و جرائد شائع کرنے کے لیئے آزاد ہوں۔

۹۔ تمام ذرائع نشر و اشاعت اور ذرائع ابلاغ ایک ایسی ہمہ گیر مہم کے لیئے استعمال کیئے جائیں جو عوام کو اسلامی عقائد اور احکام سے آگاہ کرے، ان میں خدا کا خوف اور آخرت کی جوابدہی کا احساس پیدا کرے، اور ان کے اندر صالح اخلاق کی طرف رغبت اور برائیوں سے نفرت پیدا کرے، اور نہایت معقول اور مؤثر طریقوں سے لوگوں کو سمجھائے کہ زندگی میں خدا اور رسول کے احکام سے تجاوز کرنا اور اخلاقی حدود کو توڑنا انسان کو دنیا اور آخرت میں کیسے برے نتائج سے دوچار کرتا ہے۔

۱۰۔ ملک کے معاشی نظام میں اسلامی احکام کیمطابق ایسی تبدیلیاں لائی جائیں جن سے دولت کی تقسیم منصفانہ ہو،

دولت کمانے اور صرف کرنے کے حرام طریقے بند ہوں، رزقِ حلال حاصل کرنے کے مواقع عام لوگوں کے لئے کھلے ہوں، کوئی شخص زندگی کی بنیادی ضرورت سے محروم نہ رہے، اور ناجائز و ناپاک ذرائع سے جو لوگ قارون بن گئے ہیں ان کی دولت قانون کے ذریعہ سے واپس لی جائے۔"

-●-

۱۶ / نومبر ۱۹۷۵ء

آج فلیٹز ہوٹل لاہور میں مولانا محترم نے "اسلام اور انسانی حقوق" کے موضوع پر ایک گھنٹہ پانچ منٹ تقریر فرمائی۔

(یہ تقریر کتابچے اور کیسٹ کی صورت میں دستیاب ہے)۔

۲۰ / نومبر ۱۹۷۵ء

عصری نشست میں ایک طالب علم نے سوال کیا کہ زمانۂ طالبعلمی میں آپ کس شخصیت سے متاثر تھے، مولانا نے فرمایا کہ میں بالکل سادہ سا طالب علم تھا، تاہم اس زمانے میں مولانا شبلیؒ اور مولانا حالیؒ کا بہت چرچا تھا ——— مولانا حالی تو والد مرحوم کے استاد بھی تھے (شاعری میں نہیں)۔ اس لیے ہمارے ہاں ان کا بہت احترام تھا۔

سرسید مرحوم کے بارے میں ذکر آیا تو مولانا نے فرمایا کہ سرسید رشتے میں میرے والد کے ماموں تھے (حقیقی ماموں نہیں)۔

ایک صاحب نے کہا کہ مولانا کوئی نصیحت فرمایئے۔ مولانا محترم نے فرمایا کہ میں وہی نصیحت کرتا ہوں جو حضورؐ کبھی کبھی صحابۂ کرامؓ سے فرمایا کرتے تھے: "اُوْصِیْکُمْ بِتَقْوَی اللّٰہِ"۔ اور یہ وہ نصیحت ہے جو خود اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان سے فرمائی:۔

وَلَقَدْ وَصَّیْنَا الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتَابَ مِنْ قَبْلِکُمْ وَاِیَّاکُمْ اَنِ اتَّقُوا اللّٰہَ۔ (النساء: ۱۳۱)۔

۲۲/ نومبر ۱۹۷۵ء

ایک صاحب نے مولانا محترم سے ان کے اُستاد محترم مولانا عبد السّلام نیازی صاحب مرحوم کے متعلق تعارفی معلومات کی خواہش کا اظہار کیا۔ مولانا محترم نے ذیل میں جواب لکھا:۔

"مولانا نیازی مرحوم اپنے وقت کے اکابر اہلِ علم میں سے تھے، اور بعض اعتبارات سے تو پورے مُلک میں ان کا جواب نہ تھا۔ خصُوصیت کے ساتھ ان کی قوتِ تقریر، اور پھر اس میں لذتِ تقریر ایسی بے نظیر تھی کہ جس مسئلے پر بھی کلام فرماتے تھے اس میں کلام کی گنجائش نہ چھوڑتے تھے اور ان کی خوش گفتاری کے باعث گھنٹوں ان کی تقریر سُن کر بھی طبیعت سیر نہ ہوتی تھی۔ علوم قدیم میں سے کوئی علم ایسا نہ تھا جس میں ان کو کمال حاصل نہ ہو۔

چونکہ مولانا کا تعلق چشتیہ سلسلے سے تھا۔ اس لئے ان کو میرے خاندان سے بڑی عقیدت تھی اور میرے والد مرحوم کا بہت احترام فرماتے تھے۔ بچپن میں میری عربی زبان کی تعلیم انہی کے مبارک ہاتھوں سے شروع ہوئی تھی۔ وہ از راہِ کرم دہلی میں چند مہینوں تک خود ہمارے ہاں تشریف لاکر مجھے بڑی شفقت سے پڑھاتے تھے، لیکن چونکہ میرے والد مرحوم کا قیام اورنگ آباد دکن میں تھا اس وجہ سے اس زمانے میں زیادہ مدت تک مجھے اُن سے شرفِ تلمذ حاصل نہ رہ سکا۔

ایک مدّتِ دراز کے بعد ۱۹۲۱ء میں جب مجھے مستقل

طور پر دہلی میں رہنے کا موقع ملا تو میں نے مولانا سے گزارش کی کہ مجھے پھر تعلیم کے لیے کچھ وقت عنایت فرمائیں انہوں نے بڑی خوشی سے اس کو قبول فرمایا۔ محبت سے وہ مجھ کو سید بادشاہ کہا کرتے تھے۔ فرمانے لگے کہ سید بادشاہ روزانہ صبح کی اذان کے وقت تم میرے گھر پر پہنچ جایا کرو۔ ان کا گھر میرے مکان سے کافی دور، ترکمان دروازے کے قریب تیلیوں کی گلی میں تھا۔ میں جاڑے، گرمی، برسات ہر موسم میں بلا ناغہ ٹھیک اذان کے وقت پہنچ جاتا تھا اور وہ نماز کے بعد گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ، جس قدر ان کا جی چاہتا مجھے درس دیتے تھے۔ کبھی جب ان کا جی نہ چاہتا تو اندر ہی سے ارشاد فرما دیتے کہ بھئی سید بادشاہ، آج طبیعت حاضر نہیں ہے، کل آنا۔ کبھی کبھار ایسا اتفاق دو دو تین دن مسلسل ہوتا تھا، مگر میں کبھی بددل نہ ہوا اور وقتِ مقررہ پر حاضری دیتا رہا۔ اس زمانے میں میں نے ان سے معانی و بلاغت اور معقولات کی کتابیں پڑھیں۔ ان کا طریقہ یہ تھا کہ ایک فن کی کوئی ایک کتاب تجویز کر دیتے، اور اسی میں وہ پورا فن پڑھا دیتے تھے۔ کتاب کے چند فقرے مجھ سے پڑھوا کر سنتے، اس کا مطلب مجھ سے پوچھتے، اور پھر اس پر مفصل تقریر کر کے فن کے تمام متعلقہ مسائل اس طرح بیان کرتے کہ وہ پوری طرح میرے ذہن نشین ہو جاتے۔ بعد میں گھر آ کر میں ضروری چیزیں اپنی یادداشت، اور اپنے فہم کو مستحکم کرنے کے لیے خود اپنے قلم سے لکھ

لیتا تھا۔ وہ فرماتے تھے کہ ایک فن پر بہت سی کتابیں پڑھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ پڑھانے والا ایسا ہونا چاہیے کہ کسی ایک بنیادی کتاب کو اس طرح پڑھائے کہ طالبعلم اس فن کی ہر کتاب خود پڑھنے اور سمجھنے کے قابل ہو جائے۔ دورانِ درس میں جتنے سوالات پیدا ہونے ممکن تھے ان کو وہ خود جانتے تھے اور ان میں سے ایک ایک کو خود چھیڑ کر اس کی وضاحت فرما دیتے تھے، اس لیے بہت ہی کم ایسا ہوتا تھا کہ مجھے ان سے کوئی چیز پوچھنے کی ضرورت پیش آتی ہو۔ اس براہِ راست تجربے کی بنا پر میں جانتا ہوں کہ علوم پر ان کی نظر کتنی وسیع تھی اور طالبِ علم کو سمجھانے کا کیسا زبردست ملکہ ان کو حاصل تھا۔ ایسے اُستاد فطری طور پر صرف اسی وقت پڑھا کر خوش ہوتے ہیں جب وہ دیکھتے ہیں کہ طالب علم ذہین ہے اور ان سے استفادہ کرنے کی اچھی صلاحیت رکھتا ہے۔ خصوصاً مولانا مرحوم کا مزاج تو کچھ ایسا تھا کہ غبی آدمی کو پڑھانے سے صاف انکار فرما دیتے تھے اور پہلی نظر ہی میں بھانپ لیتے تھے کہ طالب علم ان سے پڑھنے کے قابل ہے یا نہیں۔

مولانا مرحوم نے مجھ پر اتنی توجہ اور محنت فرمائی مگر کبھی معاوضہ کا نام تک زبان پر نہ آنے دیا۔ بس کبھی کبھار کسی پھل کی فرمائش کر دیتے تھے اور وہ مَیں درس کے وقت ان کے پاس لے جایا کرتا تھا۔

اس کے علاوہ ان کی محبت و شفقت ایسی تھی کہ

وقتاً فوقتاً خود بھی میرے ہاں تشریف لے آتے تھے۔ اور ان کی کشش بہت سے لوگوں کو کھینچ لاتی تھی۔ اس وقت اچھی خاصی محفل جم جاتی تھی اور کسی مسئلے پر ان کی تقریر شروع ہو جاتی تو دو دو ڈھائی ڈھائی گھنٹے اس کا سلسلہ چلتا رہتا تھا۔ خوش گفتاری کا یہ عالم تھا کہ منہ سے پھول جھڑتے تھے۔

مزاج قلندرانہ تھا۔ بے نیاز طبیعت کے مالک تھے کسی سے کچھ غرض نہ رکھتے تھے۔ خلوص اور محبت کے ساتھ ملنے والوں سے ان کا برتاؤ انتہائی مشفقانہ ہوتا تھا۔ اور ان کی ناز برادری تک کر لیتے تھے، لیکن کسی کی اکڑ وہ برداشت نہ کر سکتے تھے۔ بڑائی کا زعم رکھنے والوں کے ساتھ ان کا برتاؤ کچھ دوسرا ہی تھا جس کے صحیح اور غلط قصے اکثر مشہور ہیں۔

اِسی قلندرانہ مزاج کی وجہ سے بظاہر وہ لوگوں کو آزاد منش نظر آتے تھے، لیکن ان کے اندر بہت گہری دینداری پائی جاتی تھی اور اپنی رُوحانیت کی نمائش سے ان کو اس قدر نفرت تھی کہ اس پر آزاد منشی کا پردہ ڈال کر انھوں نے اہلِ دین کے طبقے میں بدنام ہونا گوارا کر لیا، مگر ریاکار پیر یا مذہبی پیشوا بننا گوارا نہ کیا۔ دین سے ان کے گہرے تعلق کا اندازہ اس وقت ہوتا تھا جب ان کے سامنے کوئی دینِ اسلام کے خلاف زبان کھول بیٹھتا تھا۔ ایسے مواقع پر ان کا جلال دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔

حق یہ ہے کہ میں ان کی تعریف کا حق ادا نہیں کر سکتا۔ میرے اُوپر ان کے اتنے احسانات ہیں کہ اللہ تعؔ ہی ان کا اجر دے سکتا ہے۔"

طاب اللہ ثراہ۔

خاکسار

ابُوالاعلیٰ۔

-●-

بی بی سی کے نمائندے کو انٹرویو دیا

۲۵ نومبر ۱۹۷۵ء

بی بی سی کے مسٹر ولیم کراے نے ۲۵ نومبر ۱۹۷۵ء کو مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ سے مفصل ملاقات کی، پچاس منٹ کے اس انٹرویو میں انہوں نے مختلف موضوعات پر مولانا محترم سے متعدد سوالات کیے۔ جناب حفیظ الرحمٰن احسن نے اِس قیمتی اور خیال افروز گفتگو کو اپنے ٹیپ ریکارڈ کے ذریعے محفوظ کر لیا۔ ذیل میں اس بھرپور انٹرویو کا مکمل متن پیش کیا جاتا ہے:

مسٹر ولیم کراے کے سوالات اور مولانا مودودیؒ کے جوابات

ولیم کراے:

Are you satisfied with the Islamic provisions, incorporated in the Constitution of Pakistan 1973?

(کیا آپ آئین ۱۹۷۳ء میں شامل اِسلامی دفعات پر مطمئن ہیں؟)

مولائے محترم:

Yes, we are satisfied with these provisions. As a matter of fact we have tried to introduce these provisions in the constitution.

(جی ہاں، ہم ان دفعات پر مطمئن ہیں اور درحقیقت دستور میں ان

دفعات کو شامل کرنے کے لیے ہم نے مسلسل جدوجہد کی ہے)

ولیم کرالے:

Like Islamic Council etc. ?

(مثلاً اسلامی کونسل وغیرہ ؟)

مولانائے محترم:

Yes, Everything about Islam, which has been included in the Constitution is due to our persistence.

(اسلام سے متعلق ہر وہ چیز جو دستور میں شامل ہے دراصل ہماری کوششوں کے نتیجے میں شامل کی گئی ہے)

جہاں تک اِن دفعات کے شاملِ آئین ہونے کا تعلق ہے اس پر تو ہم مطمئن ہیں لیکن اس بات پر مطمئن نہیں ہیں کہ ان پر عملدرآمد کس طریقے سے ہو رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان دفعات کو سرد خانے میں ڈال دیا گیا ہے اور نہ صرف یہ کہ ان پر عمل نہیں کیا جا رہا ہے بلکہ جتنے کام بھی کیے جا رہے ہیں وہ ان کے برعکس کیے جا رہے ہیں"

ولیم کرالے:

پاکستان کا موجودہ قانونی ڈھانچہ اینگلو سیکسن قانون کی بنیاد پر قائم ہے۔ کیا آپ اسلام کے شرعی قوانین کو نافذ کرنے کیلئے پاکستان کے موجودہ قانونی نظام میں بنیادی تغیرات لائیں گے ؟

مولانا محترم:

ہم صرف اتنا ہی نہیں چاہتے کہ محض قانونی نظام (LEGAL SYSTEM) کو تبدیل کیا جائے، بلکہ ہمارے پیشِ نظر پورے معاشرے کو اسلامی بنیادوں پر استوار کرنا اور پورے نظامِ حکومت کو تبدیل کرنا ہے۔ اس مقصد کے لیے صرف لیگل سسٹم کو تبدیل کرنا ناکافی نہیں ہو

سکتا ۔ قانونی نظام کے ساتھ ایک بڑا تعلق ملک کے تعلیمی نظام کا ہے۔ اگر نظامِ تعلیم افرادِ قوم کو مسلمان بنانے والا نہ ہو تو محض قانونی نظام کے نفاذ سے اسلامی معاشرے کی تشکیل کا مقصد پورا نہیں ہو سکتا۔ ایسا ہی معاملہ ملک کے معاشی نظام کا ہے۔ اگر اسے صحیح اسلامی خطوط پر استوار نہ کیا جائے تو اس صورت میں بھی محض قانونی نظام کی اصلاح مفید اور مؤثر ثابت نہیں ہو سکتی۔ اس بناء پر، ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہماری پوری معاشرتی زندگی (SOCIAL LIFE) اسلام کے مطابق ہو۔ ہماری حکومت کی نمایاں پالیسیاں اسلام کے مطابق ہوں اور حکومت کے سارے معاملات صحیح اسلامی خطوط پر انجام پائیں۔ اس مقصد کے لیے یہ نہایت ضروری ہے کہ سروسز کی ٹریننگ کے تمام اداروں کا تعلیمی اور تربیتی ڈھانچہ تبدیل کیا جائے، سول سروس کے تمام شعبوں اور فوج کی تربیت کے اداروں میں بھی اسلام کی اخلاقی تعلیم دینے کا انتظام کیا جائے اور زیرِ تربیت افسروں کے دلوں میں اسلام کا صحیح شعور (CREED) بٹھایا جائے۔ ان کو سچا مسلمان بنانے کی کوشش کی جائے، لیکن یہ کام نہیں کیا جا رہا ہے، اس کے برعکس صورتِ حال یہ ہے کہ انگریزی حکومت کے زمانے میں سروسز کو جس طرز پر ٹریننگ دی جاتی تھی، اسی طرز پر اب بھی دی جا رہی ہے۔ اسلامی تربیت کی کوئی فکر اب تک نہیں کی گئی۔ اس لیے ہمارے نقطۂ نظر سے محض لیگل سسٹم میں تبدیلی کافی نہیں ہے۔

We want to see overall changle.

ولیم کرالے

آپ نے ہر شعبۂ زندگی سے متعلق اداروں میں اسلامی تعلیم و تربیت

کو لازمی قرار دیا ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ ایک جدید ریاست کی معیشت کو خالص اسلامی اصولوں کے مطابق کیونکر چلایا جا سکتا ہے؟

مولانائے محترم

ہم نے تیس سال یہ بات ثابت کرنے میں صرف کئے ہیں کہ ایک جدید ریاست کو مکمل طور پر اسلام کے عطا کردہ اصولوں پر چلایا جا سکتا ہے اور صرف چلایا ہی نہیں جا سکتا بلکہ ثابت کیا جا سکتا ہے کہ اسلامی بنیادوں پر قائم ہونے والی جدید ریاست دوسری تمام جدید ریاستوں سے زیادہ کامیاب اور بہتر ہے، چنانچہ ہماری کوشش صرف یہی نہیں ہے کہ ہم پاکستان میں اسلام کو نافذ کر کے یہ بتائیں کہ اسلام کی بنیادوں پر ایک جدید ریاست چل سکتی ہے بلکہ ہم یہ بھی چاہتے ہیں کہ اس جدید ریاست کو دیکھ کر دنیا کی دوسری جدید ریاستیں اس بات کی قائل ہو جائیں کہ یہ ریاست ہم سے کہیں بہتر اور فائق ہے۔

The principles of an Islamic State are superior to all other political systems.

(اسلامی ریاست کے اصول باقی تمام سیاسی نظاموں پر فوقیت رکھتے ہیں)

ولیم کرالے:

اتفاق سے ترکی کے صدر ان دنوں پاکستان کا دورہ کر رہے ہیں اور پاکستان اور ترکی کے درمیان گہرے دوستانہ، تہذیبی اور سیاسی روابط بھی ہیں، چنانچہ میں ترکی کے حوالے سے ایک سوال پوچھنا چاہتا ہوں۔ ترکی ایک مسلمان ملک ہے لیکن بیسویں صدی کے تیسرے عشرے سے اس نے سیاسی اور معاشی ترقی کا ایک نیا راستہ

اختیار کیا۔ ایک زمانے میں ہندوستان اور ترکی کے درمیان خلافت
کے مسئلے پر خاصی جذباتی فضا پائی جاتی تھی لیکن بالآخر ترکی نے خود
ہی خلافت کا ادارہ ختم کر دیا۔ اس کے بعد ملک میں سیکولر نظام قائم
کیا گیا، بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ ملکی سیاست اور معیشت کو جدید
دَور کے تقاضوں سے ہم آہنگ کر دیا گیا۔ سوال یہ ہے کہ پاکستان
کیوں ترکی کے تجربے سے فائدہ نہیں اٹھاتا اور اس کی تقلید کیوں نہیں
کرتا؟ اس کے برعکس آپ ماضی کے قدیم اِسلامی نظام کی طرف کیوں
واپس جانا چاہتے ہیں؟

<u>مولانا محترم:</u>

آپ نے سوال بہت بڑا کیا ہے۔ اس لیے میں قدرے تفصیل
کے ساتھ اس کا جواب دوں گا۔

اس بات کو اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ اس وقت دُنیا میں مسلمانوں
کی جتنی حکومتیں پائی جاتی ہیں ان میں سے کوئی بھی پورے طور پر
اِسلامی سسٹم پر نہیں چل رہی ہے۔ پھر ان میں بھی دو طرح کی حکومتیں
ہیں۔ ایک حکومتیں تو وہ ہیں جو کھُلم کھُلا خود کو سیکولر کہتی ہیں اور دوسری
وہ ہیں جو اِسلام کو ریاست کا مذہب تو قرار دیتی ہیں لیکن نہ تو وہ
اِسلام کے اصُولوں پر قائم کی گئی ہیں اور نہ انہیں اِسلام کے اصُولوں
کے مطابق چلایا جا رہا ہے۔ جہاں تک ترکی کا تعلق ہے تو اصل
صورت واقعہ یہ ہے کہ وہاں جو خلافت چلی آ رہی تھی وہ انحطاط کا
شکار (DEGENERATED) ہو کر اپنی حقیقی خصوصیات سے عاری ہو چکی
تھی۔ پھر اِس کو ختم کر کے ترکی میں جو سیکولر ریاست قائم کی گئی وہ بھی
خلافِ اِسلام تھی، یعنی نہ تو وہ خلافت پوری طرح اِسلامی تھی اور نہ
بعد میں قائم ہونے والی سیکولر ریاست کا اسلام سے کوئی تعلق تھا۔

اس کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ ترکی میں کوئی لیڈر یا اجتماعی قوت ایسی موجود نہ تھی جو وہاں پر اسلامی اصولوں کے مطابق حکومت قائم کرتی۔ آپ کے بقول ترکی میں جو نیا دَور شروع کیا گیا اس کی بنیاد اِسلام پر ہرگز نہ تھی اور اس سے پہلے جو نظام وہاں قائم تھا وہ بھی اِسلامی نہ تھا اور دَراصل پرانا ٹرکشن نظام تھا۔ خلافت کا ادارہ بس برائے نام موجود تھا۔ محض ایک بادشاہ کے لیے خلیفہ کا خطاب اختیار کر لیا گیا تھا۔ حالانکہ خلافت، بادشاہت (MONARCHY) سے بالکل ایک مختلف چیز ہے۔

ولیم کراسے:

You are saying that Khilafat had become a secular or a non-religious institution?

(آپ کا مطلب یہ ہے کہ ترکی میں خلافت کا نظام لادینی غیر مذہبی نظام میں تبدیل ہو چکا تھا؟)

مولانائے محترم:

Rather a pseudo-Religious Institution we are not satisfied with it, and we are not satisfied also with the so-called reforms of Mustafa Kamal Ataturk.

(خلافت ایک نیم مذہبی نظام بن چکی تھی، چنانچہ ہم اس سے مطمئن نہ تھے، لیکن ہم ان نام نہاد اصلاحات سے بھی مطمئن نہ تھے جو مصطفیٰ کمال اتاترک نے خلافت کو ختم کر کے ترکی میں رائج کیں)

لیکن اب ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ خود ترکی میں بھی بکثرت ہمارے ہم خیال لوگ پیدا ہو رہے ہیں جو یہ چاہتے کہ وہاں بھی اِسلامی نظام قائم کیا جائے۔ اس طرح دنیا کے مسلمان ممالک میں بھی ایسا ایک عنصر

(ELEMENT) موجود ہے جو اسلام کے حقیقی اصولوں پر عملدرآمد کرنا چاہتا ہے۔

آپ نے یہ جو کہا ہے کہ ہم ایک پرانے طریقے کی طرف واپس کیوں جانا چاہتے ہیں تو دراصل یہ (GO BACK) کا لفظ غلط ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ انسان کے لیے خدا کی طرف سے جو ہدایت آئی ہے وہ سب سے قدیم بھی ہے اور سب سے جدید بھی۔ خُدائی ہدایت کسی وقت اور مقام کی پابند نہیں ہے۔ یہ ایک ازلی اور ابدی چیز ہے۔ اس وجہ سے (GOBACK) کا لفظ استعمال کرنا بے معنی ہے۔

Truth is always truth. It cannot be old or new. At any-time and at every place it is truth.

(صداقت ہر حال میں صداقت ہے، اس کے قدیم یا جدید ہونے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ صداقت ہر عہد میں اور ہر مقام پر صداقت ہے)

ولیم کرالے:

لیکن اسلامی قانون کے بعض پہلوؤں مثلاً قانون تعزیرات کے بارے میں جدید ذہن کے اندر بعض اعتراضات اور شبہات پائے جاتے ہیں۔ موجودہ دور کی جدید مسلم ریاستیں بھی ان قوانین کو ترک کر چکی ہیں۔ شاید آپ اتفاق کریں کہ یہ تعزیری قوانین دراصل قرونِ وسطیٰ کی سوسائٹی کے لیے وضع کئے گئے تھے اور یہ قوانین اب بیسویں صدی کے معاشرے کے لیے زیادہ موزوں نہیں ہو سکتے۔ اب جرم اور سزا کے بارے میں تصورات بھی تبدیل ہو چکے ہیں، اس لیے یہ معاملہ مذہبی نقطۂ نظر سے زیادہ معاشرتی ہے۔ کیا آپ اس بدلے ہوئے زمانے میں اس دور کے تبدیل شدہ رویوں کے برعکس ان قوانین کو ان کی

اسی پرانی شکل میں نافذ کرنا چاہیں گے ؟

مولانا محترم :

آپ جس بیسویں صدی کا ذکر کر رہے ہیں ، آپ کا کیا خیال ہے کہ اس بیسویں صدی میں امریکہ اور یورپ کے اندر اور خود مسلمان ممالک کے اندر جن میں اسلامی قوانین پر عمل کرنا چھوڑ دیا گیا ہے۔ کیا ارتکابِ جرم کی رفتار (CRIME RATE) بڑھ رہی ہے یا کم ہو رہی ہے؟ کیا خیال ہے آپ کا ؟

ولیم کراے :

In many countries it is increasing.

(بہت سے ممالک میں یہ رفتار بڑھ رہی ہے)

مولانائے محترم :

ہمارے ہاں صرف پنجاب کے بارے میں جو پولیس رپورٹ حال میں شائع ہوئی ہے اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ صرف ایک مہینے میں دو سو قتل ہوئے ہیں اور یہ رفتارِ جرم پہلے سے کہیں زیادہ ہے امریکہ اور دوسرے ترقی یافتہ ممالک میں رفتار جرائم کے بارے میں آپ جانتے ہیں کہ اس وقت کیا ہے اور وہ کتنی تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ کسی معاشرے میں جرائم کا موجود رہنا کچھ اچھا ہے ؟

ولیم کراے :

" اچھا نہیں ہے "! (یہ جواب اردو میں دیا گیا)

مولانائے محترم :

اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ آپ کے موجودہ تعزیری قوانین (CRIMINAL LAWS) جرائم کے خاتمے میں مکمل طور پر ناکام ہو چکے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ ان میں اضافے کے موجب بن رہے ہیں۔ اس

کے برعکس ایک مسلمان ملک میں جہاں اسلام کا قانون صرف ایک حد تک ہی نافذ کیا گیا ہے، یعنی چوری پر اسلامی تعزیرات نافذ کی گئی ہیں، وہاں اس نے چوری کا خاتمہ کر دیا ہے۔ وہاں کیفیت یہ ہے کہ اگر آپ اپنا سامان سڑک پر چھوڑ کر چلے جائیں اور تین دن کے بعد واپس آئیں تو وہ آپ کو وہیں پڑا ملے گا۔ کوئی اس کو ہاتھ نہیں لگائے گا۔ اگر آپ اپنا گھر کھلا چھوڑ کر چلے جائیں اور کئی ہفتے کے بعد واپس آئیں تو آپ کو سارے گھر کا سامان جوں کا توں ملے گا۔ کوئی شخص گھر میں داخل تک نہیں ہوگا۔ یہ صرف اس چیز کا نتیجہ ہے کہ سعودی عرب میں ان سزاؤں کے نفاذ پر شروع میں جو چند ہاتھ کاٹے گئے، ان کی وجہ سے چوری کا وہاں خاتمہ ہوگیا تو کیا چند مجرموں کے ہاتھ کاٹ کر چوری ختم کر دینا بہتر ہے یا یہ بہتر ہے کہ مجرموں کو جیل بھیج بھیج کر ان کو عادی مجرم بنایا جائے۔ وہ جیل سے نکلیں تو پھر چوری کریں اور پھر جیل جائیں۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ کے موجودہ تعزیری قوانین جرائم کی پرورش کر رہے ہیں، لیکن ہم اسلامی قوانین کے نفاذ کے ساتھ جرائم کو ختم کر سکتے ہیں۔ اب کیا یہ بہتر ہے کہ ہم جرائم کو ختم کر دیں یا یہ بہتر ہے کہ جرائم ہوتے رہیں اور ان کے مؤثر انسداد کی کوئی تدبیر نہ کی جائے؟

<u>ولیم کرالے:</u>

جدید معاشرے کے حالات و اطوار بہت بدل چکے ہیں۔ جرم اور سزا کا تصور بدل چکا ہے۔ ماضی کی اسلامی ریاست میں اور موجودہ دور کی جدید ریاست میں بڑا فرق رونما ہو چکا ہے۔ سعودی عرب کے معاشرتی حالات اور شکاگو اور نیو یارک جیسے بڑے بڑے شہروں کی معاشرتی کیفیت اور ساخت بالکل مختلف ہے، اس لیے اگر موجودہ

شہری نظام کے لیے اگر اسلامی سزائیں مفید بھی تھیں تو موجودہ بڑے بڑے شہروں کے لیئے یہ کس طرح کارآمد ہوسکتی ہیں، جب کہ ان میں جرائم کا ہونا ایک حد تک فطری بات ہے اور ان میں سزاؤں کا عملی نفاذ کوئی آسان کام بھی نہیں۔

مولانائے محترم:

آپ کا خیال یہ ہے کہ شکاگو اور نیویارک جیسے بڑے بڑے شہروں کی معاشرتی زندگی (SOCIAL LIFE) ہی ایسی ہے کہ ان کے اندر جرائم کا ہونا ایک فطری چیز ہے۔ اس لیے اس حالت کے خاتمے کے لیے ہاتھ کاٹنے جیسی سزاؤں کا نفاذ ایک غیر ترقی پسندانہ بات ہے اور آپ کے خیال میں یہ عملاً ممکن بھی نہیں، لیکن میرا خیال یہ ہے کہ ایسا ہوسکتا ہے اور اگر صرف چوری پر ہاتھ کاٹنے کا قانون جاری کردیا جائے تو نیویارک اور شکاگو جیسے شہروں بلکہ پورے امریکہ میں چوری کا ارتکاب کم ہوسکتا ہے، اس کا مکمل خاتمہ تو صرف اس صورت میں ممکن ہے، جب کہ پورا سیاسی اور معاشرتی نظام اسلامی خطوط پر قائم کیا جائے، لیکن اسلامی سزاؤں کے نتیجے میں بھی اس میں کمی واقع ہوسکتی ہے۔ ہمیں اس بات کا پورا یقین ہے کہ اسلام کی تجویز کردہ سزائیں معاشرے سے جرائم کا مکمل انسداد کرسکتی ہیں اور ہم یہ چاہتے کہ پاکستان کے اندر اسلام کا مکمل ضابطۂ حیات جاری ہو اور اسلامی تعزیرات نافذ ہوں، پھر ہم دنیا کو بتائیں گے کہ ہمارے ہاں جرائم کس طرح ختم ہوگئے ہیں۔ اگر ہمیں اس بات کا موقع ملا کہ ہم پاکستان میں صحیح اسلامی نظام قائم کرسکیں، ہم عملاً دنیا پر یہ بات ثابت کردیں گے کہ اسلام کی بنیادوں پر ایک جدید ریاست چل سکتی ہے اور زیادہ بہتر طریقے سے چل سکتی ہے اور اسلام کی بنیاد پر ایک ایسا

معاشرہ وجود میں آتا ہے، جو جرائم سے پاک اور امن و امان کا گہوارہ ہوتا ہے۔

ولیم کراے:

لیکن میرا خیال یہ ہے کہ روایتی اسلامی قانون کا یہ پہلو ایسا ہے کہ بیسویں صدی کا انسان اس کو قبول کرنے میں دقت محسوس کرتا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جدید ذہن کے لئے کسی جرم پر ایک شخص کا ہاتھ کاٹ کر اسے ایک عضو سے محروم کر دینا ایک وحشیانہ فعل معلوم ہوتا ہے اور شاید یہ اس جرم سے بھی سنگین نوعیت کی چیز ہے۔ اسی بناء پر بعض لوگوں کا خیال یہ ہے کہ ریاست کی طرف سے کسی شخص کی جان لینے کا اقدام بہر حال ایک غیر معمولی نوعیت رکھتا ہے، اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ قرونِ وسطیٰ کے ایک نظام کو خواہ وہ اپنی جگہ پر مفید ہی تھا، جدید دَور میں رائج کرنا کچھ عجیب سی بات معلوم ہوتا ہے۔

مولانائے محترم:

میرا خیال ہے کہ آپ کی موجودہ تہذیب کو جسے آپ جدید تہذیب کہتے ہیں، جتنی ہمدردی مجرم کے ساتھ ہے، اتنی ہمدردی ان لوگوں کے ساتھ نہیں جن پر جرم کا ارتکاب کیا جاتا ہے۔ مثلاً ایک شخص کا بچہ کوئی اغوا کر کے لے جاتا اور پھر اس کو اطلاع دیتا ہے کہ اتنے ملین ڈالر مجھے دے دو تو بچہ تمہیں مل جائے گا ورنہ اسے قتل کر دیا جائے گا اور بعض اوقات وہ ایسا کر بھی گزرتا ہے تو آپ کا کیا خیال ہے کہ اس طرح کے آدمی کو پکڑ کر اگر کوئی سخت سزا دی جائے مثلاً اس کا ہاتھ کاٹ ڈالا جائے یا اس کی گردن اڑا دی جائے تو کیا یہ وحشیانہ فعل ہوگا؟ یعنی آپ کے نزدیک والدین کو ان کے بچوں سے محروم کر دینا کوئی وحشیانہ حرکت نہیں، البتہ اس حرکت کے مرتکب کو

اس کے جرم کی سزا دینا وحشیانہ فعل اور ظالمانہ فعل ہے جس کی کم از کم ریاست کو ذمہ داری نہیں لینی چاہیئے۔ آپ کی ساری ہمدردی اس شخص کے ساتھ ہے، جس نے ایک مجرمانہ اور غیر انسانی فعل کے ذریعے سے اپنے آپ کو مستوجب سزا ٹھہرایا ہے اور اس شخص کے بارے میں آپ بے حس ہیں جسے ظلم اور سنگدل کا نشانہ بنایا گیا ہے۔
ہم یہ کہتے ہیں کہ جو شخص معاشرے کے اندر جرم کا ارتکاب کر کے معاشرے کے امن و سکون کو غارت کرتا ہے وہ اس کا مستحق ہے کہ اس کو اتنی سخت سزا دی جائے کہ دوسروں کو اس سے عبرت ہو اور وہ اس قسم کے جرم کے ارتکاب کی جرأت نہ کر سکیں، یعنی ہمارے نزدیک سزا صرف سزا ہی نہیں ہے، بلکہ وہ ارتکاب جرم کو روکنے کا ذریعہ بھی ہے، وہ جرم کی حوصلہ شکنی بھی کرتی ہے، چنانچہ ہماری ہمدردی مجرم کے ساتھ نہیں ہے، بلکہ اس شخص کے ساتھ ہے جس پر ارتکابِ جرم کیا جاتا ہے اور اس معاشرے کے ساتھ ہے جس کے اندر ارتکابِ جرم سے ناہمواری اور عدم تحفظ کی کیفیت پیدا کی جاتی ہے۔

You think it is more social and more cultured to be a criminal. It is human to kill a man and it is inhuman to kill a murderer.

ابھی پچھلے دنوں امریکہ میں مس ہرسٹ کا جو واقعہ پیش آیا وہ آپ کے علم میں ہوگا جو لوگ اس کو اغوا کر کے لے گئے تھے اور انہوں نے اس کو اس حد تک جرائم آشنا کر دیا کہ اس نے بنک پر ڈاکہ ڈالا اور دوسرے جرائم کا ارتکاب کرتی پھری۔ آپ کے نزدیک وہ لوگ تو بہت مہذب اور (CULTURED) ہیں، لیکن اگر ان لوگوں کو کوئی سخت

سزا دی جائے تو یہ فعل غیر مہذبانہ ہوگا۔

ولیم کراسلے:

اس کے باوجود میں یہ سمجھتا ہوں کہ اسلام جیسے قدیم مذہب اور اس کی مخصوص فلاسفی کے اس پہلو کو سمجھنا اور اس بات کا قائل ہونا بہت مشکل سی بات ہے کہ معاشرے کو اتنا غیر مہذب، ان گھڑ اور غیر ترقی یافتہ تسلیم کر لیا جائے اور اس میں اِس قسم کی انتہائی سزاؤں کو رائج کیا جائے جو آپ بیان فرما رہے ہیں۔

مولانائے محترم:

بات دراصل یہ ہے کہ آپ کے معاشرے میں جو جرائم ہو رہے ہیں۔ آپ نے ان کے ساتھ صلح کر لی ہے اور آپ ان کے ساتھ ہی جینا چاہتے ہیں۔ گویا آپ چاہتے یہ ہیں کہ آپ کی سوسائٹی میں لوگوں کو قتل بھی کیا جاتا رہے، اغواء کی وارداتیں بھی ہوتی رہیں، ڈاکے بھی پڑتے رہیں، لوگوں کا گھروں کے اندر اطمینان سے سانس لینا بھی مشکل ہو جائے، لیکن ان میں سے کسی چیز کو ختم کرنے کے لیے کوئی سخت اقدام نہ کیا جائے، کیونکہ یہ آپ کے خیال میں تہذیب کے خلاف ہے اور اس سے موجودہ دَور کے مہذب انسان کی توہین ہوتی ہے۔ نیویارک میں اس وقت حالت یہ ہے کہ اگر رات کے وقت آکر کسی کا کوئی عزیز یا دوست گھنٹی بجائے تو وہ کبھی اس خوف سے دروازہ نہیں کھولے گا کہ آنے والا ضرور کوئی ڈاکو ہوگا، اس قسم کے خوف و دہشت کے درمیان آپ لوگ زندگی بسر کر رہے ہیں، لیکن اس صورتحال سے آپ نے سمجھوتہ (Compromise) کر لیا ہے اور اس کو بدلنے کے لیئے آپ تیار نہیں۔ آپ کا خیال یہ ہے کہ اس کو تو رہنا ہی ہے اور اس چیز کے ہوتے ہوئے آپ ماڈرن اور مہذب بھی ہیں،

لیکن اگر اس جرم و خوف کی زندگی کو بدلنے کے لیے کوئی سخت قدم اٹھایا جائے تو وہ آپ کے نزدیک قرونِ وسطیٰ کی طرف پلٹنا ہے، لیکن ہم یہ چاہتے ہیں کہ اگر ہمیں موقع ملے تو، ہم اسلامی قوانین کو رائج کر کے دنیا کو دکھا دیں کہ اِس طرح ایک پرامن معاشرہ (PEACEFUL SOCIETY) وجود میں آتا ہے۔ وہ معاشرہ مہذب اور ماڈرن بھی ہوگا اور امن و سلامتی کا گہوارہ بھی، اس کے قیام کے بعد آپ کے یہ سارے نام نہاد جدید تصورات و نظریات محض ایک داستانِ پارینہ بن جائیں گے، چنانچہ اگر ہم اِسلامی نظامِ زندگی کے قائل اور اسے دنیا میں قائم کرنے کے آرزومند ہیں تو اس وجہ سے نہیں کہ وہ ہمارا قدیم مذہبی یا قومی نظام ہے اور اس بناء پر اس کے ساتھ ہمیں محبت ہے، بلکہ اس کو ہم اس وجہ سے مانتے ہیں کہ وہ سراسر ایک معقول اور عادلانہ نظام ہے اور یہ ایک بالکل مطابقِ انصاف اور معقول بات ہے کہ سوسائٹی کو جرائم سے پاک کیا جائے۔ ہمارے نزدیک وہ معاشرہ نہایت بُرا ہے جس کے اندر جرائم پرورش پاتے ہوں اور لوگوں کی ہمدردی کا اصل مرکز مجرم ہوں نہ کہ وہ جن پر جرم کا ارتکاب کیا گیا ہو۔

ولیم کراسے:

جن ممالک میں مسلمان اقلیت میں ہیں اور وہاں اسلامی قوانین نافذ نہیں بلکہ سیکولر نظام پایا جاتا ہے، ان ممالک میں مسلمانوں کا طرزِ عمل کیا ہوگا جب کہ وہ کسی غیر اِسلامی قانون پر یقین نہیں رکھتے۔ کیا وہ اس قسم کی گورنمنٹ کے خلاف کوئی اقدام کریں گے؟

مولانائے محترم:

نہیں، اگر ہم کسی غیر مسلم ریاست (NON-MUSLIM STATE.) میں ہوں گے تو ہم اس ریاست میں یہ کوشش کریں گے کہ پرامن جمہوری

ذرائع سے لوگوں کے خیالات کو تبدیل کریں اور دلائل کے ساتھ ان کو اِسلامی نظامِ زندگی کی معقولیت اور برتری کا قائل کریں۔ اس طریقے سے جب ہم اکثریت کے خیالات و اذہان کو تبدیل کرلیں گے اور لوگوں کو اِسلامی نظامِ زندگی کا قائل کرلیں گے تو اس اکثریت کی بنا پر وہاں کا نظام تبدیل کریں گے اور ظاہر ہے کہ یہ چیز جمہوری نقطۂ نظر سے بالکل درست ہوگی۔ ہم اس ریاست کے اندر غیر جمہوری ذرائع سے کوئی انقلاب نہیں لائیں گے۔

ولیم کرالے:

کیا آپ کے خیال میں جمہوریت کی اِسلامک سوشل فلاسفی کے اندر گنجائش پائی جاتی ہے؟

مولانائے محترم:

Yes, but not in the western meaning. In Western Political Philosophy sovereignty rests with, people, but in Islam it rests with God.

(جی ہاں، لیکن اہلِ مغرب کے نظریہ کے مطابق نہیں۔ مغربی فلسفۂ سیاست میں تو اقتدارِ اعلیٰ کے مالک عوام ہوتے ہیں لیکن اِسلام میں اقتدارِ اعلیٰ اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے۔)

لیکن اس بنیادی فرق کے باوجود ہمارا نظامِ حکومت ایسا ہوگا کہ اس میں ریاست کے سربراہ کا انتخاب لوگوں کی کثرتِ رائے کے ذریعے سے ہوگا۔ لوگوں کے نمائندے ان کی رائے سے منتخب ہوں گے اور پارلیمنٹ ان منتخب نمائندوں پر مشتمل ہوگی اور کوئی حکومت عوام الناس کا اِعتماد کھو دینے کے بعد قائم نہیں رہ سکے گی۔ اس حد تک جمہوریت ہمارے ہاں موجود ہے گویا اللہ تعالیٰ کے اقتدارِ اعلیٰ کو تسلیم کرتے ہوئے

حکومت کی مشینری جمہوری طریقے پر اللہ تعالیٰ کے احکام و قوانین نافذ کرے گی۔ عوام خود مقتدرِ اعلیٰ نہیں ہوں گے۔

ولیم کرالے:

کیا اِس وقت ان معنوں میں کوئی صحیح اِسلامی جمہوری ریاست پائی جاتی ہے؟ یا ماضی قریب میں ایسی کوئی ریاست موجود تھی؟

مولانا محترم:

اگر فرض کیجئے کہ کسی مسلمان ملک میں اس قسم کا اِسلامی جمہوری نظام موجود نہیں ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اِسلام کا دیا ہُوا جمہوری تصورِ ریاست اور قانونِ حکمرانی ناقص ہے بلکہ یہ صورتِ حال ان لوگوں کی غلطی کا نتیجہ ہے، جو مسلمان بھی کہلاتے ہیں لیکن اِسلام کے جمہوری نظام کو رائج نہیں کرتے، چنانچہ ہماری کوشش یہ ہے کہ مسلمان، جہاں کہیں بھی ہیں، وہ محض نام کے مسلمان (PROFESSING MUSLIMS) نہ رہیں، بلکہ عملی مسلمان (PRACTICING MUSLIMS) بنیں۔

ولیم کرالے:

آپ جس قسم کی اِسلامی ریاست کا تصور پیش فرما رہے ہیں۔ اس کے نمایاں خدوخال اور بنیادی خصوصیات کیا ہوں گی اور آپ موجودہ دور میں حکومت کا نظام کن خطوط پر استوار کریں گے؟

مولانائے محترم:

اگر آپ جماعتِ اِسلامی کے منشور (MENIFESTO) کا مطالعہ کریں تو آپ کو پوری طرح معلوم ہو جائے گا کہ ہم اِسلامی اصولِ حکمرانی پر مبنی ایک جمہوری حکومت کس طرح قائم کریں گے اور اس کے نمایاں خدوخال کیا ہوں گے۔ جماعتِ اِسلامی کا منشور انگریزی زبان میں

چھپا ہُوا موجود ہے۔ وہ آپ کو مہیّا کیا جا سکتا ہے۔ آپ اس کا مطالعہ کر کے اس سوال کا مفصل جواب پالیں گے۔

ولیم کرالے :

ایک اور اہم مسئلہ ہے جس کے بارے میں مَیں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں اور وہ مسئلہ ہے سوسائٹی میں عورت کے مقام اور حیثیت کا۔ اس معاملہ میں اسلامی اقدار، مغرب کی صنعتی طور پر ترقی یافتہ سوسائٹی کی اقدار سے قطعی طور پر مختلف اور متضاد ہیں۔ آپ کی رائے کیا ہے اس معاملے میں کہ کیا جدید زمانے کے بدلے ہوئے حالات اور جدید تہذیبی قدروں کی روشنی میں معاشرے کے اندر عورت کے بارے میں اِسلام کے نقطۂ نظر میں کوئی ترقی پسندانہ تبدیلی ممکن ہے؟

مولانائے محترم :

دیکھئے! آپ کے خیال میں آپ کی جو جدید تہذیب اور ماڈرن کلچر ہے، آپ سمجھتے ہیں کہ تہذیب اور ثقافت کا یہی ایک معیار (STANDARD) ہے۔ اس معیار پر آپ دوسری ہر تہذیب و ثقافت کو پرکھتے ہیں، لیکن ہم اس کو نہیں مانتے۔ آپ اپنی جس تہذیب اور کلچر کو "ماڈرن" کہہ کر اس کی بڑی تعریف کرتے ہیں، ہم یہ سمجھتے ہیں کہ یہ ایک پسماندہ (BACKWARD) اور فرسودہ چیز ہے اور یہ تباہ کر رہی ہے آپ کی پُوری سوسائٹی کو اور آپ کے پُورے نظامِ تمدن کو۔ ہم نہیں چاہتے کہ اِس "ماڈرن کلچر" کو اپنی سوسائٹی میں لائیں اور اسے بھی تباہ کر لیں۔ آپ کی جدید تہذیب یہی ہے نا کہ آپ نے اپنے ہاں خاندانی نظام کا خاتمہ کر دیا۔ آپ نے عورت کا جو مقام و مرتبہ سوسائٹی کے اندر متعین کیا، اِس کا نتیجہ یہی نکلا ہے کہ آپ نے عورتوں کے اخلاق بھی برباد کئے اور مردوں کے بھی۔ آپ نے لوگوں

کو اخلاقی پستی کی انتہا تک گرا دیا۔ کیا آپ چاہتے ہیں کہ ہم بھی وہاں تک گر جائیں۔ ہم اس کے لیئے تیار نہیں۔ ہم اپنی سوسائٹی کو ان تمام برائیوں سے پاک رکھنا چاہتے ہیں جو آپ کی ماڈرن سوسائٹی میں پائی جاتی ہیں۔ ہمارے نزدیک ترقی اور چیز ہے اور نام نہاد ماڈرن سوسائٹی کی بُری عادات و اطوار اور چیز۔ ہم ترقی کے قائل ہیں اور وہ ہم ضرور کریں گے، لیکن اس شکل میں نہیں کہ جس طرح آپ کر رہے ہیں، ہم اس کو غلط سمجھتے ہیں۔ اس کے بجائے ہم اپنے اصُولوں پر تعمیر و ترقی کریں گے اور وہی صحیح معنوں میں تعمیر و ترقی شمار ہوگی۔

ولیم کراسلے:

کیا آپ سمجھتے ہیں کہ عورت کا مقام ہر حال میں اس کے گھر کے اندر ہے اور اس کی معاشرتی زندگی کے جملہ معاملات اس کے شوہر سے ہی وابستہ ہونے چاہئیں اور وہ دوسرے مردوں سے رابطہ نہیں رکھ سکتی۔ اس صورت میں کیا آپ یہ بھی پسند نہ کریں گے کہ عورتیں ڈاکٹر یا معلمات بنیں؟

مولانائے محترم:

جی ہاں! اِسلامی اصُولِ معاشرت کی رُو سے عورت کا مقام اس کا گھر ہے اور اس میں مرد کی حیثیت نگران اور قوام کی ہے، البتہ جہاں تک عورتوں کے تعلیم پانے اور ڈاکٹر یا معلمہ وغیرہ بننے کا سوال ہے تو ہم نہ صِرف یہ کہ اس کو درست سمجھتے ہیں بلکہ ضروری سمجھتے ہیں۔ ہم اپنی خواتین کو اعلیٰ تعلیم دلواتے ہیں، لیکن اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے باوجود ایک مسلمان عورت یہ سمجھتی ہے کہ اس کا اصل دائرۂ کار اس کا گھر ہے۔ ہماری خواتین ڈاکٹر بھی بنیں گی لیکن وہ عورتوں کا عِلاج کریں گی، مردوں کا نہیں۔ ہم عورتوں کا ڈاکٹر بننا اِس لیئے ضروری سمجھتے

ہیں کہ وہ عورتوں کا علاج کریں۔ اور عورتوں کو مردوں سے علاج نہ کرانا پڑے۔

ہم یہ چاہتے ہیں کہ عورتیں اعلیٰ تعلیم حاصل کرکے معلمات اور لیڈی لیکچرار اور پروفیسر بنیں تاکہ وہ ہماری بچیوں کو اعلیٰ تعلیم دے سکیں۔ ہم یہ نہیں چاہتے کہ ہماری عورتوں کو مرد پڑھائیں، چنانچہ ہمارے ملک میں ایسے بیشمار کالج موجود ہیں جن میں صرف خواتین پڑھاتی ہیں اور تمام علوم و فنون کی تعلیم دیتی ہیں۔ وہ سائنس بھی پڑھاتی ہیں اور دوسرے جدید علوم بھی۔ اسی طرح دوسرے شعبوں میں بھی جہاں ضروری ہو ہم اپنی خواتین کو اعلیٰ تعلیم و تربیت سے آراستہ کرتے ہیں، لیکن ان سب چیزوں کے ساتھ ساتھ ہم اس اصول کو ہرگز تبدیل نہیں کریں گے کہ مسلمان عورتوں کا اصل مقام ان کا گھر ہے۔ مسلمان عورت سے ہم جو بھی کام لیں گے وہ اس کے گھر کے اندر اور عورتوں کی سوسائٹی کے اندر لیں گے، اس کو مردوں کے اندر نہیں لے آئیں گے۔

ولیم کرالے:

جیسا کہ آپ نے فرمایا یہ درست ہے کہ مغربی سوسائٹی میں خاندانی نظام انتشار کا شکار ہے لیکن اسلامی قانون کا یہ پہلو بھی غور طلب ہے کہ اس میں طلاق کے ذریعے شادی کے بندھن کو ختم کر دینا بہت آسان ہے۔ خاص طور پر موجودہ فیملی لاز سے پہلے تو ایسا ہی تھا۔ کیا یہ چیز عورتوں کے لئے عدم تحفظ کی موجب نہیں ہے؟

مولانائے محترم:

Inspite of this easiness, the divorce-rate in our country is very low, rather negligible, but it is very high in Western countries. where the family system is entirely shattered.

I have seen myself what is the condition of western society and western culture.

(طلاق میں اس آسانی کے باوجود آپ دیکھتے ہیں کہ ہمارے ہاں طلاقوں کی شرح بہت کم ہے، بلکہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ جبکہ مغربی ممالک میں یہ بہت زیادہ ہے۔ وہاں خاندانی نظام مکمل طور پر تباہ ہو چکا ہے۔ میں نے مغربی معاشرے کی اس صورتِ حال کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا ہے)

ہمارے ہاں تو کبھی اتفاق سے یہ سننے میں آتا ہے کہ کسی شخص نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی اور اس پر ہم حیران ہوتے ہیں کہ ایسا کیوں ہوا؟ اس طرح طلاق، ہمارے ہاں آسان ہونے کے باوجود عملاً ایک (RARE) چیز ہے، لیکن آپ کے ہاں جو حالات ہیں وہ آپ خود جانتے ہیں کہ وہاں طلاقوں کی کس قدر بھرمار ہو رہی ہے۔

<u>ولیم کرالے:</u>

مغربی سوسائٹی میں طلاقوں کی یہ کثرت عورتوں کے لیے کچھ زیادہ بڑا مسئلہ نہیں ہے۔ کیونکہ وہ معاشی طور پر آزاد ہیں اور مرد کی محتاج نہیں ہیں، جبکہ اسلامی معاشرہ میں عورت کی یہ پوزیشن نہیں ہے۔

<u>مولانائے محترم:</u>

آپ کو معلوم نہیں ہے کہ مسلمان عورت اپنے باپ سے ورثہ پاتی ہے، اپنے شوہر سے اور اپنے بیٹے سے بھی اس کو حصہ پہنچتا ہے اور اس طرح جس شکل میں بھی اس کو کوئی ورثہ ملتا ہے وہ اس کی خود مالک ہوتی ہے اور اس کا شوہر، باپ، بیٹا یا کوئی اور شخص اس کو اس سے محروم نہیں کر سکتا۔ اسی طرح ایک مسلمان عورت کاروبار کر سکتی ہے اور ان اداروں میں ملازمت کر سکتی ہے جن کا دائرۂ کار خواتین تک محدود

ہے۔ اس طرح اس کو معقول طریقے سے جو معاشی آزادی حاصل ہو سکتی ہے ہم اِس کو تسلیم کرتے ہیں لیکن ہم اِس کی ایسی معاشی آزادی کو درست نہیں سمجھتے جس کے نتیجے میں وہ بالکل آزاد ہو جائے اور جس کے نتیجے میں معاشرے کے اندر طلاقوں کی اس طرح بھرمار ہو جائے جیسی کہ مغربی معاشرے میں پائی جاتی ہے۔ جس سوسائٹی میں (DIVORCE RATE) اس قدر بڑھ جائے وہاں ان بچوں کا کیا حشر ہوگا جن کی ماؤں نے طلاق لے لی ہو۔ طلاق لے کر پہلے وہ ایک شخص سے شادی کریں پھر کسی اور شخص سے اور پھر کسی اور شخص سے اور ادھر بچوں کا حال یہ ہو کہ کوئی ان کا والی وارث نہ ہو۔ آپ کے ہاں نئی نسل جرائم کی کیوں عادی ہوتی جا رہی ہے اور (TEEN AGERS) کے جرائم کیوں ایک بڑا مسئلہ بنے ہوئے ہیں۔ اس کی وجہ اس کے سوا کیا ہے کہ آپ کے ہاں طلاقیں بڑی کثرت سے ہو رہی ہیں اور ان کے نتیجے میں خاندانی نظام درہم برہم بلکہ تباہ ہو کر رہ گیا ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ آپ کے ہاں نوعمر مجرم زیادہ تر عائلی طور پر برباد گھروں سے نکل کر آ رہے ہیں، لیکن آپ یہ تسلیم کریں گے کہ ایسی بات خدا کے فضل سے ہمارے ہاں تقریباً ناپید ہے اور ایسا شاذ و نادر ہی کبھی ہوتا ہوگا کہ کسی خاندان میں طلاق کے نتیجے میں بچے بگڑ کر مجرم بن جائیں، تو اس لحاظ سے ہم اپنے آپ کو مغربی معاشرے سے کہیں زیادہ بہتر اور قابلِ رشک پوزیشن میں پاتے ہیں اور یہ چیز اِسلام کے ان معاشرتی اصولوں کی بدولت ہے جو ہمارے معاشرہ میں اب تک برقرار ہیں اور ان کی پابندی کی جاتی ہے۔

<u>ولیم کرالے:</u>

کیا آپ پاکستان کے اندر رہتے ہوئے ہندوستانی مسلمانوں کے ساتھ ثقافتی روابط رکھنا چاہتے ہیں اور کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ

ہندوستان کے علمی اور دینی مراکز کے ساتھ رابطہ استوار رہے ؟

مولانائے محترم :

جی ہاں ، ہم تو یہ چاہتے ہیں ، لیکن ہندوستان اور پاکستان کے درمیان تعلقات کشیدہ ہونے کی وجہ سے ایسا ممکن نہیں ہے ۔ اس سے پیشتر جب ہندوستان اور پاکستان کے درمیان آمدورفت ممکن تھی اور ڈاک آتی جاتی تھی ، تو اس زمانے میں ہندوستان کے تمام کلچرل سینٹرز اور دینی و علمی مراکز کے ساتھ ہمارے تعلقات برابر قائم رہے ۔ ہمارے رسائل و جرائد اور کتب وہاں جاتی تھیں اور وہاں سے کتب اور رسائل و جرائد ہمارے ملک میں آتے تھے ۔ اس طرح ہندوستان کے مسلمانوں کے ساتھ ہمارے ثقافتی روابط برابر رہے ہیں ۔

ولیم کرالے :

کیا آپ ہندوستان کے موجودہ حالات میں بھارتی مسلمانوں کی اخلاقی مدد و حمایت کرنا چاہتے ہیں ؟

مولانائے محترم :

بالکل ، ہم بھارتی مسلمانوں کو اخلاقی مدد (MORAL SUPPORT) دینا بھی ضروری سمجھتے ہیں اور ہم یہ بھی چاہتے ہیں کہ دنیا کی رائے عامہ کو اس بات پر آمادہ کریں کہ وہ ہندوستان میں مسلم کشی کو روکنے میں اپنا کردار ادا کرے اور بھارتی حکومت پر یہ دباؤ ڈالے کہ وہ وہاں کے مسلمانوں کے ساتھ عدل و انصاف کے ساتھ کام لے ۔ ہماری ہمدردیاں پوری طرح ہندوستان کے مسلمانوں کے ساتھ ہیں اور ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ان پر مسلسل ظلم و زیادتی کی جارہی ہے ، ظلم و زیادتی ہی نہیں ، بلکہ ان کی نسل کشی کی جارہی ہے ، جو کہ اقوام متحدہ کے چارٹر

کے مطابق بھی جرم ہے، لیکن چونکہ بھارت ایک بڑی طاقت ہے ـــــ اس لیے اس سے یہ نہیں پوچھا جاتا کہ وہ اپنے شہریوں کے ساتھ یہ سلوک کیوں کر رہی ہے؟ ہم یہ چاہتے ہیں کہ دنیا کی رائے عامہ اس معاملے میں بھارت پر اپنا اخلاقی دباؤ ڈال کر اسے اس نسل کشی سے باز رکھنے کی کوشش کرے۔

وِلیم کراے:

اب چند باتیں آپ کی ذاتی زندگی کے بارے میں معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ آپ نے برصغیر پاک و ہند کی سیاست میں ایک بڑا طویل اور مؤثر رول ادا کیا ہے۔ آپ کی سیاسی زندگی کا آغاز کب ہوا؟

مولانا محترم:

میں نے اپنے سیاسی کیریر کا آغاز ۱۹۱۹ئہ میں کیا، جبکہ میری عمر سولہ سال کی تھی۔

وِلیم کراے:

غالباً آپ نے اس دَور میں تحریکِ خلافت میں حصّہ لیا ہوگا اور کیا اس زمانے میں آپ لاہور میں تھے؟

مولانا محترم:

جی ہاں! میں نے تحریکِ خلافت میں حصّہ لیا۔ میں اس زمانے میں دہلی میں تھا۔

وِلیم کراے:

کیا آپ دیوبند سے بھی وابستہ رہے ہیں؟

مولانائے محترم:

نہیں ـــــ میں اصل میں دہلی کا رہنے والا ہوں اور میں نے تعلیم حیدرآباد دکن میں پائی۔ اس کے بعد جب تحریکِ خلافت کا آغاز ہوا، تو

میں دہلی میں تھا۔ میں اس تحریک میں کام کرتا رہا، لیکن بعد میں مجھے محسوس ہوا کہ اس تحریک کے زمانے میں تحریکِ خلافت کے ارکان اور انڈین نیشنل کانگریس کے درمیان جو رابطہ اور تعاون رہا، وہ چلنے والی چیز نہیں ہے، چنانچہ یہی ہوا کہ ۱۹۲۴ء میں کانگریس اور تحریکِ خلافت کا تعلق کٹ گیا۔

ولیم کرالے:

آج کل جب کہ آپ پر جماعتِ اسلامی کی قیادت کی ذمہ داری نہیں ہے۔ آپ کے مشاغل کیا ہیں؟ آپ ایک بزرگ سیاستدان کی حیثیت سے جماعت کی سرگرمیوں میں شریک ہیں یا محض تصنیف و تالیف کا کام کر رہے ہیں؟

مولانائے محترم:

میں اپنی کمزور صحت کی وجہ سے جماعت کی سرگرمیوں اور عملی سیاست میں زیادہ حصہ نہیں لے رہا ہوں۔ بس صرف لکھنے پڑھنے کے کام میں مصروف ہوں۔

ولیم کرالے:

آج کل آپ کیا تصنیف کر رہے ہیں؟

مولانائے محترم:

آج کل میں "لائف آف دی ہولی پرافٹ" پر کام کر رہا ہوں۔ اسے میں ایک نئے طریقے سے لکھنا چاہتا ہوں، جو اس سے پہلے کسی نے اختیار نہیں کیا ہے۔ آج کل میرا سارا وقت اسی کام میں صرف ہو رہا ہے۔

ولیم کرالے:

تب تو یہ ایک طویل کام ہے؟

مولانائے محترم:

جی ہاں۔

ولیم کرالے:

آپ کی اس بارے میں کیا رائے ہے کہ آیا اس قسم کے تصنیفی کام میں تاریخی تحقیق کے جدید اصول اختیار کئے جا سکتے ہیں؟

مولانائے محترم:

آپ تاریخی تحقیق و مطالعہ کے جس ماڈرن سسٹم کا حوالہ دے رہے ہیں۔ میرا خیال یہ ہے کہ اس کے مقابلے میں ہمارے ہاں جو طریقِ تحقیق ہے۔ اس کا ماڈرن ریسرچ سکالرز کو کبھی خیال بھی نہیں آیا ہوگا۔ ہمارے ہاں جس طریقے سے روایات کو تحقیق و جستجو اور چھان پھٹک کے بعد قبول کیا جاتا ہے، اس کا اہتمام کسی دور میں بڑے سے بڑے علمائے تاریخ نے کبھی نہیں کیا۔ ہمارے ہاں روایات کی صحت کو عقلی معیار پر جانچنے کے ساتھ ساتھ ان کی اسناد کی تحقیق کی جاتی ہے اور جب یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ ان کی سند پوری طرح متصل ہے اور اس میں سے کوئی کڑی غائب یا کمزور نہیں ہے۔ تب ان روایات کو قبول کیا جاتا ہے۔ احادیث اور کتب سیرت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب تمام روایات کو اس طریقِ تحقیق پر جانچنے کے بعد ان کو قبول یا رَد کیا جاتا ہے۔ آپ کے موجودہ ریسرچ سکالرز اس طرزِ تحقیق سے بالکل ناآشنا ہیں۔

ولیم کرالے:

میں آپ کا بہت شکر گزار ہوں کہ آپ نے اپنے قیمتی وقت میں سے یہ گراں قدر لمحات مجھے عطاء فرمائے۔ یہ میرے لئے ایک بڑا اعزاز ہے۔ اب میں آپ سے اجازت چاہتا ہوں۔ بہت بہت شکریہ۔

مولانائے محترم:

آپ سے ملاقات میرے لیئے بھی باعثِ مسرت ہے۔

ولیم کراے:

خدا حافظ (یہ الفاظ اُردو میں ادا کیئے گئے)

مولانائے محترم:

خُدا حافظ۔

(بشکریہ ہفت روزہ زندگی لاہور، ۵تا ۱۱ اکتوبر ۱۹۷۹ء)

-●-

یکم جنوری ۱۹۷۶ء

مشہور ناول نگار میاں ایم اسلم صاحب تشریف لائے۔ ان کے ساتھ عابد نظامی صاحب تھے۔ میاں صاحب بہت عمر رسیدہ بزرگ ہیں ۱۹۰۸ء میں انہوں نے میٹرک کیا تھا۔ تقریباً ڈیڑھ سو ناول لکھ چکے ہیں۔ سیرت پاک پر ان کے چار ناول چھپ چکے ہیں۔ اپنی زندگی کے اہم واقعات سناتے رہے۔ اس موقع پر انہوں نے اب تک کی اپنی آخری کتاب "موت کے بعد" مولانائے محترم کو پیش کی۔

۷، جنوری ۱۹۷۶ء

برمنگم (برطانیہ) سے ڈاکٹر محمد صدیق صاحب اور اسی روز کراچی سے الطاف گوہر صاحب نے مُلاقات کی۔ گوہر صاحب کی مُلاقات تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ تک جاری رہی۔

۹، جنوری ۱۹۷۶ء

لائل پور (اب فیصل آباد) سے جامعۂ سلفیہ کے اُستاد علی مُرشد تشریف لائے۔ وہ سعودی ہیں اور جامعۂ سلفیہ میں مبعوث کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔

۱۲، جنوری ۱۹۷۶ء

پروفیسر عبدالقہار صاحب مولانا سے ملنے کے لیے تشریف لائے۔ عراقی ہیں، پاکستان کے دورے پر آئے ہوئے ہیں۔

۱۴ر جنوری ۱۹۷۶ء

محمد محسن لہبل، سفارت خانہ جمہوریہ عربیہ لیبیا، اسلام آباد، مولانا محترم سے ملے۔ سفارت خانے میں ہونے والی کسی تقریب کا دعوت نامہ دینے آئے تھے۔

۱۵ر جنوری ۱۹۷۶ء

مسٹر دہلوی، "عطرِ فتنہ" کے مصنف تشریف لائے اور ملاقات کی۔

۱۷ر جنوری ۱۹۷۶ء

مشتاق حسین صاحب، مولانا محترم سے ملے۔ گوادر میں کوسٹ گارڈ میں ملازم ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ گوادر کی آبادی پچیس ہزار ہے۔ صرف ہوائی سروس آمدورفت کا ذریعہ ہے۔ لوگ بالکل ناخواندہ ہیں۔ مکران میں نہ کوئی سکول ہے اور نہ ہسپتال۔

۲۰ر جنوری ۱۹۷۶ء

ہربنس تنگو اور ان کی اہلیہ ملائیشیا سے پاکستان کی سیاحت کے لیے آئے ہیں۔ غیر مسلم ہیں، مولانا محترم سے ملے۔ اسلام کے بارے میں معلومات حاصل کیں اور کچھ اسلامی لٹریچر بھی خریدا۔ وہ اسلام کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسلام کے لیے ان کا سینہ کھول دے۔

۲۳/ جنوری ۱۹۷۶ء

احسان اللہ، پسرور سے، شمسُ الرحمٰن رُکن جماعت کراچی سے، امان اللہ صاحب ریسرچ اسسٹنٹ پنجاب یونیورسٹی سے، اکرم بٹ سیکنڈ ماسٹر ننکانہ صاحب سے اور خالد بیگ شیخوپورہ سے تشریف لائے۔ ان سب حضرات نے آج مولانا محترم سے مُلاقات کی۔

۲۰/ جنوری ۱۹۷۶ء

عبدالقادر حسن صاحب، مشہور صحافی، نوائے وقت کے کالم نویس ہفت روزہ افریشیا کے ایڈیٹر اور جناب اشرف صبوحی صاحب دونوں حضرات نے ایک ساتھ ملاقات کی ــــــ سیالکوٹ سے دو طالب علم بھی کچھ دیر بعد ملے۔

۲۸/ جنوری ۱۹۷۶ء

حسن اسماعیل صاحب اور نُورالدّین یوسف صاحب فطّانی (Pattani) ملنے کے تشریف لائے۔ زیادہ تر فطّانی کا مسئلہ زیرِ گفتگو رہا۔

۴/ فروری ۱۹۷۶ء

مولانا محمد ذاکر صاحب جامعۂ محمدی شریف جھنگ، ایم۔این۔اے نے مولانا محترم کے نام ایک دستی خط بھیجا ہے جسے جامعہ کے ایک کارکن محمد خالد صاحب لے کر آئے۔

۱۰ر فروری ۱۹۷۶ء

عبدالحمید اسماعیل حمدان عمّان سے آئے ہیں۔ انہوں نے مولانا محترم سے مُلاقات کی۔

۱۳ر فروری ۱۹۷۶ء

تھائی لینڈ کے چار لڑکے ملنے کے لئے آئے۔ تھائی لینڈ کے حالات اور اسلامی تعلیم و تربیت پر گفتگو ہوئی۔

—— ڈاکٹر عبدالجبار شاکر صاحب لیسٹر (Leicester) (برطانیہ) میں کام کرتے ہیں۔ ان دنوں پاکستان آئے ہوئے ہیں۔ تحریک سے وابستہ ہیں، مولانا محترم سے ملنے کے لئے تشریف لائے۔

۱۶ر فروری ۱۹۷۶ء

تحصیل خانیوال، ضلع ملتان سے ۳۰ر افراد پر مشتمل ایک وفد نے ملاقات کی جو ایک گھنٹہ تک جاری رہی۔ سیاسی اور مذہبی مُعاملات پر گفتگو ہوئی۔

۲۰ر فروری ۱۹۷۶ء

اِسلامی جمعیت طلبہ کے زیرِ اہتمام سکھر میں ۶ تا ۸ر فروری کو سہ روزہ کانفرنس ہونے والی تھی۔ اس کانفرنس میں پاکستان بھر کی یونیورسٹیوں، کالجوں اور تعلیمی اداروں کے طلبہ شریک ہو رہے تھے، لیکن عین اس وقت جب کہ اس عظیم اجتماع کا آغاز ہونے والا تھا۔ حکّام بالا نے اجازت نامہ منسُوخ کر دیا۔ پولیس نے اجتماع گاہ میں داخل ہو کر سارا نظام درہم برہم کر دیا اور دُور دراز سے آئے ہوئے طلبہ کو زبردستی ٹرکوں میں بھر بھر کر ریلوے اسٹیشن اور بسوں کے اڈوں پر لا پھینکا۔ یہ پیپلز پارٹی کا دورِ حکومت ہے، یعنی وزیر اعظم بھٹو، وزیر مواصلات ممتاز بھٹو، وزیر اعلیٰ سندھ غلام مصطفیٰ جتوئی اور ان کے مقرر کردہ سندھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر شیخ ایاز کا دورِ اقتدار!

اِسلامی جمعیت طلبہ پاکستان کے اس اجتماع کے لئے مولانائے محترم اپنا پیغام ریکارڈ کرا چکے تھے مگر یہ پیغام وہاں نہ سُنایا جا سکا۔ بعد میں ۲۰ر فروری کو یہ پیغام ہفت روزہ آئین لاہور میں چھپا جسے آئین کے شکریہ کے ساتھ کتاب میں شامل کیا جا رہا ہے:

عزیزانِ من! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'!

"سب سے پہلے میں آپ لوگوں کو اس پر مُبارکباد دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس دورِ فساد و انحطاط میں خدمتِ دین کے جذبے سے نوازا ہے اور اس جذبۂ خیر کو عملی جامہ پہنانے کی توفیق بخشی ہے۔ اس توفیقِ خیر پر آپ جس قدر بھی خوش ہوں اور اللہ تعالیٰ کا شکر بجا لائیں، بجا و

برحق ہے۔ اس موقع پر میں آپ حضرات کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد یاد دلاتا ہوں کہ اِسلام کا آغاز اس حالت سے ہُوا تھا کہ وہ اجنبی تھا اور ایک وقت آئے گا جب وہ پھر اجنبی ہو کر رہ جائے گا پس ایسے اجنبیوں کے لیے خوشخبری ہے، یعنی ان اجنبیوں کے لیے جو اس حالت میں بھی اسلام کا دامن تھامیں اور اس کا عَلَم بلند کرنے کی کوشش کریں۔

ایک زمانہ وہ تھا جب اِسلام کا ڈنکا چار سو بجتا تھا۔ اِسلامی تہذیب وتمدن، اِسلامی اقدار وافکار، اسلام کے اُصول ونظریات ساری دُنیا پر چھائے ہوئے تھے۔ حق و باطل اور خوب و ناخوب کے جو معیار اِسلام نے پیش کیے تھے وہ محض مسلمانوں کے نزدیک نہیں بلکہ غیرمسلموں کے ہاں بھی لائقِ تقلید تھے، لیکن آج صُورتِ حال بڑی حد تک اس کے برعکس ہے۔ اِسلام خود اپنے گھر اور اپنے دیس میں بیگانہ ونامانوس ہو کر رہ گیا ہے۔ مُسلمان فرزندانِ اِسلام بننے کے بجائے فرزند زمین بننے پر اترا رہے ہیں۔ اِسلام کو اپنا سرمایۂ افتخار سمجھنے کے بجائے اپنے کافر و مشرک آباؤ اجداد کے کفر وشرک اور فسق و فجور کو اپنے لیے باعثِ فخر ومباہات قرار دے رہے ہیں۔ اِس طرح کے لوگوں کی تعداد اگرچہ ابھی تک بہت کم ہے لیکن ایسے مسلمانوں کی بدقسمتی کہہ لیجئے یا بے حسی کہ اِس طرح کے نالائق، ناخلف لوگوں کو کفر وضلالت پھیلانے کے بہترین مواقع حاصل ہو گئے ہیں اور برابر ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ یہ

لوگ مسلمانوں بالخصوص ان نوجوان نسلوں کا رشتہ اسلام
کے شاندار ماضی سے کاٹ کر کفر و جاہلیت اور فرسودہ اوہام
وخرافات سے پوری طرح جوڑ دینا چاہتے ہیں۔ ہمارے
ہمسایہ ملک ہندوستان کے بے بس مسلمان جو ظالم اکثریت
سے دبے ہوئے ہیں۔ ان کی غیرت نے کبھی اس کو گوارا
نہ کیا کہ محمد عربی علیہ الصلوٰۃ والسلام اور ابوبکرؓ و عمرؓ،
عثمانؓ و علیؓ اور دوسرے اکابرِ اُمت کو اپنا راہنما اور
مقتدا سمجھنے کے بجائے کرشن، گوتم بدھ، بھیم یا ارجن کو اپنا قومی
ہیرو یا پیشوا قرار دینے لگیں، لیکن پاکستان جو اسلام
کے نام پر معرضِ وجود میں آیا ہے اور جس کے لیے لاکھوں
مسلمانوں نے اپنی جان و مال اور عزت و آبرو کی بے مثال
قربانی دی ہے اس میں بُت پرستانہ اور کافرانہ تہذیبوں
کے باقیات کو اپنے قومی و آبائی ورثے کے طور پر پیش
کیا جا رہا ہے اور صوبائی و لسانی امتیازات کو اُبھارنے
کی ہر ممکن کوشش کی جا رہی ہے۔ صوبہ سندھ بالخصوص
آج کل ان فتنوں کی آماجگاہ بنا ہوا ہے۔ اور جو لوگ یہاں
کفر و الحاد کے علانیہ علمبردار ہیں۔ وہ ہمارے تعلیم یافتہ
نوجوانوں کو اپنے پھندے میں پھانسنے کی کوششیں کر رہے
ہیں۔ اب نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ محمد بن قاسمؒ جیسے
مجاہد فی سبیل اللہ کو غاصب اور ڈاکو اور راجہ داہر جیسے
بدکردار اور کافر و مشرک شخص کو اپنا راہنما و پیشوا قرار دینے
میں کوئی شرم و حیاء محسوس نہیں کی جاتی۔ سندھ میں مسلمانوں
کی آمد اور اسلام کے داخلے کی تاریخ کو جس طرح مسخ کیا

گئی۔ فاتحین کا یہ حسنِ سلوک دیکھ کر مفتوحین دنگ رہ گئے۔ ان میں سے اکثر و بیشتر دائرۂ اِسلام میں داخل ہو گئے۔ اس کے بعد مسلمان مجاہدین نے پیش قدمی کی اور تھوڑے ہی عرصے میں حیدر آباد، سہوان وغیرہ کے علاقے فتح کر لیے۔ اس پورے زمانۂ جہاد میں مُسلمانوں کے پاس ہزاروں کی تعداد میں اونٹ اور گھوڑے تھے جو وہ اپنے وطن سے ہمراہ لائے تھے۔ خورد و نوش اور بود و باش کا سارا سامان بھی انہی پر لدا ہُوا تھا۔ چنے، آٹا، کھجُوریں، منقہ، خشک میوہ وغیرہ اپنے ساتھ رکھتے تھے اور مقامی شہریوں کی آبادیوں کی جان و مال سے کوئی تعرض نہیں کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان علاقوں کے باشندوں نے مسلمانوں کو اپنا محسن و نجات دہندہ سمجھا اور بغیر کِسی قابلِ ذکر مزاحمت کے مسلمان ملتان تک جا پہنچے۔ ان سارے علاقوں میں اب تک کھجُور کے درختوں کی قطاریں اور نخلستان موجود ہیں جو ہمارے دلوں میں ان مجاہدین کی یاد تازہ کرتے ہیں۔

سندھی معاشرت اور رہن سہن پر اب بھی اِسلامی تہذیب کے گہرے نقوش ثبت ہیں۔ سندھی زبان پہلے ہندی زبان سے ملتی جُلتی تھی۔ مسلمانوں کی آمد پر اس کا رسمُ الخط نستعلیق عربی ہو گیا اور اس میں عربی اور فارسی الفاظ کثیر تعداد میں داخل ہو گئے۔ سندھ نے بیشمار لوگ عربی بولنے اور لکھنے والے پیدا کیے بلکہ انہوں نے عربی زبان و ادب اور علُوم و فنون میں ایسی مہارت حاصل کی کہ وہ عربی النسل مُسلمانوں کے لیے باعثِ رشک بن گئے۔

جا رہا ہے۔ اسے دیکھتے ہوئے یہ مناسب سمجھتا ہوں کہ اس کا ایک مختصر مگر صحیح خلاصہ آپ کے سامنے پیش کر دوں۔
سندھ کو بجا طور پر بابُ الاسلام کہا جاتا ہے۔ کیونکہ پُورے برصغیر پاک و ہند میں یہی وہ خوش قسمت خطۂ زمین ہے جس پر مسلمانوں کے قدم سب سے پہلے پڑے۔ پہلی صدی ہجری میں مختلف عرب تاجر اور جہاز ران سندھ اور مکران میں آکر یہاں اِسلام کی تبلیغ و تلقین کرتے رہتے تھے۔ انہی میں سے ایک قافلہ بنواُمیہ کے خلیفہ ولید بن عبدالملک کے عہد میں عرب کی طرف واپس جا رہا تھا کہ سندھ کے ساحل کے قریب راجہ داہر نے اپنے آدمیوں کے ذریعے ان پر حملہ کرا دیا اور ان کو سامان سمیت گرفتار کر لیا۔ ولید تک جب یہ خبر پہنچی تو محمد بنؒ قاسم کو ایک مختصر لشکر کے ساتھ روانہ کیا۔ محمد بن قاسم کی عمر اس وقت صرف سترہ سال کی تھی۔ غالباً وہ دُنیا کے کم سن ترین جرنیلوں میں سے تھا جنہیں ایسی دور دراز مہم پر روانہ کیا گیا۔ داہر کا پایۂ تخت دیبل ایک نہایت مضبوط قلعہ تھا۔ مسلمان جب ساحلِ سندھ پر اُترے تو سخت گرمی کے دن اور رمضان کا مہینہ تھا۔ روزے کے ساتھ مُجاہدین نے پہلے سَاحلی علاقہ فتح کیا اور پھر دیبل پہنچ کر اسے مُحاصرے میں لے لیا اور دس رمضان کو قلعے کی دیواریں مسمار کر کے اسے فتح کر لیا۔ داہر لڑائی میں مارا گیا۔ لڑائی میں جتنے آدمی گرفتار ہوئے ان میں سے اکثر کو رِہا کر دیا گیا۔ شہر کے لوگوں کو امن و امان دی گئی۔ کوئی گھر نہیں لوٹا گیا۔ کسی عورت کی عصمت خراب نہیں کی

عرب کے مسلمانوں نے سندھی مسلمانوں کی تربیت کی اور ان کی فطری صلاحیتوں کو اُبھارا۔ ہاری کا لفظ جو سندھ میں کاشت کار کے لیے مستعمل ہے وہ دراصل عربی کا لفظ "حارث" ہے جس کے معنی کھیتی باڑی کرنے والے کے ہیں۔

یہ ایک مسلمہ تاریخی حقیقت ہے کہ مسلمان جزیرۃ نماء عرب سے لے کر جس ملک میں بھی پہنچے، مربی، معلم اور مصلحین کر پہنچے۔ وہاں کے لوگوں کو کفر و جہالت کی تاریکی سے نکال کر ایمان، شائستگی اور فراست سکھانے کا باعث بنے۔ سندھ کا صوبہ اس لحاظ سے نہایت خوش قسمت تھا کہ یہاں اِسلام کا جانفزا پیغام سرزمینِ ہند میں سب سے پہلے پہنچا اور اب یہ اہلِ سندھ کی بڑی بدقسمتی اور بدنصیبی ہوگی کہ وہ اپنے اس روشن ماضی کی طرف پلٹنے، اور اس سے اپنا رابطہ استوار کرنے کے بجائے پانچ ہزار سال پہلے کے تاریک دَور سے اپنا تعلق جوڑیں۔ اپنا ماضی موہنجودڑو کے کھنڈرات میں تلاش کریں اور اپنا نسب راجہ داہر سے ملانے میں کوئی شرم وحیا محسوس نہ کریں۔

یہ باتیں مَیں سندھ کے مسلمانوں اور غیور نوجوانوں کو چونکانے کے لیے کہہ رہا ہوں۔ ورنہ مجھے یقین ہے کہ جس طرح سندھ پہلے بابُ الاسلام تھا۔ اس طرح ہمیشہ اِنشاء اللہ بابُ الاسلام رہے گا اور جو لوگ اس میں نقب لگانے کی کوشش کر رہے ہیں وہ آخر کار منہ کی کھائیں گے اور جو اسے دارُالاسلام کے بجائے محض سندھو دیش بنانا چاہتے

ہیں۔ ان کا حشر اس سے زیادہ عبرتناک ہوگا جتنا عبرتناک مشرقی پاکستان کو بنگلہ دیش بنانے والوں کا ہوا ہے۔ اِس طرح کے فتنہ پردازوں، ان کے اُستادوں اور سرپرستوں کی رسّی اللہ تعالیٰ نے محض مسلمانوں کے اخلاص کو آزمانے کے لیے دراز کر رکھی ہے اور اللہ تعالیٰ یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ ان غیر اسلامی حرکات کا مقابلہ کرنے میں وہ کس حد تک تدبیر اور جانفشانی سے کام لیتے ہیں۔

ایسے مواقع پر عزیمت دکھانے والوں کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بشارت دی ہے کہ میری اُمت میں سے ایک گروہ ہمیشہ حق پر استوار رہے گا اور اس کے مخالفین اس کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکیں گے، یہاں تک کہ قیامت آجائیگی اور وہ اپنے موقفِ حق پر ڈٹے رہیں گے۔ میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک خوشخبری سے کلام کا آغاز کیا تھا۔ اور دوسری پر اختتام کر رہا ہوں اور اللہ تعالیٰ سے دُعا کرتا ہوں کہ وہ آپ کو ان کا مصداق بنائے اور آخر دم تک خدمتِ دین اور نصرتِ حق کی توفیق بخشے۔"

۲۸ر فروری ۱۹۷۶ء

۱۔ جہانذیب صاحب (تھانہ کوٹ، صوبہ سرحد) محترم میاں طفیل محمد صاحب کی معیت میں تشریف لائے اور مولانا محترم سے ملے۔

۲۔ نورالدین میر واعظ صاحب، راولپنڈی سے، سلیم صاحب لائل پور سے اور ایک طالب علم کراچی سے، ان تینوں نے الگ الگ ملاقات کی۔ میر واعظ صاحب کا مولانا محترم کے ساتھ مراسلت کا سلسلہ رہتا ہے۔ اور کبھی کبھار مُلاقات کے لیے تشریف لاتے ہیں۔

۲۹/ فروری ۱۹۷۶ء

ریاض یونیورسٹی (سعودی عرب) کے ۴۹ طلبہ اور ۵ اساتذہ جو پاکستان کی سیاحت کے آئے ہوئے ہیں آج مولانا محترم سے ملنے کے لیئے تشریف لائے۔ چونکہ وقت پہلے سے طے تھا اس لیے کچھ مقامی رفقاء بھی جمع ہو گئے تھے اور اس طرح ایک تقریب کی شکل بن گئی۔

۴/ مارچ ۱۹۷۶ء

۱۔ مولانا مظفر حسین ندوی صاحب مظفر آباد (آزاد کشمیر) سے تشریف لائے۔

۲۔ لائل پور کے چند طلبہ نے بھی ملاقات کی۔

۵/ مارچ ۱۹۷۶ء

۱۔ بریگیڈیر محمد اکرم خاں (ریٹائرڈ) نے مولانا سے ملاقات کی۔

۲۔ ایک بھارتی ہندو جو ایک عرصہ سے امریکہ میں ہے اور وہیں کا شہری ہے آج مولانا سے ملا۔ مذاہب پر مختصر گفتگو ہوئی۔ تفصیلی گفتگو کے لیئے آئندہ کسی وقت آنے کا اظہار کیا۔ مولانا محترم کے کمرہ میں داخل ہوا تو ہندوانہ عقیدے کے مطابق کورنش بجالایا۔

۱۶/ مارچ ۱۹۷۶ء

قاضی سید ظہیر الحسن صاحب رکن جماعت اسلامی ہند، دہلی، ڈاکٹر محمد یعقوب امیر جماعت بہاولپور، کی معیت میں مولانا محترم سے

ملنے کے لئے تشریف لائے۔

۱۷/ مارچ ۱۹۷۶ء

حبیب الرحمن، حفظ الرحمن، کلیم اللہ صاحبان بنوں سے، جماعت کے متفقین ہیں۔ ملنے کے لئے تشریف لائے۔

۱۸/ مارچ ۱۹۷۶ء

محمد افتخار (ریٹائرڈ کرنل)، محمد اقبال (ریٹائرڈ کرنل) دونوں بھائی ہیں۔ نوشہرہ، ضلع سرگودھا سے تعلق رکھتے ہیں۔ انہوں نے مولانا محترم سے تقریباً ایک گھنٹہ ملاقات کی۔

مؤخر الذکر محمد اقبال صاحب اب تحریکِ اِسلامی کے رُکن ہیں۔ اور نئے ضلع خوشاب کے امیر ہیں۔

۲۰/ مارچ ۱۹۷۶ء

محمد نواز نیازی صاحب، اسسٹنٹ سیکرٹری ہلالِ احمر پنجاب، مولانا سے ملے۔

۲۲/ مارچ ۱۹۷۶ء

حافظ آباد کی جماعت کا ایک وفد مُلاقات کے لیے آیا۔

۲۳/ مارچ ۱۹۷۶ء

پشاور یونیورسٹی کے طلبہ کا سہ رُکنی وفد، اور کیمبل پور (اب اٹک) سے دو آدمی مولانا سے ملے۔

۲۵ مارچ ۱۹۷۶ء

آج عصر کی مجلس اس لحاظ سے بڑی دلچسپ رہی کہ اس میں مختلف زبانیں اظہارِ خیال کا وسیلہ بنیں۔ جماعتِ اسلامی سری لنکا کا سہ رُکنی وفد وہاں کے امیر جناب ابراہیم صاحب کی قیادت میں پاکستان آیا ہُوا ہے۔ یہ حضرات بھی مجلس میں موجود تھے۔ جناب ابراہیم صاحب انگریزی کے علاوہ عربی بھی خوب روانی سے بول رہے تھے، مگر ان کے دونوں ساتھی صِرف انگریزی میں گفتگو کرتے تھے۔
افغانستان کے کچھ لوگ فارسی میں گفتگو کر رہے تھے۔ مولانا محترم نے ان سب حضرات کے ساتھ باری باری کبھی عربی میں، کبھی انگریزی میں اور کبھی فارسی میں گفتگو کی۔

۳۰ مارچ ۱۹۷۶ء

آدھی کوٹ، تحصیل و ضلع خوشاب کے کارکنانِ جماعت کا سترہ رُکنی وفد صبح ۱۱ بجے مولانا سے مِلا۔ سیاسی و مذہبی مسائل پر گفتگو ہوتی رہی ـــــ عصر کے بعد پشاور یونیورسٹی کے تیس پنتیس طلبہ مُلاقات کے لیے آئے۔ دس پندرہ طالبات بھی مُلاقات کے لیئے آئیں۔ جن سے گھر میں بیگم صاحبہ کے ذریعے سے مُلاقات ہوئی۔

یکم اپریل ۱۹۷۶ء

مولانا ظفر احمد انصاری صاحب ایم۔این۔اے دوپہر کو تقریباً بارہ بجے ملنے کے لیے تشریف لائے۔

۲؍اپریل ۱۹۷۶ء

۱۔ اوکاڑہ سے پچاس رکنی وفد مولانا محترم سے ملا۔ عصر کے بعد نشست رہی۔ اسی دوران میں چند عرب طلبہ آ گئے۔ جنہوں نے مولانا محترم سے بہت سے سوالات کیے اور ان کے جوابات حاصل کیے۔ یہ سوالات و جوابات عربی میں تھے۔ بہت ہی پُرلطف گفتگو رہی۔

۲۔ مغرب کے بعد کراچی کے طلبہ کا ۲۰؍ رکنی وفد مولانا سے ملنے کے لیے آیا۔

۳۔ کچھ دیر بعد روزنامہ وفاق کے مالک و ایڈیٹر مصطفیٰ صادق صاحب بھی مولانا سے ملے۔

۴؍اپریل ۱۹۷۶ء

محمد صلاح الدین صاحب (ایڈیٹر روزنامہ جسارت)، جاوید ہاشمی صاحب اور مجیب الرحمٰن شامی صاحب تینوں ایک ساتھ ملنے کے لیے تشریف لائے۔

۵؍اپریل ۱۹۷۶ء

نمازِ عصر کے بعد محمد عباس عباسی گورنر سندھ کے بھائی ملاقات کے لیے تشریف لائے۔

۱۴/ اپریل ۱۹۷۶ء

۱۔ قاضی محمد شفیع، جنرل سیکرٹری کینسر ایسوسی ایشن ملنے کے لیے آئے۔

۲۔ ڈاکٹر مسعود الملک میر پور خاص شوگر ملز کے ڈپٹی چیف کیمسٹ تشریف لائے۔

۱۸/ اپریل ۱۹۷۶ء

واہ کینٹ حسن ابدال سے چالیس افراد پر مشتمل ایک وفد ملاقات وزیارت کے لیئے آیا۔

۲۱/ اپریل ۱۹۷۶ء

یوسف مرزا، نیوکیسل (انگلستان)، اور دوبئی سے ایک بزرگ ملاقات کے لیئے تشریف لائے۔ دونوں حضرات پاکستانی ہیں۔

۲۸/ اپریل ۱۹۷۶ء

جنرل ریٹائرڈ تجمل حسین صاحب ملنے کے لیئے آئے۔ تقریباً ایک گھنٹہ تک ملاقات رہی۔

۲۹/ اپریل ۱۹۷۶ء

شیخ عبدالرحمٰن صاحب اسسٹنٹ ڈائریکٹر انٹیلی جنس مولانا محترم سے ملے۔

—

یکم مئی ۱۹۷۶ء

جناب الطاف گوہر صاحب نے مولانا محترم سے مُلاقات کی۔

۴؍ مئی ۱۹۷۶ء

مولانا قاضی فضل سبحان صاحب خطیب جامع مسجد بٹ خیلہ (مالاکنڈ ایجنسی) ملنے کے لیے تشریف لائے۔

۱۳؍ مئی ۱۹۷۶ء

ریاست دیر کے سہ رُکنی وفد نے ملاقات کی۔

۱۵؍ مئی ۱۹۷۶ء

۱۔ وزیر عالم صاحب واہ فیکٹری میں الیکٹریکل آفیسر ہیں، مُلاقات کے لیے آئے۔

۲۔ مسٹر ایم انور بار ایٹ لاء، مسئلہ زکوٰۃ پر مولانا محترم کے ساتھ ایک گھنٹہ تک گفتگو کرتے رہے۔ انہیں کچھ اشکالات تھے۔ مولانا محترم نے تفصیل سے ان کی وضاحت فرمائی۔

۱۹؍ مئی ۱۹۷۶ء

چھوٹے رینک کے دو فوجی حضرات مُلاقات کے لیۓ آئے۔

۲۲؍ مئی ۱۹۷۶ء

اقبال اعجاز چودھری، برمنگھم (برطانیہ) میں ملازمت کرتے ہیں۔

مولانا محترم سے ملے اور وہاں کے بارے میں مشورے اور ہدایات لیں۔

۲۹؍ مئی ۱۹۷۶ء

۱۔ بشیر احمد صاحب، ۴۴ ؍ بے گلبرگ ز ۳، (سابق سفیر پاکستان تنزانیہ و سابق جج آفیسر مولانا محترم سے ملے۔
۲۔ کرنل ریٹائرڈ سلامت اللہ صاحب نے بھی آج مُلاقات کی۔

۲؍ جون ۱۹۷۶ء

جنرل تجمل حسین صاحب نے مُلاقات کی۔

۵؍ جون ۱۹۷۶ء

احمد حُسن صاحب، شُو مرچنٹ بڑا بازار رام پور انڈیا نے مولانا سے مُلاقات کی۔ جماعتِ اسلامی ہند کے رہنماؤں کی گرفتاریوں اور وہاں کے حالات پر تفصیل سے گفتگو کی۔

۱۴؍ جون ۱۹۷۶ء

صاحبزادہ عبدالرحمٰن (جامعۂ اشرفیہ لاہور) اور مولانا ابوالخیر علوی صاحب مولانا محترم سے مُلاقات کے لیے تشریف لائے۔ کچھ دیر مُلاقات رہی۔

۲۱؍ جون ۱۹۷۶ء

جناب حشمت اللہ خاں ڈی۔ ایس۔ پی گلگت، مولانا سے ملے

انہوں نے وہاں کے حالات بیان کیے۔

۲۲ / جون ۱۹۷۶ء

عبدالرشید صاحب کیلیفورنیا (امریکہ) میں ملازمت کرتے ہیں۔ مولانا محترم سے ملے۔

اخلاق حسین صاحب، جنرل مینیجر، اِسلامک پبلیکیشنز لاہور، کی معیت میں مولانا سے ملے۔

ڈاکٹر عبداللہ چغتائی صاحب مسجد شہداء کے مقدمہ کے سلسلے میں مولانا محترم سے مشورے کے لیئے آئے۔ ڈاکٹر صاحب نے مقدمہ دائر کر رکھا ہے کہ مسجد شہداء کا ڈیزائن مساجد سے بالکل مختلف اور گرجا گھروں سے مشابہت رکھتا ہے، بالخصوص اس کے مینار تو بالکل ہی گرجا گھروں کی طرح ہیں۔ اِس لیے مسجدِ انتظامیہ کو ہدایت کی جائے کہ وہ اس تشابہہ کو دُور کرے اور اسے مساجد کی تعمیرات سے ہم شکل بنائے۔

۱۳ / جولائی ۱۹۷۶ء

عزت حسین عابدی صاحب، نیشنل بنک کے لیبر لیڈر، کراچی، نے مُلاقات کی، نیز بہاولنگر سے تین طالب علم بھی ملنے کیلئے آئے۔ اور آج ہی ریٹائرڈ جنرل امراؤ خاں صاحب نے بھی مُلاقات کی۔

۱۸ / جولائی ۱۹۷۶ء

شکورُالدین ایڈووکیٹ، کراچی اور ان کے ساتھی مولانا سے ملے۔

۱۹/ جولائی ۱۹۷۶ء

محمد صائح صاحب ٹیونس سے، پاکستان آئے ہوئے ہیں۔ مولانا سے ملنے کے لیئے تشریف لائے۔

۲۲/ جولائی ۱۹۷۶ء

ڈاکٹر عاصم حسین صاحب نے مع اہل وعیال مولانا سے مُلاقات کی۔ بھارتی مسلمان ہیں، امریکہ میں کام کرتے ہیں۔ تحریک سے وابستہ ہیں

۲۳/ جولائی ۱۹۷۶ء

۱۔ ڈاکٹر عاصم حسین صاحب کے ساتھ آج عتیق الرحمٰن صاحب ملنے کے لیئے آئے تھے۔
۲۔ حنیف رامے صاحب، سابق وزیر اعلیٰ پنجاب مولانا محترم سے ملے۔ یہ مُلاقات پونے دو گھنٹے جاری رہی۔

۲۱/ اگست ۱۹۷۶ء

احمد علی شاہ، واشنگٹن میں وَرلڈ بنک میں کام کرتے ہیں، ملنے کے لیے آئے۔

۲۳/ اگست ۱۹۷۶ء

۱۔ نواب خاں صاحب، کالا باغ اور محمُود جیلانی صاحب ملنے کے لیے تشریف لائے۔
۲۔ آج ہی مسرت حسین صاحب بھی ملے۔ آپ دبئی میں کاروبار

کرتے ہیں۔

۲۵/ اگست ۱۹۷۶ء

۱۔ لیفٹیننٹ کرنل اطہر حسن صاحب (پاکستان آرمی) مولانا محترم سے ملے۔

۲۔ آج ہی جہلم سے صبح صادق ایڈووکیٹ اپنے ایک ساتھی کے ساتھ مولانا محترم سے ملے۔

۲۶/ اگست ۱۹۷۶ء

چودھری معین الدین، مشرقی پاکستان سے ہیں اور لندن میں مقیم ہیں، ملنے کے لیے تشریف لائے۔

۲۷/ اگست ۱۹۷۶ء

صاحبزادہ عبیداللہ صاحب (جامعۂ اشرفیہ لاہور کے مہتمم) نیز ایک فوجی میجر اپنے ایک ساتھی کیساتھ تشریف لائے۔

۱۳/ستمبر ۱۹۷۶ء

پروفیسر غلام محمد صاحب، علی گڑھ یونیورسٹی انڈیا، پاکستان آئے ہوئے ہیں۔ مولانا محترم سے ملاقات کے لیے تشریف لائے۔

۹/اکتوبر ۱۹۷۶ء

عبداللہ داؤد صاحب، نومسلم ہالینڈ، مولانا سے ملے۔

(Kerzers Gracht 393 Amsterdam, Holland)

۱۲/اکتوبر ۱۹۷۶ء

محبوب گلگتی صاحب، مدینہ یونیورسٹی میں طالب علم ہیں۔ گلگت کے رہنے والے ہیں۔ مُلاقات کے لیے آئے۔

۱۵/اکتوبر ۱۹۷۶ء

۱۔ کمالیہ، ضلع لائلپور سے دس رُکنی وفد نے ملاقات کی۔
۲۔ شورش کاشمیری مرحوم کے صاحبزادہ مسعود شورش بھی آج مولانا محترم سے ملے۔

۱۶/اکتوبر ۱۹۷۶ء

۱۔ تین عرب باشندے اور دو سوڈانی طالب علم ملے۔
۲۔ آج ہی مسٹر اے کے بروہی صاحب نے مُلاقات کی۔

۲۱/اکتوبر ۱۹۷۶ء

شفیق الرحمٰن صاحب جنرل سیکرٹری ینگ مُسلم ایسوسی ایشن، ٹوکیو،

جاپان، مولانا محترم سے ملے۔

۳۱/ اکتوبر ۱۹۷۶ء

داؤد خیل، ضلع میانوالی سے بیس افراد پر مشتمل کارکنان کا ایک وفد مُلاقات کے لیئے آیا۔ مولانا محترم نے ان کے سوالات کے جوابات دیئے اور مختصر ہدایات دیں۔

۲/ نومبر ۱۹۷۶ء

۱۔ ملک غلام جیلانی صاحب نے ملاقات کی۔

۲۔ آج ہی بہاولپور سے چار طلبہ نے بھی مُلاقات کی۔

۳/ نومبر ۱۹۷۶ء

کراچی سے پچیس لڑکوں کا ایک گروپ مُلاقات کے لیئے آیا۔

۷/ نومبر ۱۹۷۶ء

۱۔ زرعی یونیورسٹی لائل پور (اب فیصل آباد) کی اِسلامی جمعیت طلبہ کے نومنتخب تین عہدیداران مولانا محترم سے ملے۔ دُعائیں اور ہدایات لیں۔

۲۔ آج ہی نور محمد صاحب، لطیف آباد، حیدر آباد سندھ، بھی مولانا محترم سے ملے۔

۸/ نومبر ۱۹۷۶ء

پانچ افراد پشاور سے مُلاقات کے لیئے آئے۔

۲۴ / نومبر ۱۹۷۶ئہ

مدرسہ اشاعت العلوم لائل پور کے ۲۰ / طلبہ، مولانا عبدالمالک (رکن جماعت) کی قیادت میں مولانا محترم سے ملنے کے لیے آئے۔ ۱۱ بجے دن مولانا محترم نے ان سے مُلاقات کی، سوالوں کے جوابات دیے اور کچھ مشورے اور ہدایات دیں۔

۱۴ / دسمبر ۱۹۷۶ئہ

محمد رفیق اشرفی صاحب (رکن جماعت لاہور) کے ساتھ اسلامی جمعیت طلبہ کے چند طالب علم مولانا سے ملے۔

۱۵ / دسمبر ۱۹۷۶ئہ

لیفٹیننٹ اے کے ایم ناظم عثمان صاحب (نیوی) مولانا سے ملے۔ دُعائیں اور ہدایات لیں۔

۲۔ آج ہی لالۂ صحرائی صاحب (محمد صادق) جہانیاں ضلع ملتان، مولانا محترم سے ملے۔

۱۸ / دسمبر ۱۹۷۶ئہ

سردار علی بہادر عباسی صاحب (ایبٹ آباد) نے مولانا محترم سے مُلاقات کی۔

۲۴ / دسمبر ۱۹۷۶ئہ

ڈاکٹر احمد علی صاحب پشاور، اور سوات کے چار صاحبان نے

ملاقات کی۔

۲۵/ دسمبر ۱۹۷۶ء

سول ملازمین آفیسرز کا ایک وفد مولانا محترم سے مِلا۔ انہوں نے اپنے بعض مسائل پیش کیے اور ہدایات لیں۔ وفد میں درج ذیل حضرات شامل تھے:

i۔ ملک مرتضیٰ شاہین صاحب۔

ii۔ محمد اکرم صاحب۔

iii۔ پروفیسر عبدالصمد صاحب۔

iv۔ رانا عطاءاللہ صاحب۔

v۔ ڈاکٹر مقبول شاہد صاحب۔

vi۔ محمد داؤد صاحب۔

vii۔ ڈاکٹر خان محمد صابری صاحب۔

۳۱/ دسمبر ۱۹۷۶ء

۱۔ پشاور یونیورسٹی کے چار طالب علم اور سوات کے پانچ حضرات تشریف لائے۔ دونوں گروپوں نے الگ الگ مُلاقات کی۔

۲۔ محمد اشرف صاحب جو ڈنمارک سے آئے ہیں ــــ آج مولانا محترم سے مِلے۔

۲۵/ جنوری ۱۹۷۷ء

بیگم حنیف رامے نے آج مولانا محترم سے مُلاقات کی۔

—

۲۷؍جنوری ۱۹۷۷ء

آج چند وکلاء نے مُلاقات کی۔ حالاتِ حاضرہ اور وکلاء کے مسائل پر گفتگو ہوئی۔ اس سہ رُکنی وفد میں ایس ایم ظفر، چودھری محمد اسماعیل ایڈووکیٹ اور مسٹر ارشاد قریشی ایڈوکیٹ شامل تھے۔

۱۶؍فروری ۱۹۷۷ء

آج ایک کنیڈین نے مولانا محترم سے مُلاقات کی۔

۱۸؍فروری ۱۹۷۷ء

غلام احمد ملہی، سابق سپرنٹنڈنٹ جیل نے مُلاقات کی۔ مولانا محترم کے زمانۂ اسیری سے آشنا اور عقیدت مند ہیں۔

۱۹؍فروری ۱۹۷۷ء

کیتھو مک چرچ ویٹیکن سٹیٹ سکرٹریٹ کے سیکرٹری برائے غیر عیسائی مذاہب (Mr Mansignor Pietro Rossano) نے مولانا محترم سے ملاقات کی۔ ان کے ساتھ لاہور چرچ کے انچارج ڈاکٹر بٹلر تھے۔ مذاہب، بالخصوص عیسائیت اور اسلام پر گفتگو رہی۔ یہ مُلاقات سوا گھنٹہ جاری رہی۔

۱۹؍فروری ۱۹۷۷ء

مشتاق احمد صدیقی صاحب کراچی سے تعلق رکھتے ہیں۔ لندن (برطانیہ) میں ملازم ہیں، آج مولانا سے ملے۔

۲۷/ فروری ۱۹۷۷ء

سردار عبدالرحمٰن خاں درانی صاحب، سابق سپرنٹنڈنٹ پولیس نے مولانا محترم سے مُلاقات کی۔

-●-

۳/مارچ ۱۹۷۷ء

"گارڈین" کے نمائندے نے الیکشن اور موجودہ ملکی حالات پر انٹرویو لیا۔

۴/مارچ ۱۹۷۷ء

ریٹائرڈ میجر احمد علی صاحب نے مولانا سے مُلاقات کی۔

۱۱/مارچ ۱۹۷۷ء

شیخ عبدالرحمٰن صاحب، اسسٹنٹ ڈائرکٹر سنٹرل اِنٹیلی جینس پاکستان، نے مُلاقات کی۔

۱۴/مارچ ۱۹۷۷ء

حامد محمُود صاحب چیئرمین نیشنل پریس ٹرسٹ نے تقریبًا بیس منٹ مُلاقات کی۔ ان کے جانے کے بعد پرائم منسٹر ہاؤس سے فون آیا کہ وہ کہاں ہیں؟ پرائم منسٹر (مسٹر بھٹو) ان سے بات کرنا چاہتے ہیں۔

۱۵/مارچ ۱۹۷۷ء

جنرل فضل مقیم صاحب نے مُلاقات کی۔

۱۶/مارچ ۱۹۷۷ء

۱۔ حامد محمُود چیئرمین پریس ٹرسٹ نے آج پھر مُلاقات کی۔
۲۔ آج ہی بشیر احمد صاحب سابق سفیر پاکستان برائے تنزانیہ

نے بھی مُلاقات کی ۔ وہ کچھ عرصہ پہلے بھی ملاقات کر چکے ہیں۔

۱۷/ مارچ ۱۹۷۷ء

میاں مشتاق احمد گرمانی (سابق گورنر پنجاب)، ملاقات کے لئے تشریف لائے۔ یہ ملاقات ڈیڑھ گھنٹہ تک جاری رہی۔

۱۹/ مارچ ۱۹۷۷ء

مولانا ظفر احمد انصاری صاحب نے ملاقات کی جو سوا گھنٹہ تک جاری رہی۔

۲۹/ مارچ ۱۹۷۷ء

نوائے وقت کے مجید نظامی صاحب نے مولانا محترم سے ملاقات کی۔

۳/ اپریل ۱۹۷۷ء

اکبر بگٹی صاحب سابق گورنر بلوچستان نے ملاقات کی۔

۴/ اپریل ۱۹۷۷ء

پیر پگاڑا صاحب تشریف لائے، نوابزادہ نصراللہ خاں ان کے ساتھ تھے۔

۶/ اپریل ۱۹۷۷ء

۱۔ مجید نظامی صاحب مُلاقات کے لیے تشریف لائے۔ مصطفیٰ صادق

صاحب ان کے ساتھ تھے۔
۲۔ آج ہی ایک جرمن پادری بھی مولانا سے ملے۔

۱۳/ اپریل ۱۹۷۷ء

مسٹر انڈرووٹلے نمائندہ بی بی سی نے تقریباً آدھ گھنٹہ مُلاقات کی۔

۱۵/ اپریل ۱۹۷۷ء

پاکستان کے وزیر اعظم مسٹر ذوالفقار علی بھٹو صاحب نے رات کو (بعد از نماز عشاء) ملاقات کی جو تقریباً ایک گھنٹہ جاری رہی، مولانا محترم نے انہیں وزارتِ عظمیٰ سے مستعفی ہو جانے کا مشورہ دیا۔

۱۷/ اپریل ۱۹۷۷ء

۱۔ جنرل شیر علی خاں صاحب مُلاقات کے لیے تشریف لائے۔
۲۔ آج ہی راجہ حق نواز صاحب ایڈووکیٹ، کراچی اور کراچی بار کے صدر نظام صاحب نے مولانا محترم سے مُلاقات کی۔

۱۹/ اپریل ۱۹۷۷ء

جلال پور جٹاں (ضلع گجرات) کا تین رُکنی وفد ملا۔

۲۱/ اپریل ۱۹۷۷ء

۱۔ کرنل ریٹائرڈ عبدالرشید صاحب ملے۔
۲۔ سعید اختر صاحب سابق سفیر سعودی عرب حال کنیڈا، نے بھی مُلاقات کی۔

۲۹/اپریل ۱۹۷۷ء

غلام مصطفیٰ کھر وزیرِ اعلیٰ پنجاب نے مُلاقات کی۔

۲/مئی ۱۹۷۷ء

۱۔ میاں محمود علی قصوری صاحب نے مولانا محترم سے ملاقات کی۔
۲۔ کراچی اور بعض دوسرے مقامات سے مختلف گروپوں نے بھی مُلاقات کی۔

۵/مئی ۱۹۷۷ء

۱۔ میاں مشتاق احمد گرمانی صاحب (سابق گورنر پنجاب) نے بھی آج مُلاقات کی۔
۲۔ ایس ایم ظفر سابق مرکزی وزیر قانون پاکستان نے بھی آج پھر مُلاقات کی۔

۱۰/مئی ۱۹۷۷ء

۱۔ مسعود کھدرپوش، صاحبزادہ عبدالرحمٰن (جامعہ اشرفیہ لاہور) کی معیت میں تشریف لائے اور مولانا محترم سے مُلاقات کی۔
۲۔ آج ہی مجید نظامی صاحب نے بھی مُلاقات کی۔

۱۶/مئی ۱۹۷۷ء

غلام مصطفیٰ کھر نے آج پھر ملاقات کی۔

۱۸ر مئی ۱۹۷۷ء

جناب پیر کرم شاہ صاحب سجادہ نشین بھیرہ، ضلع سرگودھا (جسٹس شرعی وفاقی عدالت کی اپیلیٹ کورٹ) نے مُلاقات کی۔ دورانِ ملاقات ان کے ہمراہ عابد نظامی بھی تھے۔

۱۹ر مئی ۱۹۷۷ء

مسٹر ایس ایم ظفر (سابق مرکزی وزیرِ قانون) اور مسٹر ایم انور بار ایٹ لاء نے الگ الگ ملاقات کی۔

۲۱ر مئی ۱۹۷۷ء

۱۔ سردار عبدالقیوم صاحب، سابق صدر آزاد کشمیر نے ملاقات کی۔

۲۔ آج ہی فضل الرحمٰن صاحب مجددی (افغانستان) نے بھی ملاقات کی۔ آپ ملا شور بازار کے پوتے ہیں۔ اور لاہور میں مہاجرت کی زندگی گزار رہے ہیں۔

۲۲ر مئی ۱۹۷۷ء

آج پھر جناب ایم انور بار ایٹ لاء نے ملاقات کی۔

۱۱ر جون ۱۹۷۷ء

۱۔ محمد اشرف صاحب مانچسٹر برطانیہ سے آئے ہوئے ہیں،

پاکستانی ہیں، مولانا سے ملے۔ اور وہاں کے حالات بیان کیے۔
۲۔ آج دوسری مرتبہ شیخ عبدالرحمٰن صاحب اسسٹنٹ ڈائریکٹر سنٹرل انٹیلی جینس نے ملاقات کی۔

۱۶/ جون ۱۹۷۷ء

۱۔ لیفٹیننٹ کرنل رونق علی صاحب نے مُلاقات کی۔ ذاتی کام کے سِلسلہ میں مشورہ کیا۔
۲۔ کرنل سُلطان خاں جہلم، اور جنرل شیر علی خاں صاحب نے الگ الگ مُلاقات کی۔

۲۰/ جون ۱۹۷۷ء

جناب اے کے بروہی صاحب ملاقات کے لیے تشریف لائے۔

۲۵/ جون ۱۹۷۷ء

گوجرانوالہ کا ۱۲، ۱۴ آدمیوں کا ایک گروپ مولانا سے ملا۔

۲۹/ جون ۱۹۷۷ء

پیر محبُ الحق صاحب، پیر جھنڈا حیدر آباد تشریف لائے۔

۵ر جولائی ۱۹۷۷ء

صبح چھ بجے کی خبروں سے معلوم ہوا کہ مسٹر بھٹو کی حکومت معزول کر دی گئی ہے اور فوج نے ملک کا انتظام سنبھال لیا ہے۔ اس اہم واقعہ کے متعلق اپنے تاثرات کا اظہار کرنے کے لیے لوگ صبح ہی مولانا محترم سے مُلاقات کے لیئے آنے لگے۔ غالباً سب سے پہلے آنے والے حفیظ الرحمٰن احسن صاحب تھے۔ بعد میں اور لوگ بھی آ گئے۔ ۱۱ بجے کا ریڈیو بلیٹن ان حضرات نے مولانا کی موجودگی میں سُنا۔ اِس بلیٹن میں یہ اعلان کیا گیا کہ شام سات بجے جنرل محمد ضیاء الحق صاحب قوم سے خطاب کریں گے ــــــــ پاکستان کی مختصر سی تاریخ میں یہ تیسرا مارشل لاء ہے۔

۹ر جولائی ۱۹۷۷ء

آج پیر پگاڑا صاحب نے مولانا محترم سے مُلاقات کی۔

۲۲ر جولائی ۱۹۷۷ء

سابق میجر جنرل اکبر خاں صاحب نے تقریبا ایک گھنٹہ مُلاقات کی۔

۲۸ر جولائی ۱۹۷۷ء

چودھری ظہور الٰہی صاحب، رہائی کے بعد پہلی مرتبہ مُلاقات کے لیئے تشریف لائے۔

—

۳۰ر جولائی ۱۹۷۷ء

حنیف رامے صاحب (سابق وزیر اعلیٰ پنجاب) رہائی کے بعد پہلی مرتبہ ملاقات کے لیے آئے۔

۳۱ر جولائی ۱۹۷۷ء

ضیاء الاسلام صاحب، سڈنی یونیورسٹی سڈنی، آسٹریلیا نے مُلاقات کی۔

یکم اگست ۱۹۷۷ء

حسن بن داؤد، سعودی عرب سے ملاقات کے لیے آئے۔

۳ر اگست ۱۹۷۷ء

۱۔ امر اللہ حسینی صاحب (از نیویارک) نے مولانا سے ملاقات کی۔ وہ حیدر آباد دکن سے تعلق رکھتے ہیں۔
۲۔ آج ہی عبدالباقی بلوچ صاحب سابق ایم پی اے نے بھی ملاقات کی۔

۴ر اگست ۱۹۷۷ء

۱۔ لیفٹیننٹ کرنل رونق علی صاحب نے آج پھر مولانا محترم سے ملاقات کی۔
۲۔ سردار شوکت حیات صاحب نے ملاقات کی۔

—

۵ر اگست ۱۹۷۷ء

جنرل محمد ضیاء الحق صاحب چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر، کمانڈر انچیف افواجِ پاکستان اور جنرل محمد اقبال صاحب کور کمانڈر و مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر پنجاب، بعد نماز مغرب ملاقات کے لیے تشریف لائے۔ مولانا سے ان کی یہ پہلی ملاقات تھی۔

۷ر اگست ۱۹۷۷ء

۱۔ آج حاجی مولا بخش سومرو، علی احمد تالپور، اور عبدالحمید جتوئی تینوں نے ملاقات کی۔

۲۔ چودھری غلام دستگیر صاحب سابق ایم این اے اور ان کے ساتھی چودھری محمد اسلم صاحب (گوجرانوالہ کے امیر) کی معیت میں تشریف لائے اور ملاقات کی۔

۸ر اگست ۱۹۷۷ء

۱۔ سلطان خضر حیات صاحب نائب سجادہ نشین گدی سُلطان باہو ضِلع جھنگ، نے ملاقات کی۔

۲۔ آج ہی جنرل شیر علی صاحب چند ساتھیوں کے ساتھ ملے۔

۳۔ مسلم لیگی راہنما خواجہ خیر الدین صاحب نے بھی ملاقات کی۔

۹ر اگست ۱۹۷۷ء

۱۔ آج جنرل عمر صاحب نے مولانا محترم سے مُلاقات کی۔

۲۔ محمود الحسن واسطی نے جو جدہ سے آئے ہوئے ہیں، مُلاقات کی۔

۳۔ آج ہی سردار عبدالقیوم صاحب سابق صدر آزاد کشمیر دوسری مرتبہ مولانا محترم سے ملے۔

۱۰/ اگست ۱۹۷۷ء

۱۔ جنرل تجمل صاحب مولانا سے ملے۔ پہلے بھی کئی بار مل چکے ہیں۔
۲۔ محمد امین لغاری صاحب نے اپنے بعض احباب کے ساتھ ملاقات کی۔

۱۱/ اگست ۱۹۷۷ء

۱۔ محمد اکرم صاحب اسسٹنٹ کنٹرولر، اے جی آفس لاہور، آج مولانا محترم سے ملے۔
۲۔ پروفیسر غلام احمد حریری صاحب نے بھی ملاقات کی۔

۱۳/ اگست ۱۹۷۷ء

قاری عبدالقوی صاحب استاد مدینہ یونیورسٹی، مولانا سے ملے۔

۱۴/ اگست ۱۹۷۷ء

مشتاق احمد خاں صاحب انسپکٹر پولیس سپیشل برانچ اور محمد حنیف بھٹی صاحب اے ایس آئی، سی آئی اے نے ملاقات کی۔

۲۶/ اگست ۱۹۷۷ء

مولانا ظفر احمد انصاری صاحب مولانا محترم سے ملاقات کرنے کے لیے تشریف لائے۔

۲۹/ اگست ۱۹۷۷ء

کرنل اکبر صاحب (اسلام آباد سے) بریگیڈیر اقبال صاحب (لاہور) اور جنرل شیر علی صاحب، تینوں حضرات نے الگ الگ ملاقاتیں کیں۔

۳۰/ اگست ۱۹۷۷ء

خواجہ خیر الدین صاحب نے دوسری مرتبہ مُلاقات کی۔

۲/ ستمبر ۱۹۷۷ء

مقصُود الرسول صاحب ڈی ایس پی اور صاحبزادہ محمد امین صاحب صوابی، مردان، دونوں حضرات نے علیٰحدہ علیٰحدہ ملاقات کی۔

۴/ ستمبر ۱۹۷۷ء

بابو عبد الوارث صاحب لاہور (دلائی کیمپ والے) مولانا محترم سے ملے اور انہوں نے دلائی کیمپ کے حالات و واردات بیان کیے۔

۱۰/ ستمبر ۱۹۷۷ء

ایئر مارشل (ریٹائرڈ) اصغر خاں صاحب مولانا محترم سے ملے۔

۱۳/ ستمبر ۱۹۷۷ء

میجر عبد الرشید (رینجرز) لاہور نے ملاقات کی۔

۱۴ر ستمبر ۱۹۷۷ء

افغانستان کے دو طالب علم رہنما مولانا سے ملے۔

۹ر اکتوبر ۱۹۷۷ء

جسٹس محمد افضل چیمہ صاحب چیئرمین اسلامی نظریاتی کونسل آف پاکستان تشریف لائے اور ملاقات کی۔

۱۲ر اکتوبر ۱۹۷۷ء

یوسف مظفر الدین حامد صاحب، چیئرمین اسلامک پارٹی شمالی امریکہ نے ملاقات کی اور تحریکی اور جماعتی مشورے کیے۔

۱۳ر اکتوبر ۱۹۷۷ء

نواب محمد یامین خاں صاحب نے ملاقات کی۔

۲۶ر اکتوبر ۱۹۷۷ء

ائیر مارشل اصغر خاں دوسری مرتبہ ملاقات کیلئے تشریف لائے۔

۱۶ر نومبر ۱۹۷۷ء

خواجہ خیر الدین، مسلم لیگی راہنما آج پھر مولانا محترم سے ملے۔

۲۵ر نومبر ۱۹۷۷ء

جسٹس محمد افضل چیمہ صاحب، چیئرمین اسلامی نظریاتی کونسل آج

پھر مولانا سے ملے۔

۲۹، نومبر ۱۹۷۷ء

بی بی سی لندن کے دو نمائندے محض ملاقات کے لئے آئے وہ کچھ دیر مولانا کے ساتھ رہے۔

۲، دسمبر ۱۹۷۷ء

بنگلہ دیش کے پاکستان میں سفیر ظہیرالدین صاحب نے مولانا سے ملاقات کی۔

۷، دسمبر ۱۹۷۷ء

مشہور ایرانی دانشور اور ماہر برقیات، سید مرتضیٰ سعیدی صاحب ملاقات کے لئے تشریف لائے۔ سعیدی صاحب خاصے بزرگ ہیں۔

۹، دسمبر ۱۹۷۷ء

جسٹس محمد یوسف صراف چیف جسٹس آزاد کشمیر ہائی کورٹ مظفرآباد، ملاقات کے لئے تشریف لائے۔

۹، دسمبر ۱۹۷۷ء

قلعہ دیدار سنگھ سے ساٹھ ستر افراد پر مشتمل ایک وفد نے نماز عصر کے بعد مولانا سے ملاقات کی مولانا نے سوالات کے جوابات اور ہدایات دیں۔

۱۰/ دسمبر ۱۹۷۷ء

شیخ ابراہیم القطان چیف جسٹس اردن تشریف لائے اور کچھ دیر مولانا کے ساتھ رہے۔

۱۴/ دسمبر ۱۹۷۷ء

ڈاکٹر قاضی اشفاق احمد صاحب، صدر آسٹریلین فیڈریشن آف اسلامک کونسل ملاقات کے لیے تشریف لائے۔

۱۶ر جنوری ۱۹۷۸ء

۱۔ مولا بخش سومرو صاحب ممبر مشاورتی کونسل آف پاکستان نے تقریباً ایک گھنٹہ ملاقات کی۔ نمازِ ظہر مولانا کے ساتھ ادا کی۔ بار بار آنے کا کہہ کر رُخصت ہوئے۔

۲۔ بیگم جی اے خاں، (جی اے گل مشہور فلمساز کی اہلیہ) تفہیم القرآن لینے آئی تھیں۔ انہوں نے مولانا محترم سے ملاقات کی۔

۱۸ر جنوری ۱۹۷۸ء

۱۔ جناب خالد حمدان صاحب، سعودی کونسلیٹ، لاہور نے مولانا سے ملاقات کی۔

۲۔ آج ہی ملک خدا بخش بچہ صاحب، سابق زراعتی مشیر صدرِ پاکستان ملاقات کے لیے تشریف لائے۔

۲۰ر جنوری ۱۹۷۸ء

جناب اے کے بروہی صاحب، وفاقی مشیر، وزیر قانون نے نصف گھنٹہ ملاقات کی۔

۲۱ر جنوری ۱۹۷۸ء

مصباح اللہ خاں صاحب ڈویلپمنٹ کمشنر صوبہ سرحد، پشاور نے ملاقات کی۔

۲۵ر جنوری ۱۹۷۸ء

چیف مارشل لاء ایڈ منسٹریٹر جنرل محمد ضیاء الحق صاحب نے آج شام مولانا محترم سے ٹیلیفون پر بات کی۔ خطیب حرم بیت اللہ الشیخ عبدالعزیز بن عبداللہ اور ان کے وفد کی آمد کے سلسلہ میں گفتگو ہوئی چونکہ وفد پاکستان میں جماعتِ اسلامی کا مہمان ہے۔ اس لیے جنرل صاحب نے انتظام وغیرہ کے سلسلہ میں تعاون کی پیش کش فرمائی۔

جنرل صاحب نے یہ خواہش بھی ظاہر فرمائی کہ وفد کے اسلام آباد کے دَورے کے دوران میں وہ سرکاری مہمان بننا قبول فرمالیں۔ اور میرے گھر کھانے پر تشریف لائیں۔

بعد میں محترم میاں طفیل محمد صاحب امیر جماعتِ اسلامی نے کراچی میں وفد کے سربراہ کے سیکرٹری سے بات کرکے جنرل صاحب کو اطلاع دے دی کہ وفد کے سربراہ نے ان کی دعوت قبول فرمائی ہے

۲۸ر جنوری ۱۹۷۸ء

الشیخ عبدالعزیز بن عبداللہ آل شیخ، خطیب و امام کعبہ و امام حج، الشیخ سعید الجندول، سابق امام مسجد حرم، ڈائرکٹر محکمۂ تعلیم، ڈاکٹر احمد توتونجی اسسٹنٹ سیکرٹری ورلڈ مسلم یوتھ، ریاض، نے مولانا محترم سے بعد نماز مغرب ملاقات کی۔ یہ ملاقات تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ جاری رہی۔ گفتگو عربی میں ہوئی۔

۲۹ر جنوری ۱۹۷۸ء

مولانا محمد یوسف صاحب امیر جماعتِ اسلامی ہند ملاقات کے لیے

تشریف لائے۔

۱۵؍فروری ۱۹۷۸ء

ڈاکٹر معروف دوالیبی، مشیر شاہ خالد و صدر مؤتمر عالم اسلامی، بعد نماز مغرب ملاقات کے لیے تشریف لائے، ایک گھنٹہ ملاقات رہی، گفتگو عربی زبان میں ہوئی۔

۱۴؍مارچ ۱۹۷۸ء

دی ٹائم لندن کے نمائندہ رچرڈ وگ، نے ملاقات کی۔

۱۵؍مارچ ۱۹۷۸ء

حاجی مولا بخش سومرو صاحب، سیاسی مشیر صدر ضیاء الحق صاحب نے ملاقات کی۔

۱۹؍مارچ ۱۹۷۸ء

سردار عبدالقیوم صاحب، سابق صدر آزاد کشمیر نے ملاقات کی۔

۲۳؍مارچ ۱۹۷۸ء

حاجی مولا بخش سومرو صاحب آج پھر تشریف لائے۔

۲۶؍مارچ ۱۹۷۸ء

کیپٹن ڈاکٹر محمد بخاری صاحب راولپنڈی ملٹری میڈیکل کالج، نے ملاقات کی۔

۳۰/مارچ ۱۹۷۸ء

سردار عطا محمد لغاری صاحب مولانا محترم سے ملے۔

۶/اپریل ۱۹۷۸ء

۱۔ مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر بلوچستان زون، نے ملاقات کی۔
۲۔ مردان، صوبہ سرحد سے پچاس آدمیوں کا ایک گروپ مولانا سے ملنے کے لیے آیا۔

۱۲/اپریل ۱۹۷۸ء

اسماعیل قریشی ایڈووکیٹ، اور میاں شیر عالم ایڈووکیٹ نے ملاقات کی۔ جیورسٹ کانفرنس کے سلسلے میں گفتگو ہوئی۔

۱۳/اپریل ۱۹۷۸ء

جنرل محمد ضیاء الحق صاحب عشاء کی نماز کے تھوڑی دیر بعد تشریف لائے۔ ان کے ساتھ جنرل سوار خاں اور بریگیڈیئر ظفر صاحب بھی تھے۔ تقریباً پچاس منٹ تک ملاقات رہی۔

اِس ملاقات میں جنرل محمد ضیاء الحق صاحب نے مولانا محترم سے ملک میں قرآن وسنت کے اصولوں کے مطابق اسلامی قوانین کے نفاذ میں پیش آنے والی مشکلات کا ذکر کیا اور اس کام کے ضروری تقاضوں پر گفتگو کی۔ نیز قومی حکومت کے قیام اور دیگر اُمور پر تبادلہ خیال کیا۔ ——مولانا محترم کے ساتھ جنرل ضیاء الحق صاحب کی یہ دوسری ملاقات تھی۔

۱۴/ اپریل ۱۹۷۸ء

چودھری رحیم داد صاحب، چیف جسٹس سپریم کورٹ آزاد کشمیر و چیئرمین اسلامی نظریاتی کونسل آزاد کشمیر ملاقات کے لیے تشریف لائے۔ وہ مولانا کی کرسی کے قریب فرش پر بیٹھ گئے۔ ان سے کرسی پر بیٹھنے کی درخواست کی گئی تو انہوں نے فرمایا کہ میں مولانا کے سامنے کرسی پر نہیں بیٹھ سکتا۔

انہوں نے مولانا محترم کو یاد دلایا کہ وہ اسلامیہ کالج میں مولانا کے شاگرد رہ چکے ہیں۔

۱۸/ اپریل ۱۹۷۸ء

جسٹس شمیم حسین قادری صاحب تشریف لائے۔ شام ساڑھے پانچ بجے سے سوا سات بجے تک مولانا محترم کے ساتھ رہے۔

۲۰/ اپریل ۱۹۷۸ء

مولانا محمد یونس اثری صاحب، امیر جمعیت اہلحدیث آزاد کشمیر، مظفر آباد و ممبر اسلامی نظریاتی کونسل آزاد کشمیر، نے مولانا سے ملاقات کی۔

۲۵/ اپریل ۱۹۷۸ء

حاجی مولا بخش سومرو صاحب، سیاسی و اقتصادی مشیر جنرل محمد ضیاء الحق صاحب، آج پھر مولانا سے ملے۔

۲۹/ اپریل ۱۹۷۸ء

کچھ دنوں سے مولانا محترم کی دردوں کی تکلیف بڑھ گئی ہے اور اس

کی خبر اخبارات میں بھی آگئی ہے جس کے نتیجے میں ٹیلیفون، خطوط اور ملاقاتوں کا سلسلہ بڑھ رہا ہے۔

آج چودھری رحیم داد صاحب چیف جسٹس آزاد کشمیر سپریم کورٹ نے اخبارات میں پڑھ کر مظفر آباد سے ٹیلیفون پر مولانا محترم کی طبیعت کا حال معلوم کیا۔

۳۰ اپریل ۱۹۷۸ء

ا۔ کرنل عون صاحب سعودی ملٹری اتاشی نے اسلام آباد سے ٹیلیفون کے ذریعے مزاج پرسی کی اور طبیعت کا حال معلوم کیا۔

۲۔ پاکستان میں ایک مسلمان ملک کے سفیر ملاقات کیلئے تشریف لائے۔ انہیں ڈرائینگ روم میں بٹھایا گیا اور مولانا محترم کو اطلاع دی گئی۔ مولانا محترم واکر کے ذریعے سے ڈرائینگ روم میں تشریف لائے معانقہ و مصافحہ کے بعد انہوں نے ایک فقرے میں خیریت معلوم کی اور خاموش ہو گئے۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد ان کی ہچکی بندھ گئی۔ اور رومال آنکھوں پر رکھ لیا۔ اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے ایک دو مرتبہ بولنے کی کوشش کی مگر کچھ نہ کہہ سکے۔ کافی دیر بعد سنبھلے اور مولانا کی صحت کے بارے میں سوال کیا۔ پھر میری (راقم الحروف) کی طرف اشارہ کیا تو مولانا محترم نے میرا مختصر تعارف کرایا اور فرمایا المجالس بالامانۃ ــــــ

سفیر موصوف مولانا کی بہت سی کتابوں کا مطالعہ کر چکے ہیں، اور خاصا دینی ذوق رکھتے ہیں۔ دورانِ گفتگو میں انہوں نے کہا الاسلام هوالتقوى والقوه۔ یعنی اسلام تقویٰ اور قوت کا نام ہے۔ مولانا محترم نے فرمایا جس قوت کے ساتھ تقویٰ نہ ہو وہ شیطانی قوت ہے

اور جس تقویٰ کے ساتھ قوت نہ ہو وہ بے وقعت اور کھوکھلا ہے۔
پھر مختلف موضوعات پر مسلسل گفتگو کرتے رہے اور کہا یہ سب آپ ہی کی سکھائی ہوئی چیزیں ہیں، میں آپ کے سامنے اس لیے دہرا رہا ہوں تاکہ آپ اندازہ کر سکیں کہ شاگرد نے سبق ٹھیک یاد رکھا ہے یا نہیں۔

-●-

۲؍مئی ۱۹۷۸ء

جنرل محمد ضیاء الحق صاحب نے ٹیلیفون پر مولانا محترم کی صحت کا حال معلوم کیا اور بیرون ملک علاج کی پیشکش فرمائی۔ مولانا محترم نے جنرل صاحب کا شکریہ ادا کیا اور فی الحال بیرون ملک جانے سے معذرت کی۔

۷؍مئی ۱۹۷۸ء

ملک یزدانی صاحب اور میر بلخ شیر مزاری نے ملاقات کی جو پون گھنٹہ تک جاری رہی۔

۸؍مئی ۱۹۷۸ء

سیٹھ عابد صاحب ملاقات کے لیے تشریف لائے۔ تقریباً نصف گھنٹہ مولانا کے پاس بیٹھے رہے۔ اس دوران میں انہوں نے ہسپتال کے لیے بہت بڑی رقم کی پیشکش کی۔ ان کی خواہش یہ تھی کہ اخراجات وہ برداشت کریں گے، لیکن تعمیر مولانا کی ہدایت کے مطابق اور جماعت کے کارکنوں کی زیرِ نگرانی ہو۔ مولانا نے فرمایا کہ یہ کام آپ خود ہی اپنے ذرائع سے کرائیں۔

۱۳؍مئی ۱۹۷۸ء

شریف الدین پیرزادہ صاحب اٹارنی جنرل پاکستان ملاقات کے لئے تشریف لائے۔

۱۸ر مئی ۱۹۷۸ء

ریٹائرڈ جسٹس سید جمیل حسین رضوی صاحب نے مُلاقات کی۔ سُنی شیعہ مشترکہ نصابِ تعلیم پر بھی گفتگو ہوئی۔

۲۲ر مئی ۱۹۷۸ء

ہر نائی نس نواب اقتدار علی خاں صاحب (انڈیا) کے نمائندہ ان کے بھائی نواب مراد ابراہیم خاں صاحب ملاقات کے لیئے تشریف لائے۔ کچھ دیر مولانا کے ساتھ رہے۔

۲۴ر مئی ۱۹۷۸ء

(انڈیا رام پور سے) مقصود شاہ صاحب نے مولانا سے ملاقات کی۔

۶ر جون ۱۹۷۸ء

نیشنل کونسل آف ینگ مُسلم ایسوسی ایشنز (Y.M.M.A.S.) آف سری لنکا کا سہ رکنی وفد مولانا سے ملا۔ مذہبی اور سیاسی امور نیز پاکستان اور سری لنکا کے باہمی تعلقات پر گفتگو ہوئی۔

۱۰ر جون ۱۹۷۸ء

حاجی مولا بخش سومرو صاحب، سیاسی و اقتصادی اُمور کے مشیر، نے آج پھر ملاقات کی۔

۱۱؍جون ۱۹۷۸ء

۱۔ زکریا بٹ امیر کموڈور نے ملاقات کی۔
۲۔ کرنل شفقت بلوچ صاحب نے ملاقات کی۔

۱۳؍جون ۱۹۷۸ء

چودھری ظہور الٰہی صاحب نے ملاقات کی۔

۱۷؍جون ۱۹۷۸ء

عبداللہ عقیل صاحب، ڈائرکٹر وزارت اوقاف و مذہبی اُمور حکومت کویت تشریف لائے۔ کچھ دیر مولانا کے ساتھ رہے۔

۱۸؍جون ۱۹۷۸ء

ابُو المصطفیٰ عبداللہ عقیل صاحب نے آج دوبارہ مولانا محترم سے ملاقات کی اور مختلف مسائل پر تبادلۂ خیال کیا، میاں طفیل محمد صاحب بھی ان کے ہمراہ تھے۔

۲۱؍جون ۱۹۷۸ء

نصر من اللہ صاحب، چیف سیکرٹری صوبہ سرحد و چیئرمین رائس ملنگ کارپوریشن سرحد نے ملاقات کی۔

۲۷؍جون ۱۹۷۸ء

۱۔ مولانا محمد اسحٰق جلیس ندوی، ایڈیٹر تعمیرِ حیات لکھنو انڈیا، مولانا

سے ملے۔
۲۔ آج پھر چودھری ظہور الٰہی صاحب نے ملاقات کی۔

۴/ جولائی ۱۹۷۸ء

ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی صاحب، استاد علیگڑھ یونیورسٹی اور مولانا جمیل احمد صاحب نائب صدر مدارس اسلامک فاؤنڈیشن، ملاقات کے لیئے تشریف لائے۔

۶/ جولائی ۱۹۷۸ء

مسلم لیگی لیڈر چودھری ظہور الٰہی صاحب، جنہوں نے کل وفاقی وزیر کی حیثیت سے حلف اُٹھایا، آج نمازِ ظہر کے بعد مولانا محترم سے ملنے کے لیئے تشریف لائے، بلا اطلاع ہی پہنچ گئے۔ چونکہ دوپہر کے کھانے کے بعد مولانا آرام کے کمرے میں تھے، اس لیئے مولانا نے چودھری صاحب کو وہیں بُلا لیا۔ وہ نصف گھنٹہ تک مولانا محترم کے ساتھ رہے۔

۹/ جولائی ۱۹۷۸ء

الشیخ عبدالمحسن حمدالعباد وائس چانسلر مدینہ یونیورسٹی، الشیخ عبد اللہ انصاری ڈائریکٹر جنرل امورِ مذہبی و دیہی ترقی حکومت قطر، اور صالح اوزجان صاحب رُکن پارلیمنٹ وچیئرمین سیاسی کمیٹی پارلیمنٹ ترکیہ، تینوں حضرات نے مُلاقات کی۔

۱۳/ جولائی ۱۹۷۸ء

۱۔ جنرل عبداللہ خاں نیازی نے نصف گھنٹہ تک ملاقات کی۔

۲۔ مولانا محمد یوسف امیر جماعتِ اسلامی ہند اپنے دو رفقاء کیساتھ ملاقات کے لیے تشریف لائے۔

۳۔ پہلی اسلامی ایشیائی کانفرنس منعقدہ کراچی میں شریک ہونے والا بنگلہ دیش کا وفد مولانا عبدالرحیم صاحب کی قیادت میں مولانا محترم سے ملا۔

۱۳ر جولائی ۱۹۷۸ء

سنٹرل اِنٹیلی جَینس بیورو کے تین عہدیداران سعید احمد صاحب ڈائریکٹر کی سربراہی میں مولانا محترم سے ملے۔

۱۴ر جولائی ۱۹۷۸ء

ڈاکٹر جمعہ صاحب کراچی سے مولانا محترم کے طبی معائنہ کے لیے تشریف لائے۔ کئی گھنٹے تک معائنہ کرتے رہے

۱۵ر جولائی ۱۹۷۸ء

خواجہ محمد یوسف صراف چیف جسٹس آزاد کشمیر ہائی کورٹ نے مولانا محترم سے ملاقات کی۔ ان کے ساتھ ان کا صاحبزادہ ساجد یوسف بھی تھا۔

۱۷ر جولائی ۱۹۷۸ء

نیپا میں تربیت پاکر فارغ ہونے والے چار اعلیٰ آفیسر ملاقات کے لیے آئے۔ دعا اور ہدایات لیں۔

۱۸؍ جولائی ۱۹۷۸ء

کاکول اکیڈمی میں شعبہ انگلش کے استاد میجر ضیاء صاحب، مولانا سے ملے۔

۱۹؍ جولائی ۱۹۷۸ء

۱۔ مسرت حسین صاحب انڈین ہیں۔ دوبئی میں کاروبار کر رہے ہیں مولانا محترم سے ملے۔ تحریک سے وابستہ ہیں۔

۲۔ حمید الملکی صاحب اور عبدالقیوم قریشی سیکرٹری تعلیم پنجاب نے ملاقات کی۔ عبدالقیوم قریشی صاحب بعد میں بہاول پور اسلامی یونیورسٹی کے وائس چانسلر بنے۔

۲۲؍ جولائی ۱۹۷۸ء

۱۔ نوابزادہ نصراللہ خاں صاحب نے ملاقات کی۔ جو ڈیڑھ گھنٹہ جاری رہی۔

۲۔ حاجی مولا بخش سومرو صاحب، سابق مشیر سیاسی و اقتصادی امور نے ملاقات کی۔

۲۴؍ جولائی ۱۹۷۸ء

۱۔ مولانا مفتی سید سیاح الدین صاحب کاکاخیل، ممبر اسلامی نظریاتی کونسل نے ملاقات کی۔ دورانِ ملاقات سُنی شیعہ نصاب پر گفتگو ہوئی۔

۲۔ بریگیڈیر گلزار احمد صاحب (ریٹائرڈ) نے ملاقات کی۔

۲۵ر جولائی ۱۹۷۸ء

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحب مع اپنے رفقاء : مولانا معین اللہ ندوی نائب ناظم ندوۃ العلماء، مولانا محمد حسن ندوی ایڈیٹر البعث الاسلامی اور مولانا محمد اسحٰق جلیس ندوی ایڈیٹر تعمیرِ حیات لکھنو (انڈیا) نے ملاقات کی جو ایک گھنٹہ جاری رہی۔

۲۶ر جولائی ۱۹۷۸ء

۱۔ مولانا عبدالغفار حسن صاحب، سابق رکن جماعتِ اسلامی پاکستان، حال استاد مدینہ یونیورسٹی، مدینہ منورہ، اور مولانا عبدالرحیم اشرف صاحب نے ملاقات کی۔

۲۔ جسٹس محمد افضل چیمہ صاحب، چیئرمین اسلامی نظریاتی کونسل، نے ملاقات کی۔

۲۷ر جولائی ۱۹۷۸ء

۱۔ ایئر کموڈور انعام اللہ خاں صاحب نے ملاقات کی۔

۲۔ مولانا مفتی سید سیاح الدین کاکاخیل صاحب، ممبر اسلامی نظریاتی کونسل نے آج پھر مولانا محترم سے ملاقات کی۔

-●-

یکم اگست ۱۹۷۸ء

عبدالرشید صاحب نے ملاقات کی، نائیجریا ویسٹ افریقہ میں سولہ سال سے مقیم ہیں اور وہاں ایک سکول میں ٹیچر ہیں۔

۲/ اگست ۱۹۷۸ء

پروفیسر عبداللہ القادری (یمنی) پرنسپل کلیتہ لغتہ العربیہ، مدینہ یونیورسٹی اور ڈاکٹر محمد بیلو (سوڈانی) پروفیسر کلیہ لغتہ العربیہ مدینہ یونیورسٹی نے مولانا سے ملاقات کی۔

۷/ اگست ۱۹۷۸ء

جسٹس شمیم حسین قادری صاحب نے مولانا محترم سے فون پر بات کی اور فرسٹ ایشین اسلامی کانفرنس کی جو کاروائی انہوں نے انگلش میں مرتب کی ہے اور جو تجاویز دی ہیں ان پر مولانا محترم سے نظر ثانی کے لیے کہا۔ مولانا محترم نے فرمایا کہ یہ انہیں بھجوا دی جائے ——— چنانچہ انہوں نے کاروائی بھجوادی جسے مولانا محترم نے نظر ثانی کر کے چند روز کے بعد واپس جسٹس صاحب کو بھجوا دی۔

۹/ اگست ۱۹۷۸ء

ایس ایم عبداللہ پریذیڈنٹ حبیب بنک لمیٹڈ، کراچی مولانا سے ملے۔

۱۹/ اگست ۱۹۷۸ء

فضل حسین صاحب ایڈووکیٹ، صدر ہزارہ بار ایسوسی ایشن

ایبٹ آباد نے ملاقات کی۔

۲۱/ اگست ۱۹۷۸ء

الشیخ عبدالعزیز الفالح پرنسپل (عمید) الادب العربی کالج امام محمد بن سعود یونیورسٹی، ریاض اور الشیخ عبدالعزیز الروحی پرنسپل شریعت کالج امام محمد یونیورسٹی ریاض نے ملاقات کی۔

۲۸/ اگست ۱۹۷۸ء

الشیخ محمد قطب اور ڈاکٹر سعید الرشید مکہ مکرمہ سعودی عرب تشریف لائے۔ نمازِ ظہر مولانا کے ساتھ ادا کی۔ مولانا محترم سے نماز سے قبل ملاقات ہو چکی تھی۔

۶/ ستمبر ۱۹۷۸ء

حاجی غیاث محمد صاحب سابق اٹارنی جنرل، محمد اسمٰعیل قریشی ایڈووکیٹ، اور میاں شیر عالم ایڈووکیٹ، تینوں حضرات نے مولانا سے ملاقات کی۔

۸/ ستمبر ۱۹۷۸ء

بشیر احمد مزاری صاحب، گلبرگ لاہور نے جو شیر باز مزاری صاحب کے برادر نسبتی ہیں، ملاقات کی۔

۹/ ستمبر ۱۹۷۸ء

خواجہ عفور احمد صاحب ایڈیشنل سیکرٹری واپڈا، لاہور نے مولانا محترم

سے ملے۔

۱۲ ستمبر ۱۹۷۸ء

مختلف مقامات یعنی ضلع مظفر گڑھ، بہاول پور، سکھر، ڈیرہ غازیخاں، ڈیرہ اسماعیل خاں اور سوات سے آئے ہوئے وفود نے ملاقات کی۔

۱۳ ستمبر ۱۹۷۸ء

میاں ارشد حسین صاحب سابق وزیر خارجہ اور کرنل شاہ، کراچی، نے ملاقات کی۔

۱۵ ستمبر ۱۹۷۸ء

بریگیڈیر اشتیاق صاحب لاہور، مولانا سے ملے۔

۲۴ ستمبر ۱۹۷۸ء

۱۔ شیخ آفتاب احمد چیئرمین پریس ٹرسٹ نے ملاقات کی۔

۲۔ ڈاکٹر حسن ترابی وزیر اوقاف، تعلیم و قانون سوڈان نے (پاکستان کے وزیر مذہبی امور نوابزادہ افتخار احمد انصاری صاحب ان کے ہمراہ تھے) مولانا سے ملاقات کی۔ تقریباً ایک گھنٹہ تک یہ ملاقات جاری رہی۔

۲۶ ستمبر ۱۹۷۸ء

جناب محمد زمان اچکزئی وزیر بلدیات حکومت پاکستان نے بعد نماز مغرب مولانا محترم سے ملاقات کی اور کچھ دیر ان کے ساتھ رہے۔

۲۸/ستمبر ۱۹۷۸ء

مولوی اللہ بخش اہلحدیث جماعت لاڑکانہ کے صدر اور ان کے ساتھ حافظ غلام سرور، حاجی محمد صالح، غلام نبی، نے ملاقات کی۔

۲۸/ستمبر ۱۹۷۸ء

کراچی کے ماہنامہ العلم کے ایڈیٹر نے مولانا محترم کو لکھا کہ معلوم ہُوا ہے مولانا محمد علی جوہر مرحوم سے آپ کے مراسم تھے۔ اس ناطے سے ہم چاہتے ہیں کہ آپ قارئین العلم کے لیے مولانا محمد علی جوہر کے بارے میں کچھ تحریر فرمائیں۔

مولانا محترم نے درج ذیل مختصر مضمون لکھ کر بھجوایا جس میں بعض تاریخی اور تحریکی حقائق پر روشنی پڑتی ہے۔

یہ مضمون العلم کی اکتوبر تا دسمبر ۱۹۷۸ء کی یکجا اشاعت میں شائع ہُوا تھا۔

"مولانا محمد علی سے میرے روابط کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ میرے سب سے بڑے بھائی ابو محمد صاحب مرحوم جو بھوپال میں مقیم تھے، مولانا مرحوم کے دوستوں میں سے تھے اور دوستی کے یہ روابط خاصے گہرے اور مضبوط تھے۔ ڈاکٹر انصاری مرحوم ڈاکٹر عبدالرحمٰن، شعیب قریشی اور عبدالرحمٰن سندھی (صدیقی) صاحب سے بھی ان کے بڑے گہرے دوستانہ مراسم تھے۔ اور مؤخرالذکر دونوں حضرات تو بسا اوقات مہینوں ہمارے ہاں مہمان رہے ہیں۔ یہ مخلص لوگ تھے۔ علی گڑھ کی مخصوص تہذیب اور شائستگی کا نمونہ، قومی درد رکھتے تھے۔ ایثار کا جذبہ انہیں بے گھر کئے ہوئے تھا۔ یہ بیرسٹر تھے۔ انگریزی کے صاحبِ تدبر ادیب

تھے۔ اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں خطابت کے جوہر دکھاتے تھے۔ ان کی قابلیت اپنے لئے نہیں تھی قوم کے لیے تھی۔ خود میرے بھائی ابو محمدؒ صاحب بھی اس حلقۂ اخوان الصفاء کے ایک رکن تھے۔ ان لوگوں میں خوب بنتی تھی۔ اور اس مجمع رنداں کے پیر مغاں محمد علی کو سب چاہتے بھی تھے اور ان کی عظمت کے آگے سر بھی جھکاتے تھے۔

۱۹۲۴ء میں جب مولانا محمد علی دوبارہ "ہمدرد" جاری کرنے کے انتظامات کر رہے تھے۔ بھائی ابو محمد صاحب مرحوم نے مجھے رائے دی کہ میں اس کے ادارہ سے وابستہ ہو جاؤں۔ اس سے پہلے میں متعدد اخباروں میں کام کر چکا تھا۔ میں نے بھی اس کو غنیمت سمجھا کہ مجھے مولانا محمد علی جیسے شخص کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملے، چنانچہ میں بھائی صاحب کے ساتھ ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ یہ میری ان کی پہلی ملاقات تھی۔

ایک بزرگ اپنے چھوٹے کے ساتھ جس محبت و شفقت کے ساتھ پیش آسکتا ہے اس سے کچھ زیادہ ہی محبت و شفقت مجھے محمد علی کی طرف سے ملی۔ کیونکہ وہ ہر معاملہ میں بالخصوص دوستی و محبت کے معاملہ میں بہت زیادہ انتہا پسند تھے، چنانچہ اس کے بعد بارہا ان کی خدمت میں حاضری کا موقع ملتا رہا۔ اور ہمیشہ یہ محسوس ہوا کہ ایک بڑے لیڈر سے نہیں بلکہ اپنے بڑے بھائی سے مل رہا ہوں۔

ابھی "ہمدرد" کے اجراء کے انتظامات ہی ہو رہے تھے کہ میں نے اس سے وابستہ ہونے کا ارادہ ترک کر دیا۔ دراصل چند ہی روز بعد میں نے محسوس کر لیا تھا کہ فکری ہم آہنگی، جذباتی عقیدت اور سیاسی معاملات میں تمام تر اتفاق رائے کے باوجود میرا اور ان کا نباہ نہیں ہو سکتا۔ ان کی "جہر پدر" میں "جور پدر" بھی شامل تھا اور وہ بھی پوری شدت اور انتہا پسندی کے ساتھ۔ میری پرورش جس ماحول میں ہوئی

تھی اس نے خود میرے مزاج اور افتادِ طبع کا بھی ایک نہ ٹوٹنے والا سانچہ بنا دیا تھا اگر ساتھ رہتا تو اندیشہ تھا کہ یہ سانچہ ٹوٹ نہ جائے، لہٰذا میں نے فیصلہ کر لیا کہ "ہمدرد" کے عملۂ ادارت سے وابستگی نہیں اختیار کروں گا، البتہ اس سے باہر رہ کر جو خدمت بھی اس بطلِ جلیل کی بن آئے گی کروں گا۔

اتفاق کی بات اسی زمانہ میں جمعیۃ علمائے ہند کو اپنے آرگن روزنامہ الجمعیتہ کے لیے ایک ایڈیٹر کی ضرورت پیش آئی۔ ہندوستانی سیاست کا داخلی اور خارجی اعتبار سے یہ بڑا اہم اور نازک دَور تھا۔ اربابِ جمعیتہ کو ایسے ایڈیٹر کی تلاش تھی جو واقعات و مسائل اور حوادث و افکار پر اپنے اداریوں میں جن خیالات کا اظہار کرے ایک طرف وہ جدید معیارِ صحافت پر اپنے عمق کے اعتبار سے پورے اُترتے ہوں۔ دوسری طرف مذہبی نقطۂ نظر بھی پورے توازن کے ساتھ ان میں سمویا ہوا ہو۔ اس مقصد کے لیے اربابِ جمعیتہ کی نگاہِ انتخاب مجھ پر پڑی کیونکہ وہ پہلے سے مجھ پر اعتماد رکھتے تھے۔ اور میں ۱۹۲۲ء ۱۹۲۳ء میں ان کے اخبار "مسلم" کا ایڈیٹر رہ چکا تھا۔ اور میں نے بھی "ہمدرد" کے بجائے الجمعیتہ کی پیش کش قبول کرنے کو ترجیح دی۔ کیونکہ یہاں میں خود پرچہ کو چلانے کا ذمہ دار تھا۔ کسی دوسرے کی ماتحتی میں مجھے کام کرنا نہ تھا۔ ۱۹۲۴ء سے ۱۹۲۸ء تک یہ ذمہ داری انجام دیتا رہا۔ اس عرصہ میں برابر محمد علی سے استفادہ کا اُن سے فیضِ صحبت حاصل کرنے کا اور ان کی شخصیت کو بہت زیادہ قریب سے دیکھنے کا مجھے موقع ملا۔ لیڈروں سے یہ دنیا نہ کبھی خالی رہی ہے نہ رہے گی، لیکن اس درویش خدامست کی قیادت شان ہی کچھ اور رکھتی تھی۔ پھر اس کے بعد آج تک مسلمانوں میں کوئی لیڈر ایسا نہیں آیا جو سیاسی بصیرت کے ساتھ ایسا گہرا دینی جذبہ بھی رکھتا

ہو اور اپنی دینداری سے اپنی تحریک کے کارکنوں میں بھی دینی رُوح پھونک سکتا ہو۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ الجمعیتہ نے میرے دورِ ادارت میں ہمیشہ پورے خلوص اور استقلال و استقامت کے ساتھ محمد علی کی ہمنوائی کی۔ مخالفوں کی یلغار میں اس کا ساتھ دیا۔ جب اس پر تیروں کی بارش ہوتی تھی تو اس کی ایک ڈھال الجمعیتہ بھی ہوتا تھا۔

محمد علی کا سا زعیم غلام آباد ہندوستان نے شاید کوئی نہیں پیدا کیا، وہ گدائے بے نوا تھا، لیکن آغا خاں اور مہاراجہ محمود آباد اس کے حضور میں جھک کر آتے تھے۔ وہ اقلیت کا ایک فرد تھا لیکن اکثریت کا سب سے بڑا لیڈر ـــــ گاندھی ـــــ اس کی جیب میں تھا۔ اور پٹیل، موتی لال، جواہر لال، راجندر پرشاد وغیرہ تو اس سے دوسرے ہی درجہ پر تھے۔ وہ ایک غلام ملک کا باشندہ تھا، لیکن دنیا کی سب سے بڑی سامراجی حکومت اس سے ڈرتی تھی۔ وہ بڑی آسانی سے انگریزی دور میں کم از کم وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کا ممبر تو بن ہی سکتا تھا، لیکن ان مناصبِ عالیہ پر اس نے کبھی نگاہ غلط انداز ڈالنا بھی گوارا نہ کیا۔ اِس کی زندگی کا مقصد منہاج خلافتِ راشدہ پر خلافت کا قیام تھا۔ وہ پابندی سے نماز پڑھتا تھا۔ پابندی سے روزے رکھتا تھا۔ ذاتِ رسالت مآب سے اس کے عشق اور شیفتگی کی یہ کیفیت تھی کہ ـــــ جب نام تیرا لیجئے تب اشک بھر آوے اس کی دوستی بھی اللہ کے لیے تھی۔ اور دشمنی بھی اللہ کے لئے۔ اسی لیے وہ دوستوں کو دشمن اور دشمنوں کو دوست بناتا رہتا تھا۔ وہ بغاوت کے جرم میں جیل بھی گیا اور اس جرم میں پھانسی کا مشتاق بھی رہا۔ خود ہی کہتا ہے ؎

مستحق دار کو حکم نظر بندی مِلا
کیا کہوں کیسی رہائی ہوتے ہوتے رہ گئی

مولانا محمد علی کا ایک معمول یہ تھا کہ ہر جمعہ کو نماز کے بعد جامع مسجد میں اس ممبر پر۔ جو صحن میں تھا کھڑے ہو کر حالاتِ حاضرہ پر تقریر کیا کرتے تھے۔ میں ان کی یہ ہفتہ وار تقریر پابندی سے سنتا تھا۔ اور مجھے اس حقیقت کے اظہار میں کوئی تامل نہیں کہ ان تقریروں سے میں نے فکری طور پر بہت فائدہ اٹھایا۔ اور یہی وجہ تھی کہ ایک سامع کی حیثیت سے شاید ہی اپنے دورانِ قیام دہلی میں کوئی تقریر میں نے ناغہ کی ہو۔

۱۹۲۶ء میں سوامی شردھانند کو ایک مسلمان نے قتل کر دیا۔ یہ بڑا سخت حادثہ تھا۔ ہندو مسلم اتحاد کی بنیادیں ویسے ہی ایک عرصہ سے ہل رہی تھیں۔ اب تقریباً منہدم ہو گئیں۔ ہر طرف سے مسلمانوں پر حملے ہونے لگے کہ یہ متعصب ہیں۔ وحشی ہیں۔ خون آشام ہیں۔ حتیٰ کہ گاندھی جی تک بے ساختہ کہہ اُٹھے کہ مسلمانوں کی سرشت میں خونریزی شامل ہے۔ مولانا محمد علی مسلسل اپنی تقریروں میں اسلام کا دفاع کرتے رہے۔ مستشرقینِ فرنگ اور متعصبینِ ہند کا جواب اپنے مبلغ علم کے مطابق دیتے رہے ایک روز انہوں نے اپنی تقریر میں فرمایا:۔

"کاش کوئی شخص اسلام کے خلاف افتراپردازیوں کا جواب دلائل و براہین کے ساتھ کتاب و سنت کی روشنی میں لکھ کر اسلام کے جہاد کی حقیقت دنیا کے سامنے آشکارا کر سکے۔"

وہیں بیٹھے بیٹھے میرے دل میں خیال آیا۔ وہ شخص میں ہی کیوں نہ بن جاؤں

واپس آکر میں نے اس موضوع سے متعلق جتنی بھی معتبر اور مستند کتابیں فراہم ہو سکتی تھیں جمع کیں اور چند روز بعد "الجمعیۃ" میں الجہاد فی الاسلام کے عنوان سے ایک سلسلۂ مقالات شروع کر دیا۔ جب اس کے

چوبیس ۲۴ نمبر شائع ہو چکے تو میں نے محسوس کیا کہ موضوع اتنا اہم ہے کہ مقالات کا متحمل نہیں ہو سکتا، یہ ایک مستقل تصنیف کا طالب ہے، چنانچہ میں نے دو تین سال کی تحقیق و مطالعہ کے بعد اس نام سے ایک کتاب مکمل کر لی۔ جس کا پہلا ایڈیشن دارالمصنفین اعظم گڑھ سے مولانا سید سلیمان ندوی نے شائع کیا تھا۔ بعد میں مزید اضافوں اور نظر ثانی کے بعد میں نے خود اسے شائع کیا۔

۱۹۳۰ء میں حق اور سچائی پر ہونے کے باوجود محمد علی بالکل یکہ و تنہا رہ گئے۔ گاندھی جی اور جواہر لال کی قیادت میں کانگریس نے ان کے خلاف زبردست مورچہ قائم کر لیا تھا۔ زندگی بھر کے ساتھی جنہیں انہوں نے لیڈر بنایا تھا۔ ان کا ساتھ چھوڑ کر کانگریس سے جا ملے تھے۔ اور مل ہی نہیں گئے تھے بلکہ محمد علی کی سیاست ہی نہیں بلکہ ان کے خلوص و دیانت پر بھی حملے کر رہے تھے۔ محمد علی ان سب سے لڑ رہے تھے۔ وہ بیمار تھے۔ دل کے بار بار حملے ہوتے تھے۔ ذیابیطس نے نڈھال کر دیا تھا۔ ساتھیوں کی بے وفائی نے زندگی سے بددل کر دیا تھا۔ اسی حالت میں وہ بھوپال آئے۔ وزیر ریاست شعیب قریشی کے ہاں جو ان کے داماد بھی تھے، ٹھہرے لیکن نواب حمیداللہ خاں نے زبردستی اپنا مہمان بنایا۔ میں بھی اسی زمانہ میں بیمار ہو کر اپنے بڑے بھائی کے ہاں گیا ہوا تھا۔ محمد علی بسترِ علالت پر دراز تھے۔ اور یہی بسترِ علالت ان کے لیئے بالآخر بسترِ مرگ ثابت ہوا۔ میں اکثر ان کی خدمت میں پہنچ جاتا اور وہ افسانۂ غمِ دل لے کر بیٹھ جاتے۔ یہ افسانۂ غمِ دل سُن کر غیروں کا دل دو نیم ہو جاتا تھا تو خود ان پر کیا کچھ نہ گزر رہی ہو گی۔ انہیں اپنی بیماری کی فکر نہ تھی۔ اپنے چہیتے اور پرانے ساتھیوں کی بیوفائی کا اتنا غم نہ تھا۔ جتنی یہ فکر، جتنا یہ دھڑکا کہ ملتِ اسلامیہ اس بھنور سے کس طرح صحیح سلامت نکلے گی!

یہی چیز تھی جس نے انہیں مجبور کر دیا کہ بسترِ مرگ پر لندن جائیں۔ گئے اور وہاں جاکر اعلان کیا کہ اگر آزادی نہ ملی تو غلام دیس میں زندہ واپس نہیں جائیں گے۔ آزادی نہیں ملی اور گو غلام دیس کی خاک نے انہیں اپنی طرف کھینچا لیکن ؎

خاک قدس اورا با آغوشِ تمنا در گرفت
رفت در فردوس تاں راہے کہ پیغمبر گذشت

نہ جانے کہ اقبال کا یہ بہترین مرثیہ اُن کے مجموعۂ کلام میں کیوں نہیں شامل کیا گیا؟

محمد علی کی موت پر سب روئے دوست بھی اور دشمن اور آنسو سب کی چشم دل سے ٹپکے تھے۔ جن لوگوں کو محمد علی سے، ان کی سیاست سے اور ان کی صحافت سے اختلاف تھا وہ بھی محسوس کرتے تھے کہ محمد علی متحدہ ہندوستان کا انمول ہیرا تھا جسے موت نے چھین لیا۔

میرا یہ حال تھا کہ یہ خبر سُنی تو ضبطِ گریہ ناممکن ہوگیا۔ کئی دن تک یہ عالم رُہا کہ محمد علی کی یاد آئی اور آنکھوں سے آنسو رواں ہوئے اور ایسا دن میں کئی کئی مرتبہ ہوتا تھا۔ بہت دنوں کے بعد طبیعت سنبھلی لیکن اب تک یہ کیفیت ہے کہ جب محمد علی کا ذکر چھڑتا ہے، اس کا نام سُنتا ہوں، اس کی کوئی تحریر نظر سے گزرتی ہے، تو دل میں عقیدت کا ایک گہرا جذبہ بیدار ہو جاتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے حال پچھلے قدموں دوڑتا ہوا ماضی میں پہنچ گیا ہے اور وہ مجاہدِ صف شکن معروفِ جہاد ہے۔ برطانوی استعمار سے بھی، ہندو سامراج سے بھی اور رفیقانِ گریز پا سے بھی۔ وہی فگار جسم لیکن وہی تیور، وہی دبدبہ۔ اللہ اس پر رحمت کرے۔ اللہ ہم میں پھر کوئی محمد علی پیدا کردے کہ جتنی محمد علی جیسے لیڈر کی آج ضرورت ہے پہلے نہ تھی۔"

۳۰/ستمبر ۱۹۷۸ء

صاحبزادہ قطب عالم صاحب، صاحبزادہ صفی اللہ صاحب کے چچازاد بھائی اور نواب شہاب الدین صاحب نے ملاقات کی۔

-●-

۳/ اکتوبر ۱۹۷۸ء

کرنل عبدالمجید صاحب کی قیادت میں پاکستان سٹیل ملز ایسوسی ایشن کا ایک وفد ملا۔

۴/ اکتوبر ۱۹۷۸ء

۱۔ بریگیڈیئر اشتیاق صاحب نے ملاقات کی۔
۲۔ کرنل آئی ایس ایم بی علوی پرنسپل تربیلا اکیڈمی اور امیر ظہیر خاں اسسٹنٹ ڈائریکٹر نے عصر کے بعد مولانا محترم سے ملاقات کی۔

۶/ اکتوبر ۱۹۷۸ء

مولانا مفتی سید سیاح الدین صاحب کاکاخیل ممبر اسلامی نظریاتی کونسل نے ملاقات کی اور بعض وقتی اور ملکی مسائل پر تبادلۂ خیال کیا۔

۷/ اکتوبر ۱۹۷۸ء

۱۔ انعام اللہ خاں ایئر کموڈور پشاور۔ نے ملاقات کی اور ایئر فورس کی موجودہ صورتِ حال پر تبادلۂ خیال کیا۔
۲۔ جسٹس شمیم حسین قادری صاحب نے ملاقات کی۔

۸/ اکتوبر ۱۹۷۸ء

آج بھی بعد نماز مغرب جسٹس شمیم حسین قادری صاحب تشریف لائے اور ڈیڑھ گھنٹہ مولانا کے پاس رہے۔

—

۱۳/ اکتوبر ۱۹۷۸ء

مولانا شریف اللہ صاحب، مولانا محترم کے استاذِ مکرم تشریف لائے. ان کے ساتھ ان کے بڑے صاحبزادہ ڈاکٹر حامد خاں حامد صاحب بھی تھے. ڈاکٹر صاحب گورنمنٹ کالج لاہور میں شعبۂ فارسی کے استاذ ہیں اور فارسی اور اردو ادب کا عمدہ ذوق رکھتے ہیں۔

مولانا شریف اللہ خاں صاحب دارالعلوم فتح پوری دہلی میں منطق، فلسفہ اور عربی ادب و بلاغت کے استاد تھے۔ مولانا محترم نے مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب مرحوم کی سفارش پر متذکرہ علوم کی تعلیم کے حصول کے لیے الگ سے وقت لیا اور ان علوم کو ان سے باقاعدہ پڑھا۔ مولانا شریف اللہ صاحب نے ان علوم سے فراغت کی سند بھی عطا کی تھی۔ ۱۳/ جنوری ۱۹۲۶ء کو جاری کی جانے والی سند "وثائق مودودی" میں موجود ہے۔

پاکستان بننے کے بعد مولانا شریف اللہ خاں صاحب بھی پاکستان میں تشریف لے آئے۔ مولانا موصوف کا اصلی وطن سوات تھا۔ پاکستان میں مختلف مدارس میں تدریس کی خدمات انجام دیتے رہے۔ آخری دور میں لاہور میں جامعہ مدینہ راوی پارک میں تدریسی فرائض انجام دے رہے تھے کہ اسی دوران میں مولانا محترم سے ملاقات ہوگئی۔ ایک دن خود تشریف لائے۔ مولانا محترم نے پہچان لیا۔ کافی دیر تک مولانا کے پاس تشریف فرما رہے۔ کچھ ہی عرصہ پہلے ان پر فالج کا حملہ ہوا تھا۔ علاج جاری تھا۔ مولانا محترم نے علاج کے اخراجات کی پیشکش فرمائی جسے بالآخر منظور کر لیا گیا، چنانچہ استاد صاحب نے فرمایا کہ جب تک علاج جاری ہے آپ اتنا خرچ دے دیا کریں جتنا دہلی میں بطور ٹیوشن

فیس دیا کرتے تھے۔ مولانا محترم نے فرمایا کہ اس وقت کی کرنسی میں اور آج کی کرنسی میں فرق کی جو نسبت ہے اس حساب سے ماہانہ پیش کیا جاتا رہے گا۔ مولانا محترم نے فرمایا کہ اس وقت دہلی میں جو فیس دیا کرتا تھا اب وہی فیس بیس گنا اضافے کے ساتھ پیش کی جائے گی، چنانچہ ہر انگریزی مہینے کی پہلی تاریخ کو راقم الحروف یہ رقم (۴۰۰/ روپے) پیش کرنے کے لئے استاد صاحب کے مکان پر چوبرجی کوارٹرز میں حاضر ہوتا۔ استاد صاحب اپنے بڑے صاحبزادے پروفیسر حامد خاں کے ہاں رہتے تھے۔

مولانا محترم جب علاج کے لئے امریکہ جانے لگے تو دوسرے بہت سے ماہانہ وظائف کے ساتھ ساتھ استاد صاحب کے ماہانہ وظیفے کی تاکید فرمائی اور راقم الحروف کو تاکید فرمائی کہ ہر ماہ بلاتاخیر استاد صاحب کی خدمت میں وظیفہ پہنچتا رہے، چنانچہ اس پر عمل کیا گیا۔ اسی دوران میں ۳۱/ اگست ۱۹۷۹ء کی رات استاد صاحب کا انتقال ہوگیا۔ یکم ستمبر کو صبح تقریباً دس بجے جنازہ پڑھا گیا۔ امیر جماعتِ اسلامی پاکستان محترم میاں طفیل محمد صاحب مرکز کے دیگر حضرات اور راقم الحروف نمازِ جنازہ میں شریک ہوئے۔ اور تین ہفتے بعد ۲۲/ ستمبر ۱۹۷۹ء کو مولانا محترم کا امریکہ کے ایک ہسپتال میں انتقال ہوگیا۔

رحمہما اللہ تعالیٰ۔

حدیث اور فقہ کی بڑی کتابیں مولانا محترم نے ۱۹۲۷ء، ۱۹۲۸ء میں مولانا اشفاق الرحمٰن کاندھلوی صاحب سے پڑھی تھیں۔ مولانا کاندھلوی صاحب مدرسہ عالیہ عربیہ فتح پوری دہلی میں استاد تھے۔ کاندھلوی صاحب سے فراغت کی دو سندیں "وثائق مودودی" میں موجود ہیں۔

مولانا عبدالسلام نیازی مرحوم مولانا محترم کے استاد تھے۔ ان کا

بھی ذکر پہلے ہو چکا ہے۔

۱۴/ اکتوبر ۱۹۷۸ء

راولپنڈی سے بارہ علماءِ کرام کا وفد مولانا سے ملا۔ مختلف ملکی سیاسی حالات اور نظامِ مصطفیٰ کے نفاذ کے بارے میں گفتگو ہوتی رہی۔

۲۲/ اکتوبر ۱۹۷۸ء

آسٹریلین ایمبیسیڈر کے فرسٹ سیکرٹری نے مولانا سے ملاقات کی۔ یہ ملاقات ایک گھنٹہ پانچ منٹ تک جاری رہی۔ گفتگو انگریزی میں ہوتی تھی۔ ملاقاتی سیکرٹری کا نام مسٹر کیتھ بیکر (Keith Baker) تھا۔

۲۳/ اکتوبر ۱۹۷۸ء

ڈاکٹر معروف دوالیبی، صدر مؤتمر عالمِ اسلامی و سیاسی مشیر شاہ خالد، ان کے سیکرٹری حیدر حسینی صاحب، مفتی اعظم فلسطین مرحوم کے داماد بھی ساتھ تھے۔ نیز جسٹس محمد افضل چیمہ صاحب چیرمین نظریاتی کونسل، انکے سیکرٹری، اور چیف ایڈمنسٹریٹر اوقاف پنجاب، چودھری محمد شریف صاحب ان کے ہمراہ تھے۔ امیر جماعتِ اسلامی پاکستان محترم میاں طفیل محمد صاحب بھی اس موقع پر موجود تھے۔۔۔۔ یہ ملاقات ایک گھنٹہ رہی۔ مہمانوں سے گفتگو عربی میں ہوئی۔

۲۴/ اکتوبر ۱۹۷۸ء

بی بی سی لندن کے نمائندہ مسٹر (Chris Sherwell) نے ملاقات کی۔ تین سوال کیئے:-

۱۔ اِسلامی دستور میں علماء کا اختلاف کیوں ہے؟
۲۔ جُداگانہ طریقِ انتخاب کا کیا جواز ہے؟
۳۔ صدرِ پاکستان کی پیش کش کہ قومی اتحاد ایک جماعت کی شکل اختیار کرے تو حکومت ان کے حوالے کر دی جائے گی؟

مولانا محترم نے مناسب اور مختصر جوابات دیے۔ گفتگو انگلش میں تھی۔

۲۶/اکتوبر ۱۹۷۸ء

۱۔ الطاف گوہر صاحب نے ملاقات کی۔ ایک گھنٹہ پندرہ منٹ تک مولانا محترم کے ساتھ رہے۔

۲۔ امام محمد یونیورسٹی ریاض (سعودی عرب) کے بارہ رُکنی وفد نے مولانا سے ملاقات کی۔ وفد کے سربراہ ڈاکٹر عمر عودہ تھے۔ وقت کم ہونے کی وجہ سے ملاقات مختصر رہی۔

۳۰/اکتوبر ۱۹۷۸ء

اِسلامی جمعیت طلبہ کا سالانہ اجتماع ۲۷/اکتوبر کو لاہور میں شروع ہُوا ۳۰/اکتوبر کو آخری اجلاس کے بعد شرکاءِ اجلاس مولانا سیّد ابو الاعلیٰ مودودیؒ کے پاس ان کے مکان پر حاضر ہوئے۔ مولانا نے ایک بصیرت افروز خطاب فرمایا۔ اس کا مکمل متن درج ذیل ہے:۔

میرے عزیز نوجوانو!

"میں آپ کا بہت شکر گزار ہوں کہ میری بیماری کا لحاظ کرتے ہوئے آپ میرے پاس آئے۔ میں اس قابل نہیں تھا کہ کوئی تقریر کر سکوں، لیکن مجھے یہ احساس ہے کہ اِسلامی

جمیعت طلبہ کے کل پاکستان اجتماع میں جمع ہونے والے ارکان اور رفقاء سے خطاب کرنے کا شاید مجھے پھر موقعہ نہ مل سکے، اس لیئے میں آپ کے سامنے صرف دو ضروری باتیں رکھنا چاہتا ہوں۔

پہلی بات یہ ہے کہ جن لوگوں کو خدا کے دین کا کام کرنا ہو، ان کے لیئے سب سے زیادہ ضروری چیز نیت کا اخلاص ہے۔ انہیں خدا کے دین کا کام خالص خدا کے لیئے کرنا چاہیئے۔ ان کے دل میں کوئی نفسانی، خاندانی، وطنی یا علاقائی یا کوئی دوسری غرض نہیں ہونی چاہیئے۔ صرف یہ مقصد ہونا چاہیئے کہ خدا کی زمین پر خدا کا کلمہ بلند ہو، اسکے ملک میں اسی کا نظام غالب ہو اور خدا کی مخلوق اس کے دیئے ہوئے نظامِ زندگی کی برکات سے مستفید ہو۔ جو کام نیت کے خلوص سے کیا جائے، اللہ تعالیٰ اس میں برکت دیتا ہے، اسے فروغ دیتا ہے اور اسے پروان چڑھاتا ہے۔ شیطانی کام اس لیئے پروان چڑھتے ہیں کہ خدا تعالیٰ ان کی رسّی دراز کرتا ہے اور انہیں اس کا موقع دیتا ہے لیکن خدا کے دین کا کام صرف اسی وقت فروغ پاتا ہے۔ جب نیت بالکل صحیح ہو۔

آپ خود اپنی تاریخ سے سبق حاصل کر سکتے ہیں۔ جمیعت کے آغاز کے وقت دسمبر ۱۹۴۷ء میں صرف ۲۵، ۳۰ طلبہ تھے، لیکن ۳۰ سالوں میں یہ کام اتنی ترقی کر گیا ہے کہ سارے ملک کی تعلیم گاہوں پر چھا گیا، مغربی پاکستان کے تمام حصّوں میں دُور دُور تک پھیل گیا، مشرقی پاکستان کے تمام حصّوں میں پھیلا ہوا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب ضرورت پڑی تو وہاں اللہ کے

دین کے لیئے کٹ مرنے کا جذبہ ہزاروں نوجوانوں کے دلوں میں پیدا ہوا اور انہوں نے اپنے ملک کو بچانے کے لیئے جسم و جان کی قربانیاں پیش کیں۔ آپ جو کام بھی کریں خالص دین کے لیئے کریں اور دنیاوی اغراض سے بالاتر ہو کر کریں، اب حالات اس مقام پر پہنچ گئے ہیں کہ آج نہیں تو چند روز بعد اس کام کو فروغ حاصل ہوگا اور ملک کا انتظام چلانے کا کام بھی آپ کے ذمّے لگنے والا ہے۔

امام احمدؒ بن حنبل نے کہا تھا کہ" میرے لیئے معتصم کے کوڑے اتنی بڑی آزمائش نہ تھے جتنے اشرفیوں کے توڑے"۔ آپ خدا کے نظام کو برپا کرنے کے لیئے کسی نفسانی و خاندانی و وطنی یا کسی دوسری غرض کے لیئے کام نہ کریں بلکہ صرف اللہ کے لیئے کریں۔

دوسری بات یہ ہے کہ اس ملک میں آپ جتنی خرابیاں پاتے ہیں، دینی، معاشی، سیاسی، جس میدان میں اور جس حیثیت میں یہ خرابیاں موجود ہیں، یہ سب تعلیم یافتہ طبقے کے بگاڑ کا نتیجہ ہیں۔ عوام الناس کو بھی بگاڑنے میں تعلیم یافتہ طبقے کا ہاتھ ہے، بددیانتی، رشوت اور دوسرا ہر قسم کا بگاڑ اس طبقے کا پیدا کردہ ہے۔ نظامِ حکومت کو چلانے والے، معاشی پالیساں مرتب کرنے والے اور زندگی کے دوسرے شعبوں کا انتظام کرنے والے جدید تعلیم یافتہ لوگ ہیں اور ان تمام شعبوں میں بگاڑ اس نظامِ تعلیم کا نتیجہ ہے جو انگریزوں کے زمانے سے چلا آرہا ہے انگریزوں کے رخصت ہو جانے کے بعد ان کے خلفاء اس نظام کو جوں کا توں چلا رہے ہیں اور اس میں اب تک کوئی فرق نہیں آیا۔ یہ محض اللہ کا فضل تھا کہ اس نظامِ تعلیم

کے باوجود آپ کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ آپ اللہ کے دین کے لیے کام کریں۔ حالانکہ یہ نظام سوائے بے مقصدیت پھیلانے اور بدکردار بنانے کے اور کوئی کام نہیں کر سکتا تھا۔ اب جو کام آپ کو بڑے پیمانے پر کرنا ہے، وہ یہ ہے کہ تعلیم یافتہ طبقے کے بیگاڑ کو دور کریں۔ اس طبقے کے بگاڑ کو دور کرنے کے لیے جو کچھ بھی آپ کر سکیں، آپ کو کرنا چاہیے۔ جب آپ اپنے ساتھی طالب علموں کو اتنے بڑے پیمانے پر راغب کر سکتے ہیں تو تعلیم یافتہ طبقے کو بھی ساتھ ملا سکتے ہیں۔ شرط یہ ہے کہ دردِ دل، صداقت، خلوص و محبت اور ہمدردی کے ساتھ اس طبقے کو دین کی طرف راغب کیا جائے اور اس میں اِسلامی کیریکٹر پیدا کیا جائے۔ جو لوگ تعلیمی زندگی سے فارغ ہو کر عملی زندگی میں داخل ہو چکے ہوں، وہ جس دائرے میں بھی ہوں وہاں گرد و پیش کے لوگوں کو تبدیل کرنے کی کوشش کریں اور ان میں اسلامی سیرت و کردار پیدا کریں۔ جتنی زیادہ محنت اور جتنے زیادہ بڑے پیمانے پر یہ کام کیا جائے گا، اسلام کے قیام کی راہ اتنی ہی جلدی ہموار ہوگی۔

اِسلامی نظام کا قیام ہتھیلی پر سرسوں جمانے کی طرح نہیں ہے۔ جب تک بگاڑ دُور نہ کیا جائے، بناؤ کا کام نہیں ہو سکتا۔ بگڑے ہوئے ماحول کو درست کرنے کے لیے جسم اور دماغ کی تمام صلاحیتوں کو صرف کر دیں۔

میری دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان نوجوانوں کو جو اس کی رضا کے طالب ہیں، ایمان کی روشنی عطا فرمائے۔ انہیں زیادہ سے

زیادہ اپنے دین کی خدمت کرنے اور دین کا جھنڈا بلند کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور انہیں دین کی سمجھ عطا فرمائے۔ ان میں دینی کیریکٹر اور دینی سیرت و کردار پیدا کرے اور ان میں اتنی جاذبیت پیدا کرے کہ وہ دوسروں کی زندگیوں کو اپنے کردار سے متاثر کرے انہیں بھی اسلام کے سانچے میں ڈھال سکیں۔"

-●-

۲؍نومبر ۱۹۷۸ء

حسن بن نصرالدین احمد (اٹلی سے) نے ملاقات کی۔

۵؍نومبر ۱۹۷۸ء

۱۔ قونصل جنرل کوریئن ان پاکستان نے تقریباً پون گھنٹہ ملاقات کی۔
۲۔ آج ہی مولانا عبدالحق جامی صاحب جاپنور، چاچڑاں، نے ملاقات کی۔

۶؍نومبر ۱۹۷۸ء

چودھری رحیم داد صاحب، چیف جسٹس، سپریم کورٹ آزاد کشمیر مظفرآباد تشریف لائے۔ پون گھنٹہ ملاقات رہی۔ پہلے بھی تشریف لا چکے ہیں۔

۱۲؍نومبر ۱۹۷۸ء

اخبار "اسلامیہ جمہوریہ" لاہور کو انٹرویو دیا۔ انٹرویو کا متن مولانا محترم کی نظرِثانی کے بعد، ہیڈ بل کی شکل میں شائع ہو گیا تھا۔ نظرِثانی شدہ متن درج ذیل ہے:۔

"اسلام ایک مکمل ترین ضابطۂ حیات ہے، اِسے مختلف حصوں میں تقسیم نہیں کیا جاسکتا۔ صرف اسلامی قوانین کے نفاذ کا نام اسلامی نظام کا نفاذ نہیں ہے، بلکہ زندگی کی اُس پُوری سکیم کو نافذ کرنا ضروری ہے جو اسلام نے ہمیں دی ہے، اور قانون اس اسکیم کا ایک اہم حصہ ہے۔ جو مجموعے سے الگ کر کے نافذ کر دیا جائے تو یہ اسلامی نظام کا نفاذ نہ ہو گا۔ اگر ہم زندگی کے پُورے نظام کو اسی طرح جاہلیت کی راہ پر چلنے دیں جس طرح وہ چل رہا ہے اور صرف اسلامی قانون کو عدالتوں کے ذریعہ سے نافذ کر دیں، تو اس کے وہ نتائج نہیں ہو سکتے جو اسلام کو مطلوب ہیں۔ اس کی مثال کچھ

ایسی ہے جیسے چولہے میں آگ جل رہی ہو، ہنڈیا چولہے پر رکھی ہو، اور ہم برف رکھ رکھ کر اسے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کریں ـــ ٹھنڈی تو وہ تب ہو جب آگ اس کے نیچے سے نکال دی جائے۔ معاشرے میں برائیوں کے اسباب جوں کے توں رہیں اور ہم صرف قانون کے ذریعہ سے اصلاح کی کوشش کریں تو آخر اصلاح کیسے ہو جائے گی؟

آپ ایک سہانی صبح یا کسی تابناک رات کو اِسلامی قانون کے نفاذ کا اعلان کر سکتے ہیں، مگر اس پر عمل درآمد کرنے والی مشینری تو وہی ہوگی جو اب تک کفر کا قانون نافذ کرتی رہی ہے، اور لوگ بھی وہی ہوں گے جن کی عظیم اکثریت کو مدّتِ دراز کے غیر اِسلامی اقتدار نے بگاڑ رکھا ہے۔ صرف ایک اعلان سے تو آپ اُن کے سینے ایمان کے نورُ سے، ان کے ذہن اِسلام کے علم سے، ان کی عادات و خصائل اِسلامی اخلاق سے مزیّن نہیں کر سکتے۔

برِصغیر ہند میں جب انگریز آئے تو یہاں اِسلامی تعلیم رائج تھی، مسلمانوں کی اپنی تہذیب قائم تھی، ان کا اپنا تمدن موجود تھا، ان کی اپنی روایات باقی تھیں، ان کی اخلاقی اقدار محفوظ تھیں اور مُلک میں اِسلامی قانون نافذ تھا۔ اب دیکھئے کہ انگریزی اقتدار نے اس صورتِ حال کو کس طرح بدلا۔ اس نے صرف اتنا ہی نہیں کیا کہ ہمارے قانون کو منسوخ کر کے اپنا قانون جاری کر دیا، بلکہ اس نے ہر طرف سے ہمارے نظامِ زندگی پر حملہ کیا اور ہر پہلو سے ہمارا گھیراؤ کیا۔ اس نے ہمارے نظامِ تعلیم کی جگہ اپنا نظامِ تعلیم رائج

کر کے اسی کو رزق اور ترقی کا ذریعہ بنا دیا۔ ہماری زبان پر اپنی زبان کو غالب کر دیا۔ ہماری تہذیب اور ہمارے تمدن کو حقیر بنا کر اپنی تہذیب اور اپنے تمدن کو عظمت و وقار کے مقام پر فائز کیا۔ ہمیں پیٹ کی مار دے کر ہماری گردن اقتدار کے آگے جھکائی اور ہمیں ضمیر، ایمان، غیرت، غرض اپنا سب کچھ بیچ ڈالنے کا خوگر بنا دیا۔ اپنے نظامِ معیشت کو ہم پر مسلط کر کے کسبِ حلال کے راستے تنگ اور حرام خوری کے سارے راستے کھول دیئے۔ اپنے سیاسی نظام کو رائج کر کے ہمارے تصورِ حکومت کو اس طرح فنا کیا کہ ہم یہ سوچنے کے قابل ہی نہ رہے کہ ہمارا بھی کوئی سیاسی نظام ہے۔ قانون کی تبدیلی کے ساتھ یہ تمام تغیرات جب برپا ہوئے، تو انگریز کو کبھی یہ کہنے کی ضرورت پیش نہیں آئی کہ اپنا دین بدلو، اپنے افکار و نظریات بدلو، اپنی اخلاقی اقدار بدلو، اپنی تہذیب بدلو—— یہ سب کچھ ہم خود ہی بدلتے چلے گئے۔ ہمارے ایمان و اخلاق کی جڑیں غیر محسوس طریقے سے کھوکھلی ہوتی چلی گئیں۔ ہمارے لیے ہر حرام، حلال ہوتا چلا گیا اور حلال کی طرف ہماری رغبت مفقود ہوتی چلی گئی۔ انگریز کے افکار و نظریات ہمارے ذہنوں پر مسلط ہو گئے اس کی زبان، اس کے لباس، اس کی تہذیب، اس کے طرزِ زندگی کو ہم نے فخر کے ساتھ قبول کر لیا اور ہم میں وہ تمام فواحش وبا کی طرح پھیل گئے جو انگریزی تہذیب کی خصوصیات میں شامل تھے۔ اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ ایک قوم بدلتی ہے تو کیسے بدلتی ہے۔

اب ذرا دیکھئے، انگریز کے رخصت ہونے کے بعد آزادی کے پہلے لمحے سے لے کر آج تک ہم نے آخر اُن چیزوں میں سے کس چیز کو تبدیل کیا؟ تبدیل کرنا تو درکنار، ہم اُسی راستے پر آگے ہی آگے بڑھتے چلے گئے ہیں جس پر انگریز ہمیں ڈال گیا تھا۔ تعلیم وہی ہے، بلکہ پہلے سے بدتر نتائج دکھا رہی ہے اور ہماری درسگاہوں پر ایسے استادوں کی ایک پوری کھیپ مسلّط ہے جو نئی نسلوں کو بے دین اور بدکردار بنانے پر تُلے ہوئے ہیں۔ اس شراب کو ہمارے ہاں مخلوط تعلیم کی روز افزوں ترویج دو آتشہ بنا رہی ہے۔ معاشی اور سیاسی نظام بھی ہمارے ہاں وہی ہے جو پہلے تھا، بلکہ اس کی خرابیوں میں بھی ہم پہلے سے زیادہ اُلجھتے چلے جا رہے ہیں۔ اور اِس گاڑی کے چلانے والے ذہن اِس راہ سے ہٹ کر کسی دوسرے نظام کو ممکن تصور کرنے کے لیئے بمشکل ہی تیار ہوتے ہیں۔ زبان اور تہذیب و تمدن اور طرزِ زندگی پر آج بھی انگریزیت چھائی ہوئی ہے، بلکہ خود انگریز کے دورِ حکومت میں وہ اتنی نہ چھائی تھی۔ اس پر مزید وہ عام اخلاقی بگاڑ ہے جو ہماری زندگی کے ہر گوشے میں پہلے سے بہت زیادہ پھیل چکا ہے، اور پھیلتا چلا جا رہا ہے۔ ہماری انتظامیہ کی عظیم اکثریت رشوت، خیانت، اور فرائض سے غفلت میں مبتلا ہے۔ ہمارے کاروباری طبقوں میں کم ہی ایسے ہیں جو حرام طریقوں سے دولت کمانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے دیتے ہوں۔ ہمارے وسائلِ نشر و اشاعت اور ذرائع ابلاغ بڑے پیمانے پر لوگوں میں

فواحش، جرائم اور بدکرداری پھیلانے میں لگے ہوئے ہیں اور ہمارے معاشرے میں، نظامِ معیشت وسیاست میں اور ملکی نظم ونسق میں ان برائیوں کے محرکات اور مواقع زیادہ سے زیادہ بڑھتے چلے جارہے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ اگر حالات جوں کے توں باقی رہیں تو کیا یہ ممکن ہے کہ ہم صرف اسلامی قوانین کو نافذ کرکے وہ مقصد حاصل کرسکیں جس کے لیے اِسلام نے یہ قوانین ہم کو دیے ہیں؟ شریعت کا فوجداری قانون آپ چاہیں تو ایک دن میں جاری کردیں، مگر اس کے تحت مجرموں کو پکڑے گا کون؟ کیا یہی پولیس۔ جو انصاف کی دشمن، مجرموں کی پشت پناہ اور بے گناہوں پر ظلم کرنے میں حد درجہ بے باک ہے؟ پھر عدالتوں کی وہ شہادتیں کہاں سے ملیں گی جن سے کسی شخص کے مجرم یا بے گناہ ہونے کا فیصلہ انہیں کرنا ہوگا؟ کیا وہ اِسی معاشرے سے بہم پہنچیں گی جس میں جھوٹے گواہوں کی کوئی کمی نہیں ہے؟ اس سے بھی بڑھ کر اہم سوال یہ ہے کہ اِسلام کا منشا کیا اِس طرح پورا ہوسکتا ہے کہ مُلک کا معاشی نظام یہی رہے جو ڈاکے اور چوری کے محرکات سے لبریز ہے، ملک میں قانون کو نافذ کرنے کی مشنری بھی یہی رہے جو ان جرائم کے لیے پُورے مواقع فراہم کرتی ہے، اور عدالتیں ان لوگوں کو شرعی سزائیں دے ڈالیں جو ڈاکہ ڈالیں یا چوری کریں؟ نیز کیا اِسلام یہی چاہتا ہے کہ فواحش کی اشاعت اِسی طرح جاری رہے، ہیجان انگیز فلم، تصویریں، لٹریچر اس طرح سفلی جذبات کو اُکساتے رہیں، بنی سنوری عورتیں اِسی طرح برسرِعام پھرتی

رہیں، کالجوں، دفتروں، کلبوں اور دوسرے بہت سے مقامات پر اختلاطِ مرد و زن اسی طرح جاری رہے، اور ان حالات میں جو شخص زنا کا ارتکاب کرے اُس کی پیٹھ پر قانون کوڑے برسا دے؟ اگر ان سوالات کا جواب نفی میں ہے، اور لازمًا نفی ہی میں ہونا چاہیئے، تو پھر یہ تسلیم کیئے بغیر چارہ نہ رہے گا کہ اِسلام صرف اپنے قانون ہی کا نفاذ نہیں چاہتا، بلکہ اپنی اُس پوری اسکیم کا نفاذ چاہتا ہے جو اُس نے نظامِ زندگی کے لیئے ہمیں دیا ہے اور زندگی کے اس پورے ہنجار کی تبدیلی چاہتا ہے جو اس وقت ہمارے مُلک میں پایا جاتا ہے۔

یہ جو کچھ مَیں نے کہا ہے اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ غیر اِسلامی قوانین کی جگہ اِسلامی قانون کے نفاذ کا خیال چھوڑ دیا جائے۔ اس کے برعکس جو بات میں کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ اسلامی قانون کے نفاذ اور نظامِ زندگی کی ہمہ گیر اور ہمہ جہت تبدیلی کا کام ایک ساتھ کیا جائے۔ جس طرح انگریز نے ہر طرف سے ہمارے نظامِ حیات پر حملہ کر کے اور ہر پہلو سے اس کو گھیر کر اپنے سانچے میں اسے ڈھالا تھا، اُسی طرح اب ہمیں اس کی چھوڑی ہوئی پوری میراث پر ہر جہت سے حملہ کرنا چاہیئے اور ہر شعبۂ حیات میں اس کا قلع قمع کر کے اِسلام کے پُورے نظام کو عملاً قائم کرنا چاہیئے۔ اس مقصد کے لیئے قانون کی تبدیلی کے ساتھ جو اقدامات کرنے ضروری ہیں انہیں میں مختصراً بیان کرتا ہوں:۔

ا۔ نظامِ تعلیم کو یکسر تبدیل کیا جائے اور علوم و فنون کے ہر شعبے کا نصاب اِسلامی نقطۂ نظر کے مطابق ترتیب دیا جائے۔

کوئی نظریاتی مملکت اپنی درسگاہوں میں نرسری سے لے کر اعلیٰ تعلیم تک کسی مرحلے اور کسی گوشے میں اپنے نظریے سے مختلف کسی علم یا فن، یا ذہنی تربیت کے کسی طریقہ کا دخل گوارا نہیں کرتی۔ مثال کے طور پر چین، روس اور دوسرے اشتراکی ممالک کے نظامِ تعلیم کو دیکھ لیا جائے۔ مغربی ممالک میں بھی کہیں ایسا نظامِ تعلیم نہیں پایا جاتا جو ان کی نسلوں کو ان کے بنیادی نظریات اور اصولوں سے منحرف کر دینے والا ہو۔

۲۔ درسگاہوں کے لیئے استادوں کے انتخاب میں سب سے مقدم یہ بات ہونی چاہیے کہ ہر استاد اسلام کا علم رکھتا ہو، اسلامی نظریہ میں پختہ ہو اور عملاً بھی اسلامی احکام کا پابند اور اسلامی اخلاق سے متصف ہو۔ ہماری کسی درسگاہ میں کسی ایسے استاد کا وجود گوارا نہ کیا جائے جو اسلام کے خلاف نظریات رکھتا ہو اور اخلاقی حیثیت سے بھی اس کا کردار درست نہ ہو۔ کوئی صاحبِ عقل و دانش قوم دنیا میں ایسی نہیں ہے جو اپنی اولاد کو دشمنوں کے حوالے کر دیتی ہو تاکہ وہ ان کی لوحِ سادہ پر جو نقش چاہیں ثبت کر دیں، خواہ وہ اس کی موت کا پروانہ ہی کیوں نہ ہو۔

۳۔ مخلوط تعلیم غیر مسلموں کی نگاہ میں خواہ کتنی ہی قابلِ قبول یا پسندیدہ ہو، اسلام کے نقطۂ نظر سے وہ معاشرے کے لیئے قطعی تباہ کن ہے اور کوئی شخص جو ادنیٰ سی بھی اسلامی حس رکھتا ہو، اُن نتائج کے لیئے ہرگز تیار نہیں ہو سکتا جو اس سے برآمد ہوتے ہیں، اور عملاً برآمد ہو رہے ہیں۔ جو لوگ اس کی حمایت کرنے والے ہوں وہ اسلام پر بڑا کرم کریں گے اگر یہ زہرِ ہلاہل مسلمانوں کی اولاد کو پلانے کے

ساتھ اسلامی قانون نافذ کرنے کے پاکیزہ عزائم کا اظہار چھوڑ دیں۔ پاکستان کو اگر اسلامی مملکت بننا ہے، تو یہاں لڑکیوں کی تعلیم کے لیئے لازماً الگ درسگاہیں اور یونیورسٹیاں بھی قائم ہونی چاہئیں۔

۴۔ لاء کالجوں کی تعلیم میں بلا تاخیر عربی زبان، قرآن، حدیث اور فقہ کی تعلیم کا پورا انتظام کیا جائے اور ہمارے قانون دانوں کو تقویٰ کی تربیت بھی دی جائے تاکہ آئندہ ہماری عدالتوں کو موزوں قاضی اور وکیل بہم پہنچ سکیں۔

۵۔ تمام ان اداروں میں جو ہمارے ہاں مختلف سرکاری ملازمتوں کی ٹریننگ کے لیئے قائم ہیں اسلامی تعلیم اور اخلاقی تربیت کا انتظام کیا جائے تاکہ حکومت کو صرف کارواں ملازم ہی نہیں بلکہ ایسے ملازم مل سکیں جو ایماندار خدا ترس، فرض شناس اور دین کا علم رکھنے والے بھی ہوں۔

۶۔ اس وقت جو لوگ سرکاری ملازمت میں ہیں ان کے کردار کی چھان بین کی جائے۔ جو لوگ ناقابلِ علاج بددیانت ہیں ان کو رخصت کرکے اچھے کردار رکھنے والے نوجوانوں کو ملازمت میں لے لیا جائے، اور باقی لوگوں کے لیئے ہر مقررہ مدّت کے بعد ایسے ریفریشر کورس جاری کیے جائیں جن میں ان کو اسلامی تعلیم و تربیت دی جائے۔

۷۔ تفتیشِ جرائم کے شعبے کو چھوڑ کر سی آئی ڈی کا پورا محکمہ پولیس سے الگ کر لیا جائے اور اسے اس کام پر مقرر کیا جائے کہ وہ تمام سرکاری محکموں، افسروں اور ملازموں کے طرزِ عمل کی نگرانی کرے اور حکومت کو ہر قسم کی بدعنوانیوں کے بارے

میں صحیح اطلاعات بہم پہنچائے۔ اس کے ساتھ حکومت کی دوسری انٹیلی جینس ایجنسیاں بھی اسی نگرانی کے لئے استعمال کی جائیں تاکہ خبر رسانی کا کوئی ایک ذریعۂ حکومت کو غلط خبریں نہ دے سکے۔

۸۔ خلافِ اسلام نظریات اور فواحش اور جرائم کی اشاعت جن جن ذرائع سے بھی ہو رہی ہے ان کا سدِّ باب کیا جائے۔ کوئی نظریاتی مملکت اس بات کو برداشت نہیں کر سکتی کہ اس کے بنیادی نظریے اور اس کے اخلاقی اصولوں کے خلاف کسی قسم کا پرچار کیا جائے۔ اس میں اگر کوئی استثنا ہو سکتا ہے، تو وہ صرف یہ ہے کہ دوسرے مذاہب کے لوگ اپنے مذہب کی تعلیمات پر مشتمل کتابیں اور رسائل و جرائد شائع کرنے کے لئے آزاد ہوں۔

۹۔ تمام ذرائع نشر و اشاعت اور ذرائع ابلاغ ایک ایسی ہمہ گیر مہم کے لئے استعمال کیے جائیں جو عوام کو اسلامی عقائد اور احکام سے آگاہ کرے، ان میں خدا کا خوف اور آخرت کی جوابدہی کا احساس پیدا کرے، ان کے اندر صالح اخلاق کی طرف رغبت اور برائیوں سے نفرت پیدا کرے، اور نہایت معقول و مؤثر طریقوں سے لوگوں کو سمجھائے کہ زندگی میں خدا اور رسول کے احکام سے تجاوز کرنا اور اخلاقی حدود کو توڑنا انسان کو دنیا اور آخرت میں کیسے برے نتائج سے دوچار کرتا ہے۔

۱۰۔ ملک کے معاشی نظام میں اسلامی احکام کے مطابق ایسی تبدیلیاں لائی جائیں جن سے دولت کی تقسیم منصفانہ ہو،

دولت کمانے اور صَرف کرنے کے حرام طریقے بند ہوں، رزقِ
حلال حاصل کرنے کے مواقع عام لوگوں کے لیئے کھُلے ہوں،
کوئی شخص زندگی کی بنیادی ضروریات سے محروم نہ رہے،
اور ناجائز و ناپاک ذرائع سے جو لوگ قارون بن گئے ہیں اُن
کی دولت قانون کے ذریعہ سے واپس لی جائے۔"

۱۵/ نومبر ۱۹۷۸ء

حامد علی مراد بمبئی انڈیا سے، مشہور انڈین فلم پروڈیوسر اور ایکٹر ہیں.
ان کے والد مولوی وزیر علی صاحب مولانا محترم کے والد محترم کے اورنگ
آباد دکن میں قریبی ہمسایہ تھے اور ایک دوسرے کے ہاں آنا جانا تھا۔
مراد صاحب کی پیدائش اورنگ آباد ہی کی ہے۔ ۱۹۰۸ء میں پیدا ہوئے۔
جبکہ مولانا محترم بھی اورنگ آباد ہی میں ۱۹۰۳ء میں پیدا ہوئے۔

۱۶/ نومبر ۱۹۷۸ء

مولوی مشتاق حسین صاحب، چیف جسٹس بعد نمازِ مغرب تشریف لائے
اسلامک ریسرچ آفیسرز کے قیام کے بارے میں گفتگو ہوئی۔

۱۷/ نومبر ۱۹۷۸ء

مسٹر اے کے خالد صاحب ممبر ریونیو بورڈ نے ملاقات کی۔ عُشر کے
نفاذ پر گفتگو رہی۔

۱۸/ نومبر ۱۹۷۸ء

ڈاکٹر عبدالغفور بھٹی صاحب، مشیرِ زراعت حکومت پنجاب بعد نمازِ
عصر تشریف لائے۔ ان کی گفتگو کا موضوع بھی عشر کا نفاذ ہی تھا۔

۴/ دسمبر ۱۹۷۸ء

حکیم نیر واسطی صاحب تشریف لائے۔ نصف گھنٹہ ملاقات کی۔

۶/ دسمبر ۱۹۷۸ء

۱۔ عبدالرحمٰن صاحب، سابق وزیر اطلاعات انڈونیشیا مولانا سے ملے۔ تقریباً ڈھائی گھنٹے ملاقات رہی۔

۲۔ آج ہی ڈاکٹر بدری سوڈانی نے بھی ملاقات کی۔

۲۰/ دسمبر ۱۹۷۸ء

محمد نبی محمدی صاحب امیر جماعتِ علماءِ افغانستان نے مولانا سے ملاقات کی۔

۲۱/ دسمبر ۱۹۷۸ء

۱۔ مولانا عبدالحئ صاحب (رام پور انڈیا) نے ملاقات کی۔

۲۔ مقصود الرسول صاحب، ڈی ایس پی، رحیم یار خاں مولانا محترم سے ملے۔

۲۲/ دسمبر ۱۹۷۸ء

مرتضیٰ پویا صاحب اسلام آباد، نے آج مولانا سے ملاقات کی۔

۴/ جنوری ۱۹۷۹ء

پروفیسر ڈاکٹر محمد کشنو (Koeshnoe) (Surabaya Indonesia) -

چیرمین مڈل ایسٹ سٹڈیز، انڈونیشیا، نے مولانا محترم سے ملاقات کی۔ مولانا محترم نے اپنی کتاب "اسلامی ریاست" کا انگلش ترجمہ "Islamic Law and Constitution" ھدیۃً پیش کی۔

کچھ دیر مولانا محترم کے پاس رہے اور مختلف مسائل پر گفتگو ہوتی رہی۔ گفتگو انگلش میں تھی۔

۹؍جنوری ۱۹۷۹ء

۱۔ رشید احمد صدیقی صاحب، صدر یو کے اسلامک مشن، لندن مولانا محترم سے ملے۔ وہاں کے حالات اور مشن کی سرگرمیوں سے مولانا محترم کو آگاہ کیا۔

۲۔ ڈاکٹر عزیز الحق صاحب آذر بائیجان، ایران سے، پاکستانی ہیں، جو اسلامی جمعیت طلبہ میں کام کر چکے ہیں، مولانا سے ملاقات کی۔ وہاں کے حالات پر گفتگو رہی۔

۳۔ آج قبل دوپہر تقریباً ۱۲ بجے مولانا محترم منصورہ تشریف لے گئے۔ مولانا کے صاحبزادہ حسین فاروق صاحب گاڑی چلا رہے تھے۔ میں بھی ساتھ تھا۔ بیماری کی وجہ سے مولانا محترم بہت عرصہ سے منصورہ تشریف نہیں لے جا سکے تھے۔ منصورہ میں ان کی یہ آمد تقریباً ڈیڑھ سال بعد تھی اور بالکل اچانک تھی۔ محترم میاں صاحب پاؤں کی تکلیف کی وجہ سے گھر ہی میں تھے۔ اس لیئے گھر جا کر عیادت کی۔ بعد میں مسجد دیکھی۔ مولانا محترم بیماری کی وجہ سے چونکہ چل نہیں سکتے تھے اس لیئے دفتر کے کارکنان اور باہر سے آئے ہوئے بہت سے لوگ دفتر کے دروازہ پر جمع ہو گئے۔ سب نے مصافحہ کیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ منصورہ والوں نے اس خوشی میں مٹھائی تقسیم کی تھی۔

۱۱؍ جنوری ۱۹۷۹ء

جماعتِ اسلامی سیالکوٹ کا ۵۶ افراد پر مشتمل ایک وفد پروفیسر امین جاوید صاحب کی قیادت میں ملنے کے لئے آیا۔ سوالات کا جواب دیتے ہوئے مولانا محترم نے فرمایا:۔

"تحریک کے کارکنوں کو اس موقع سے بھرپور فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ کوئی لمحہ ضائع نہیں کرنا چاہیئے۔ انتخابی فہرستوں کی تیاری میں تعاون کرنا چاہیئے۔ یہ رابطہ عوام کا ایک اچھا ذریعہ ہے جس سے فائدہ اٹھانا چاہیئے۔"

پھر فرمایا:۔

"مکی دَور پر مشتمل سیرت کی دو جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔ بیماری کی وجہ سے آگے کام رُکا ہوا ہے۔ جہاں تک اس سلسلہ میں مطالعہ کا تعلق ہے تو اس سلسلہ کی آخری دو کتابیں " 'اسد الغابہ' اور 'استیعاب' " کا مطالعہ پچھلے دنوں مکمل ہو گیا تھا۔ آج کل "اصابہ" زیرِ مطالعہ ہے۔"

۱۲؍ جنوری ۱۹۷۹ء

حلقہ سرکاری ملازمین کے سہ ماہی اجتماع کے شرکاء نے مولانا محترم کے ساتھ ان کی قیام گاہ ہی پر ایک مختصر نشست کی اور ہدایات لیں۔

۱۳؍ جنوری ۱۹۷۹ء

روسی قونصل (V.I. Gurgenoy) اور سیکنڈ سیکرٹری ایمبیسی اِن پاکستان نے ملاقات کی۔ اِسلامی نظام پر گفتگو ہوئی۔ سمجھنا چاہتے تھے

کہ اسلامی نظام کیا تبدیلیاں لاتا ہے۔ زکوٰۃ اور مضاربت پر سوالات کرتے رہے۔ تفہیم القرآن انگلش ترجمہ آٹھوں جلدیں حاصل کر چکے ہیں اور زیرِ مطالعہ ہے۔

۱۶ر جنوری ۱۹۷۹ء

۱۔ سلیم گیلانی صاحب، ڈائریکٹر ریڈیو پاکستان نے ملاقات کی۔ موجودہ نشریات زیرِ بحث رہیں۔

۲۔ نوابزادہ نصراللہ خاں صاحب نائب صدر قومی اتحاد مولانا محترم سے ملے۔ تقریباً ایک گھنٹہ تک ملاقات رہی۔

۱۶ر جنوری ۱۹۷۹ء

ڈاکٹر عزالدین ابراہیم، کلچرل ایڈوائزر حکومت ابوظبی (U.A.E.)، نمائندہ زید بن نیہان ملاقات کے لیئے تشریف لائے۔ اسلامی تحریکوں اور تنظیموں کے متعلق معلومات حاصل کیں۔ اور بالخصوص ہند و پاک میں طلبہ اور خواتین کی تنظیموں کے بارے میں سوالات کرتے رہے۔

۱۹ر جنوری ۱۹۷۹ء

جمعیت طلبہ عربیہ پنجاب کے ستر ارکان پر مشتمل ایک وفد نے مولانا محترم سے ملاقات کی اور نمازِ عصر کے بعد ان کے ساتھ نشست رہی۔

مولانا محترم نے نصیحت کرتے ہوئے فرمایا کہ:

"اسلامی جمعیت طلبہ اور جمعیت عربیہ، ان دونوں تنظیموں

کو اسلامی مقاصد کے لیئے باہم متحد ہوکر کام کرنا چاہیئے اور ایک دوسرے کے قریب آنا چاہیئے۔ ہماری خواہش ہے کہ ایسے تعلیمی ادارے قائم ہوں جن میں دونوں تعلیمیں ایک ساتھ دی جائیں"۔

آخر میں مولانا محترم نے ان کے کام کو سراہا اور حوصلہ افزائی فرمائی۔

۲۰ر جنوری ۱۹۷۹ء

ایران میں انقلاب کے بعد ایران کے مذہبی شیعہ رہنما امام خمینی کے دو نمائندے ڈاکٹر کمال اور انجینئر محمد، امام خمینی کا خط مولانا محترم کے نام لے کر آئے۔ مولانا محترم کے ساتھ ایک گھنٹہ سے زیادہ ملاقات رہی۔ اس موقع پر مولانا محترم نے اپنی تازہ کتاب "سیرت سرورِ عالم" امام خمینی کے لیے ان کے نمائندوں کو دی۔ نیز ان دونوں حضرات اور ان کے ایک ساتھی کو بھی ایک ایک سیٹ سیرت کا اور انگریزی تفہیم القرآن کی جلدوں کا سیٹ تحفے میں دیا۔

۲۱ر جنوری ۱۹۷۹ء

آج مولانا محترم نے امام خمینی کے خط کا جواب انکے نمائندوں کو پہنچا دیا۔ امام خمینی کا خط فارسی زبان میں ہاتھ سے لکھا ہُوا تھا۔ مولانا محترم کا جواب عربی زبان میں بھجوایا گیا۔ مولانا محترم نے جواب اُردو میں لکھا تھا جسے محترم خلیل حامدی صاحب نے عربی کا جامہ پہنایا۔

دونوں خطوط کا ترجمہ اور متن درج ذیل ہے:

جناب آقائے ابوالاعلیٰ المودودی المحترم!

سلام و آداب کے بعد، آپ کا مکتوبِ گرامی مورخہ ۱۰ر محرم ۱۳۹۹ھ کو ملا۔ ہم اس بات پر شکر گزار ہیں کہ جناب والا پاکستان میں ہمارے مسلمان بھائی ایران کے حالات اور مسلمانوں کی مظلومیت کے واقعات سے باخبر اور ہمارے عوام کے حامی ہیں اور ان کی مبنی برحق جدوجہد کی پشتپناہی کا دم بھرتے ہیں۔ اور نیز یہ کہ شاہ اور اس کی کٹھ پتلی حکومت کی سیاہ کاریوں کی بنا پر ان کے ساتھ نفرت و بیزاری کا اظہار کرتے ہیں۔ ایران کے مسلم عوام کی تحریک سو فیصد اسلامی افکار اور آفاقی سیاسی اقدار پر مبنی ہے۔

ایرانی قوم شاہی خاندان اور شاہ کی شہنشاہیت کے آمرانہ و جابرانہ ظلم و استبداد کے ہاتھوں جان بلب ہو چکی ہے۔ اور اسکے ظلم و ستم اور فتنہ و فساد کے خلاف اٹھ کھڑی ہوئی ہے اور اس نظامِ شاہی کو سرنگوں کر دینے اور بیخ و بن سے اُکھاڑ پھینکنے کے بعد عدلِ الٰہی پر مبنی نظام قائم کرنے کی خواہاں ہے۔

صرف ایران ہی نہیں جو اس افسوسناک صورتِ حال سے دوچار ہے۔ بلکہ مقامِ افسوس ہے کہ آج دُنیا کے اکثر مسلمان جابر و ظالم حکومتوں کے مختلف النوع مظالم کے پنجے میں گرفتار ہیں اور یہ حکومتیں ایسی ہیں جو اپنوں کے ہاتھوں نہیں بلکہ بیگانوں کی سازشوں کے نتیجہ میں برسرِ اقتدار آئی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اعمال و افعال اپنے ملک و قوم کے مفاد میں نہیں بلکہ اپنے غیر ملکی آقاؤں کے مفادات کے تحفظ اور ان کی خوشنودی کے حصول سے وابستہ ہیں۔ انہوں نے مسلمانوں کے خُداداد اور عظیم قدرتی ذخائر سے بھرپور استفادہ کے لیئے اپنے آقاؤں کو کھلی چھٹی دے رکھی ہے اور باشندگانِ

ملک کو ان کے حصول سے محروم کر رکھا ہے۔

وہ تیل کی بے حساب آمدنی کو زائد از ضرورت اور بے مصرف اسلحہ کی خرید پر صرف کرتے ہیں، اس سے قطع نظر کہ وہ اس دولت کو اسلامی ملکوں کے نادار اور مستحق لوگوں کی اقتصادی حالت کی اصلاح و بہبود پر خرچ کرنے کے سلسلہ میں کوئی اقدام کریں۔

یہ حکومتیں ایسی ظالم و جابر ہیں کہ اپنے کالے کرتوں کے خلاف اٹھنے والی ہر احتجاجی آواز قید و بند اور قتل و غارت کے ذریعہ سے دبا دیتی ہیں۔

اس سلسلہ میں سب سے مکروہ اور ناپسندیدہ بات یہ ہے کہ ایسی حکومتیں بظاہر اسلام ہی کا دم بھرتی ہیں اور اپنے آپکو اسلام ہی کا حامی اور مبلغ گردانتی ہیں حالانکہ ان کے اعمال اور کردار نہ صرف یہ کہ اسلامی معیار پر پورے نہیں اُترتے بلکہ اسلامی اقدار و احکام کے ساتھ ان کا تضاد دو اختلاف بالکل واضح اور آشکارا ہے۔ اسلام ہمیں ظلم و ستم اور طاغوتی قوتوں کے خلاف جد و جہد اور مبارزت و پیکار پر اُکساتا ہے اور ہر قسم کے غیر مسلموں کے ساتھ دوستی و ہمکاری سے منع کرتا ہے۔

آج تمام مسلمانوں کا فرض ہے کہ ایک دوسرے کے ہاتھوں میں ہاتھ دے کر اسلام کے دشمنوں کے خلاف جہاں اور جس حال میں ہوں، جہاد کریں۔ خاص طور پر علمائے اسلام کو چاہیئے کہ وہ اس جہاد میں پیش رو بنیں۔

اندریں حالات دنیا بھر کے مسلمانوں کو چاہیے کہ فروعی اور بیجا اختلاف و تعصبات سے دستکش ہو جائیں اور ایک دوسرے کی طرف اخوت اور بھائی چارے کا ہاتھ بڑھائیں تاکہ کافر و مشرک

استبدادی قوتیں مسلم اقوام کی جان و مال، عزت و ناموس اور نہایت ہی اہمیت کے حامل قدرتی وسائل کے استعمال سے باز رہیں، تمام اسلامی ممالک اپنے آپ کو ان شیاطین کی غلامی کے جوئے سے آزاد کرائیں اور ان طاغوتی طاقتوں کے ظلم و استبداد کی جگہ اسلامی عدل و انصاف قائم کریں۔

آخر میں آپ کی اور پاکستان کے تمام مسلمان بھائیوں کی صحت و عافیت اور راہِ حق میں توفیق و نصرت کے لئے خداوند کریم کی بارگاہ میں دست بدعا ہوں۔

روح اللہ موسوی الخمینی
۲ر صفر ۱۳۹۹ھ

-●-

آیت اللہ خمینی کے خط کا عکس

۲ صفر ۹۹ — جناب آقای ابوالاعلی مودودی المحترم

بعد از سلام و تحیت مرقومهٔ شریف مورخهٔ ۱۰ محرم ۹۹ واصل شد از اینکه جنابعالی و برادران مسلمان پاکستان
از اوضاع ایران و مظلومیت مسلمانان مطلع میباشند و با ملت ما همراهی و از مبارزات برحق آنان ابراز پشتیبانی نموده اند و از آنکه
نسبت به جنایتهای شاه و رژیم سرسپردهٔ اجنبی اظهار تنفر و انزجار نموده اند سپاسگزاریم

نهضت مردم مسلمان ایران حرکتی است بر پایهٔ فلسفه و جهان بینی صددرصد اسلامی. ملت ایران از جور جباریت سلطنت خودکامه
خاندان سلطنتی و رژیم طاغوتی شاه به جان آمده است و علیه ظلم و ستم، علیه فساد و جنایات، علیه خیانتهای آن قیام کرده است.
ملت ایران خواستار برهم زدن و سرنگون ساختن این نظام و استقرار حکومت عدل الهی میباشد. این تنها ایران نیست که گرفتار است
متأسفانه امروز اکثر مسلمانان جهان گرفتار انواع ظلم ها و حکومتهای طاغوتی هستند. حکومتهائیکه غالباً نه بدست مردم
بلکه با توطئه های اجانب و بدست آنها روی کار آمده است. لهذا اعمال آنها نه بنفع مردم و مملکت بلکه در خدمت تأمین
منافع اربابان خارجی خودشان و در جهت رضایت آنان میباشند. ایشان دست اجانب را در غارت منابع عظیم خدادادی مسلمانان
بکلی باز و آنها را آزاد گذاشته اند درآمدهای عظیم نفت را صرف خرید اسلحه های زائد و بی مصرف می نمایند. بدون اینکه کوچکترین
اقدامی برای بهبود وضع اکثریت مردم محروم و فقیر جوامع اسلامی بعمل آورند. این حکومتهای جابر هر صدای اعتراضی را با زندان
و گلوله پاسخ میدهند. و از همه بدتر چنین حکومتهائی دائم دم از اسلام میزنند و خود را حامی اسلام و مروج و مبلغ اسلام میدانند
و می خوانند. درحالیکه اعمال آنها عموماً با موازین اسلامی سازگار نیست و با آنها تناقض آشکار دارد. اسلام ما را به مبارزه با ظلم

و ستم و طاغوت دعوت میکند. ما را از همکاری و دوستی با کفار و مشرکین و تحقیر مسلمانان برحذر میدارد.

امروز مسلمانان همه وظیفه دارند دست برادری بهم بدهند و علیه دشمنان اسلام در زیر پرچم توحیدی و در هر منطقه‌ای مبارزه کنند.

علمای اسلام باید از این مبارزات پیشقدم شوند. امروز مسلمانان باید از تعصبات و اختلافات بیجا دست بردارند

دست اخوت و برادری بهم بدهند تا سلطه جابرانه کفار و جباران و طاغوت‌ها بر جان و مال و ناموس و منابع

حیاتی ملتهای مسلمان را از بین ببرند. و خود را از شر این اسارت نجات بخشند و عدل اسلامی جایگزین ظلم طاغوت‌ها سازند

از خداوند متعال صحت و عافیت شما و برادران مسلمان پاکستان و توفیق خدمت در راه حق را مسئلت دارم.

خمینی
[illegible]

۲۱/ جنوری ۱۹۷۹ء

امام خمینی کے خط کے جواب میں مولانا مودودیؒ کے خط کا اُردو ترجمہ :-

آداب مخاطبت اور سلام و محبت کے بعد!

ایران سے روز نت نئے تغیرات کی خبریں آ رہی ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ طوفان کا ایک حصہ ہی ابھی گزرا ہے ، مزید طوفان اٹھتے چلے جا رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں اور یہاں کے سب اہلِ دین بھی دست بدعا ہیں کہ یہ سارے طوفان آخرکار دب جائیں اور ایران میں اسلامی انقلاب پائیدار بنیادوں پر پایۂ تکمیل کو پہنچے۔

آپ سے بھی دُعا کی استدعا ہے کہ پاکستان میں جس اسلامی انقلاب کے آثار رونما ہو رہے ہیں وہ بھی مکمل ہو جائے اور ایران و پاکستان ایک ساتھ ہی دارُالاسلام بن جائیں۔

خاکسار
ابوالاعلیٰ

۴/ فروری ۱۹۷۹ء

مسٹر کیلاؤس نیٹرپ (Klaus Natorp) فرینکفرٹ، مغربی جرمنی کے معروف روزنامے "زیتنگ" (Zeitung) کے ایشیائی شعبہ کے ایڈیٹر ہیں۔ آج مولانا محترم سے ملے۔ یہ محض تعارفی ملاقات تھی۔ کوئی انٹرویو وغیرہ نہیں تھا۔

۸/ فروری ۱۹۷۹ء

پرنس آف ہنزہ ملنے کے لیۓ آئے۔ کچھ دیر مولانا کے پاس رہے۔ مولانا محترم نے "سیرتِ سرورِ عالم" سیرت پر اپنی تازہ کتاب بطور

ھدیۃ پیش کی۔

۹/ فروری ۱۹۷۹ء

امام کعبہ محمد بن عبداللہ بن سُبَیّل مغرب کے قریب تشریف لائے۔ نماز مغرب امام صاحب موصوف ہی نے پڑھائی۔ نماز کے بعد تقریباً نصف گھنٹہ مزید دونوں بزرگوں کی ملاقات رہی۔

۲۰/ فروری ۱۹۷۹ء

عمر بہاؤالدین الامیری، سابق سفیر شام متعینہ پاکستان حال ڈین فیکلٹی آف حدیث مراکو یونیورسٹی، مراکش، تشریف لائے اور مولانا سے ملاقات کی۔

۲۲/ فروری ۱۹۷۹ء

جناب معروف دوالیبی، سیاسی مشیر شاہ خالد، تشریف لائے۔ تقریباً نصف گھنٹہ ملاقات کی۔

۲۸/ فروری ۱۹۷۹ء

آج شاہ فیصل ایوارڈ کا پہلا ایوارڈ مولانا محترم کو ان کی اِسلامی خدمات پر دیا گیا۔ ایوارڈ کی یہ تقریب سعودی دارالحکومت 'ریاض' میں منعقد ہوئی۔ بعد میں حاصل ہونے والی تفصیلات کا ملخص درج ذیل ہے:۔

سعودی عرب کے دارالحکومت 'ریاض' میں شاہ فیصل فونڈیشن کی تقریب شاہ فیصل ایوارڈ کے سلسلہ میں منعقد ہوئی۔ اس تقریب کا انتظام

ایک عظیم الشان اور وسیع و عریض ہال (شاہ فیصل ہال) میں کیا گیا تھا۔
تقریب کے مہمانِ خصوصی سعودی عرب کے فرمانروا شاہ خالد تھے۔
دوسرے شرکاء میں ولی عہد شہزادہ فہد، شاہی خاندان کے افراد، حکومت کے وزراء، اعلیٰ سرکاری حکام اور فوجی آفیسر، یونیورسٹیوں کے چانسلر اور وائس چانسلر، پروفیسر، دانشور اور دنیا بھر سے آئے ہوئے چیدہ چیدہ مفکرین شامل تھے۔

مولانا محترم اپنی کمزوریٔ صحت کی بنا پر اس تقریب میں تشریف نہ لے جا سکتے تھے، چنانچہ ان کے نمائندوں کے طور پر مولانا محترم کے صاحبزادہ حسین فاروق صاحب اور مولانا خلیل احمد حامدی صاحب ایوارڈ وصول کرنے کے لیئے اس تقریب میں شریک ہوئے۔

شاہ خالد نے اپنے افتتاحی خطاب میں فرمایا:۔

"ہم یہ چاہتے تھے کہ شاہ فیصل فونڈیشن کا پہلا ایوارڈ ایسی شخصیت کو دیا جائے جس نے اسلام کے بارے میں ہمہ پہلو کام کیا ہو۔ ایسے افراد تو موجود تھے اور ہیں جنہوں نے محض فکری کام کیا ہے مگر عملی میدان میں ان کا کوئی حصہ نہیں اور ایسے افراد بھی موجود ہیں جنہوں نے عملی کام تو کیا ہے مگر ان کا کوئی فکری کام نہیں ہے۔۔
اس لحاظ سے مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ وہ واحد شخصیت ہیں جنہوں نے فکری اور عملی دونوں میدانوں میں فروغِ اسلام کے لیئے بے مثال کام کیا ہے۔ انہوں نے آغازِ شباب سے اب تک ایک طویل جہاد کیا ہے۔ پوری دُنیا میں بالعموم اور پاکستان میں بالخصوص اسلامی قوانین کے غلبہ و نفاذ کے لیئے کامیاب کوششیں کی ہیں۔ انہوں نے

ایک ہمہ گیر تحریک کی بنا بھی ڈالی جو ان کے پروگرام کو لے
کر چل رہی ہے۔ ان کا لٹریچر ساری دنیا میں پھیل رہا ہے
اور عصرِ حاضر کا نوجوان سب سے زیادہ انہی سے متاثر ہُوا
ہے۔ ان کا لٹریچر دُنیا کی تیئس بڑی زبانوں میں ترجمہ ہو کر
پھیل رہا ہے، چنانچہ احیائے اسلام کی تحریک پوری دُنیا
میں اُٹھ کھڑی ہوئی ہے جو بڑی حد تک انہی کے کام کا
نتیجہ ہے۔

مولانا محترم کو ایوارڈ دینے کا فیصلہ تنہا فیصل فونڈیشن نے نہیں
کیا۔ ایوارڈ کمیٹی نے دنیا بھر کی ۵۰۰ سو سے زیادہ مسلم تنظیموں اور شخصیات
کو ایک سوالنامہ بھیجا تھا اور یہ رائے طلب کی تھی کہ شاہ فیصل
فونڈیشن کا پہلا ایوارڈ کسے دیا جائے چنانچہ ۹۰ فیصد اداروں اور
شخصیات کا ایک ہی جواب تھا کہ

"—— صرف اور صرف مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ ——"

افتتاحی خطاب کے بعد ایوارڈ کمیٹی کے چیرمین ڈاکٹر احمد خُبَیب نے
خطاب کرتے ہوئے مولانا محترم کے حالاتِ زندگی کا خلاصہ بیان کیا۔
انہوں نے مولانا کی پیدائش ۱۹۰۳ء سے ۲۷ر فروری ۱۹۷۷ء تک کے
حالاتِ زندگی پر روشنی ڈالی۔ انہوں نے مولانا کی پہلی کتاب "الجہاد فی
الاسلام" جماعتِ اسلامی کی تاسیس ۲۶ر اگست ۱۹۴۱ء، زمانہ امارت،
اسیری کی روداد، جہاد اور فکر کے مختلف پہلو بیان کیے۔ نیز تصانیف
کی تعداد بتائی غرضیکہ مولانا محترم کی زندگی کا ایک جامع تعارف پیش کیا
اور فرمایا کہ مولانا عصرِ حاضر کے نوجوانوں کے رہنما اور قائد بن کر
سامنے آئے ہیں۔

ان کی تقریر کے بعد سعودیہ کے فرمانروا شاہ خالد نے شاہ

فیصل ایوارڈ دیا۔ مولانا محترم کے دونوں نمائندے مولانا خلیل احمد حامدی اور حسین فاروق آگے بڑھے۔ شاہ نے دونوں سے ہاتھ ملایا اور مولانا کی صحت کے بارے میں دریافت کیا۔ جناب حامدی صاحب نے کہاکہ علالت کی بناپر مولانا محترم کی صحت سفر کی متحمل نہیں تھی اس لیے وہ یہاں تشریف نہیں لائے۔ شاہ نے جواباً فرمایا، اللہ ان کی عمر دراز کرے۔ پھر انہوں نے ایک میڈل اور ایک سرٹیفکیٹ پیش فرمایا اور دو لاکھ ریال کا چیک عنائت کیا جس کی مالیت اس وقت کے زرِمبادلہ کے مطابق تقریباً پونے چھ لاکھ روپیہ پاکستانی بنتی ہے۔

پھر مولانا خلیل احمد حامدی صاحب نے مولانا محترم کا پیغام پڑھ کر سنایا۔ جو اُردو میں تھا جسے حامدی صاحب نے عربی میں ترجمہ کرکے پیش کیا۔

مولانا کے پیغام کا خلاصہ یہ تھا:

"میری بڑی خوش قسمتی ہوتی کہ میں اس تقریب میں حاضر ہوتا اور خدا کے دربار میں بھی حاضری دیتا اور دربارِ رسالت میں بھی، لیکن اپنی بیماری کی وجہ سے میں نہیں آسکتا۔

میں آپ کے اس انعام سے بے حد متاثر ہوا ہوں کہ آپ نے میری حقیر خدمات کی ہمت افزائی کی، جو میں نے خدا کے دین کے سلسلے میں انجام دی ہیں۔ یہ دینِ حق، قوت اور آزادی کا دین ہے۔ میں ان خدمات پر اپنے آپ کو کسی تعریف کا مستحق نہیں سمجھتا۔ یہ میرا فرض تھا اور یہ ہر اُس مسلمان کا فرض ہے جسے اللہ نے اقتدار، طاقت، قابلیت یا کوئی وسائل عطا کیے ہوں۔ میں صرف یہ چاہتا

ہوں کہ میری ان خدمات کو اللہ تعالیٰ قبول فرمائے اور مجھے وہاں سے اس روز انعام نصیب ہو کہ جس روز اولاد، اور مال و متاع کچھ کام نہیں آئیں گے۔

میں شاہ فیصل شہید کی اولاد کو مبارکباد دیتا ہوں کہ انہوں نے یہ فونڈیشن قائم کر کے ایسا کارِ خیر انجام دیا ہے۔ جو میرے علم کی حد تک مسلمانوں کے اندر موجودہ دور میں اپنی نوعیت کا پہلا کام ہے۔ ورنہ اس سے قبل غیر مسلم ہی اس قسم کے ادارے قائم کرتے رہے ہیں۔ میں شاہ فیصل شہید کے لیے دعائے مغفرت اور ان کے بچوں کے لیے دعائے خیر کی دُعا کرتا ہوں۔

مجھے اُمید ہے کہ یہ فونڈیشن اور اس کا یہ کام دنیا میں اِسلامی تحقیقات کو ترقی دینے کا موجب ہوگا اور اس عالمی اسلامی تحریک کی ایک اہم کڑی ثابت ہوگا جو دُنیا کے اندر تخریبی قوتوں اور انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین کو ختم کر کے اللہ کے دین کو نظامِ زندگی کے طور پر غالب کرنا چاہتے ہیں۔

میں شاہی خاندان کے تمام معزز افراد کی موجودگی میں اور جتنے اہل علم یہاں موجود ہیں ان کے سامنے خوشی کے ساتھ یہ انعام قبول کرتے ہوئے یہ اعلان کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ میری جن خدمات کے اعتراف میں یہ انعام دیا گیا ہے، اور علی الخصوص پاکستان میں اسلامی قوانین کے لیے جو کام ہو رہا ہے میں انہی مقاصد کے لیے اس انعام کو صرف کر دوں گا۔"

آخر میں شہزادہ عبداللہ الفیصل نے اپنے خطاب میں فرمایا:

"ہم نے مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ کو یہ انعام دے کر مولانا کی نہیں بلکہ انعام کی عزت افزائی کی ہے۔"

نوٹ:۔

چنانچہ ۲۶ر مئی ۱۹۷۹ء کو آخری سفرِ امریکہ پر روانہ ہونے سے پہلے مولانا محترم نے پونے چھ لاکھ روپے کا چیک ادارۂ معارفِ اسلامی کے ڈائرکٹر، مولانا خلیل احمد حامدی صاحب کو دے دیا تھا۔ ایوارڈ کی یہ رقم انہی دنوں میں مولانا محترم کے اکاؤنٹ میں جمع ہوئی تھی۔

-●-

بسم الله الرحمن الرحيم

شاہ فیصل ایوارڈ

براءة جائزة الملك فيصل العالمية لخدمة الإسلام

إن هيئة جائزة الملك فيصل العالمية بعد اطلاعها على نظام جائزة الملك فيصل العالمية المصادق عليه من مجلس أمناء مؤسسة الملك فيصل الخيرية بالقرار رقم ١١/٦٨/٩٨ وتاريخ ١٣٩٨/٨/١٠هـ وعلى محضر لجنة الترشيح والاختيار لجائزة الملك فيصل العالمية لخدمة الإسلام بتاريخ ٣ ربيع الأول ١٣٩٩هـ تقرر منح:

سماحة الشيخ العلامة السيد أبي الأعلى المودودي

جائزة الملك فيصل العالمية لخدمة الإسلام لهذا العام ١٣٩٩هـ وذلك تقديرا لجهوده المخلصة في خدمة الإسلام والمسلمين وخاصة في المجالات الآتية:

١- عمله منذ شبابه المبكر في العمل الصحافي الإسلامي الجاد، وقيامه بدور هام بإنتاج كثيف ينم عن علم غزير وفكر أصيل واسع.

٢- إسهامه إسهاما فعالا في تجديد الفكر الإسلامي وجعله ظاهرة مهيمنة على الحياة في جميع صورها عند المسلمين في القارة الهندية.

٣- كفاحه البطولي وجهاده المستميت من أجل إحياء الروح الإسلامية وبعث القيم الإسلامية والمثالية وجعل تعاليم الشريعة الإسلامية وأحكامها مطبقة بين المسلمين في حياتهم العملية، وذلك عن طريق حركته الإصلاحية التي نطقت بها مؤلفاته الهامة العديدة والتي كان لها بالغ الأثر وكان من التجاوب مع تحركات الإصلاح في العالم. وإن هيئة الجائزة إذ تمنحه ذلك فإنها ترجو الله أن يوفقه في جهاده وأن يكثر من أمثاله.

والله ولي التوفيق

أمين

رئيس هيئة الجائزة

صدر في مدينة الرياض بتاريخ الثاني من ربيع الثاني ١٣٩٩هـ
الموافق ٢٨ فبراير ١٩٧٩م

۲۸ر فروری ۱۹۷۹ئ

۲۸ر فروری کو مولانا محترم کے لیئے پہلے شاہ فیصل ایوارڈ کی خبر اخبارات میں پڑھ کر ٹیلیگرام اور خطوط کے ذریعے سے مبارکباد کے پیغامات سینکڑوں کی تعداد میں وصول ہوئے۔ مولانا محترم نے ہر ایک کو ڈاک کے ذریعہ سے شکریہ کا خط لکھا۔ خط کا متن درج ذیل ہے:۔

ابوالاعلیٰ مودودی
۵۔اے ذیلدار پارک اچھرہ
لاہور (پاکستان) ۷ار مارچ ۱۹۷۹ئ

محترمی و مکرمی السلام علیکم ورحمۃ اللہ

شاہ فیصل ایوارڈ پہ آپ کی مبارکباد کے لئے شکر گزار ہوں۔ میرے لئے اصل چیز دنیا کے انعام نہیں، بلکہ اللہ جل شانہٗ کے انعام کا متمنی ہوں۔ دعا فرمائیں کہ ربّ کریم میری مغفرت فرمائے اور مجھے اپنے انعام سے سرفراز کرے۔

خاکسار
ابوالاعلیٰ

۵/ مارچ ۱۹۷۹ء

بریگیڈیئر ڈاکٹر محی الدین صاحب طبی معائنہ کے لیے تشریف لائے۔ تقریباً ایک گھنٹہ تک معائنہ کرتے رہے۔

۶/ مارچ ۱۹۷۹ء

عبداللہ بن ابراہیم، چیف جسٹس سعودی عرب کے نمائندہ نے ملاقات کی۔

۷/ مارچ ۱۹۷۹ء

شیخ امتیاز علی صاحب، مشیرِ تعلیم حکومت پنجاب نے ملاقات کی۔

۸/ مارچ ۱۹۷۹ء

الشیخ محمد علی الحرکان، سیکرٹری جنرل رابطہ عالم اِسلامی، مکہ مکرمہ، اور اُن کے چند احباب تشریف لائے اور ملاقات کی۔

۱۲/ مارچ ۱۹۷۹ء

جناب شریف الدین پیرزادہ، اٹارنی جنرل آف پاکستان نے ملاقات کی۔

۳/ اپریل ۱۹۷۹ء

۱۔ نوابزادہ نصراللہ خاں، نائب صدر قومی اتحاد، ملاقات کے

لیے تشریف لائے۔ تقریباً ایک گھنٹہ تک ملی اور ملکی مسائل پر گفتگو ہوتی رہی۔

۲۔ قطر سے جاسم درویش صاحب نے ملاقات کی۔

۹/ اپریل ۱۹۷۹ء

جسٹس محمد حسن سندھڑ جج ہائی کورٹ لاہور نے مولانا سے ملاقات کی۔

۱۴/ اپریل ۱۹۷۹ء

مدینہ یونیورسٹی کے پانچ رکنی وفد نے مولانا سے ملاقات کی۔ وفد کے ارکان شیخ محمد بن قعود ڈائریکٹر ادارۂ دعوت وتبلیغ، شیخ محمد عمر فلاتہ، سیکرٹری جنرل اسلامی یونیورسٹی مدینہ منورہ شیخ عبدالعزیز ـــــ پرنسپل قرآن کالج وغیرہ تھے۔ سعودی علماء اور مدینہ یونیورسٹی کے اساتذہ کی طرف سے شاہ فیصل ایوارڈ ملنے پر ہدیۂ تہنیت پیش کیا گیا۔

۱۸/ اپریل ۱۹۷۹ء

مولانا محمد مالک کاندھلوی صاحب، شیخ الحدیث جامعۂ اشرفیہ لاہور، مولانا محترم سے ملاقات کے لئے تشریف لائے۔ تقریباً پون گھنٹہ تک ملاقات کی۔

۲۱/ اپریل ۱۹۷۹ء

داتو عبدالعزیز عمر مع اہلیہ، ملائیشیا کی ریاست برونی، کے

وزیر ہیں۔ مولانا محترم سے ملاقات کی۔

۲۵/اپریل ۱۹۷۹ء

۱۔ الشیخ عبداللہ بن عبدالعزیز بن عقیل، چیف جسٹس سعودی عرب نے مولانا محترم سے ملاقات کی۔ موضوعِ گفتگو ایران، امام خمینی، شیعہ سنی، پاکستان میں انتخابات اور بین الاقوامی اسلامی تحریک۔ ملاقات سوا گھنٹہ رہی۔ جسٹس صاحب کے جواں سال صاحبزادہ بھی ان کے ہمراہ تھے۔ گفتگو عربی میں تھی۔

۲۔ رشید بن عیسیٰ صحافی، ہیں الجزائر کے، تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ ملاقات کی۔

۳/مئی ۱۹۷۹ء

پرنس محمد الفیصل السعود، ڈاکٹر ابراہیم کامل سیکرٹری جنرل انٹرنیشنل فیڈریشن آف اسلامک بنکس، ڈاکٹر عزیز سرفراز، مسٹر حاتم عزام پرائیویٹ سیکرٹری محمد الفیصل اور مسٹر عبدالغنی مصطفیٰ پرسنل اسسٹنٹ ٹو ڈاکٹر ابراہیم کامل نے ملاقات کی، نمازِ مغرب ہمارے ساتھ ادا کی۔

۵/مئی ۱۹۷۹ء

عبدالمجید صدیقی صاحب حیدر آباد دکن سے۔ ایک سو بارہ سال کے بوڑھے ہیں۔ مولانا محترم کو وہاں کے رفقاء کا سلام پہنچایا۔

۶/مئی ۱۹۷۹ء

جناب عبدالرحیم صاحب، برادر جناب احمد ادریس نصیر الدین (اٹلی)

مولانا محترم سے ملے۔

۸/ مئی ۱۹۷۹ء

جناب الطاف گوہر صاحب نے ملاقات کی۔

۲۱/ مئی ۱۹۷۹ء

امریکن قونصل جنرل اوران کے ساتھی آئرن براؤن نے ملاقات کی جو ایک گھنٹہ تک جاری رہی۔

۲۲/ مئی ۱۹۷۹ء

مسٹر مکیڈی (Mcceady) ، فرسٹ سیکرٹری آسٹریلین ایمبیسی اسلام آباد نے ملاقات کی۔

۲۳/ مئی ۱۹۷۹ء

جناب عبدالرحمٰن خلیفہ اوران کے دو ساتھی۔ اُردن میں اخوان المُسلمون کے سربراہ ہیں، مولانا محترم سے ملے۔

۲۶/ مئی ۱۹۷۹ء

آج مولانا محترم اپنے صاحبزادے ڈاکٹر احمد فاروق صاحب کے ساتھ بغرض علاج امریکہ کے لیے روانہ ہوئے۔ علاج کی غرض سے مولانا کا یہ دوسرا سفرِ امریکہ تھا۔ ۱۹۷۴ء میں جوڑوں کے دردوں کے علاج کے سلسلہ میں امریکہ گئے تھے۔

ہم تین ساتھی بشیر احمد بٹ، چودھری بشیر احمد اور رَاقم الحروف بھی اسی جہاز سے مولانا کے ساتھ اِسلام آباد آ گئے۔ مولانا محترم کا قیام

اِسلام آباد میں اپنے برادرِ نسبتی کے ہاں تھا۔ ہم تینوں الاکرام بلڈنگ راولپنڈی میں ٹھہرے۔ صبح ٹیکسی سے مولانا کی قیام گاہ پر پہنچے۔ ٹیکسی والا ادھیڑ عمر کا آدمی تھا۔ جب اس نے مولانا محترم کو دیکھا تو بہت خوش ہُوا۔ جذباتِ عقیدت و محبت سے اس کے دل میں امڈ آئے۔ اس نے پہلی بار مولانا کو دیکھا تھا۔ شاید نام سُن رکھا ہو۔ کہنے لگا میری تو عاقبت سنور گئی۔ ہمیں بھی دُعائیں دیں۔ اِسلام آباد ایئرپورٹ پر پہنچ کر طے شُدہ کرایہ کی رقم چالیس روپے لینے سے انکار کرنے لگا۔ لیکن بہرحال ہم نے اسے باصرار رقم ادا کی۔

۲۷ر مئی کو اِسلام آباد سے صبح دس بجے کی فلائٹ سے لندن روانہ ہوئے۔ وہاں تین دن قیام کرنے کے بعد امریکہ روانہ ہو جائیں گے۔

۲۲ر ستمبر ۱۹۷۹ء

آج بفیلو (امریکہ) میں پاکستانی وقت کے مطابق شام ۵ر بج کر ۴۵ر منٹ (یعنی پونے چھ بجے) مولانا محترم کا انتقال ہوگیا۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیۡہِ رَاجِعُوۡنَ۔

اِنتقال ہسپتال میں اس وقت ہُوا جب کوئی تیمار دار آپ کے پاس موجود نہیں تھا۔ مولانا نے کاغذ کے ایک پُرزے پر انگریزی میں یہ الفاظ لکھے:

I am muslim and Pakistani.

پاکستانی کے الفاظ پورے نہ لکھے تھے کہ آپ ہمیشہ کی نیند سو گئے۔

مولانا مرحوم کی تاریخِ پیدائش ۲۵ر ستمبر ۱۹۰۳ء ہے اور ......

تاریخِ وفات ۲۲ر ستمبر ۱۹۷۹ء ہے۔

آپ کی عمر ۷۶ سال تھی۔

۲۵/ستمبر ۱۹۷۹ء

آج صبح مولانا مرحوم کا جسدِ خاکی کراچی اور پھر ۳/ بجے سہ پہر لاہور پہنچا۔ لاہور ایئرپورٹ پر غیر معمولی اژدحام تھا۔ لاکھوں آدمی ایئرپورٹ پر پہنچ گئے تھے۔ ٹریفک کا نظام بالکل معطل ہو کر رہ گیا۔ انسانوں کا اتنا عظیم اجتماع اس سے پہلے نہ دیکھا نہ سُنا۔ ساڑھے تین بجے کا چلا ہُوا یہ جلوس چھ بجے شام اچھرہ مولانا مرحوم کے گھر پہنچا۔

رات دس بجے تک خواتین نے آخری دیدار کیا۔ اور اس کے بعد سے صبح ساڑھے آٹھ بجے تک مردوں نے اپنے محبوب اور مرحوم قائد کا آخری دیدار کیا۔ اب اس میں اپنوں اور پرائیوں کی کوئی تخصیص نہیں رہ گئی تھی۔ رات بھر دیدار کرنے کا سلسلہ جاری رہا اور مرحوم کے سرہانے قرآن خوانی ہوتی رہی۔

۲۶/ستمبر ۱۹۷۹ء

آج مولانا محترم مرحوم کی قذافی سٹیڈیم میں نمازِ جنازہ ادا کی گئی۔ قطر یونیورسٹی کے استاد اور ایک شعبے کے ڈین جناب یُوسف قرضاوی نے امامت کرائی۔ آپ قطر سے جنازہ میں شرکت ہی کے لیے تشریف لائے تھے۔ صدرِ پاکستان جنرل محمد ضیاءالحق صاحب، اور پنجاب کے گورنر لیفٹیننٹ جنرل سوار خان صاحب نے بھی جنازے میں شرکت کی۔

جنازے کا جلوس بہت بڑا تھا۔ اچھرہ موڑ سے مسلم ٹاؤن کی نہر تک دونوں طرف سے پوری سٹرک بھری ہوئی تھی۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ جنازے کا اجتماع چھ سات لاکھ سے کم نہ ہوں گا۔

اس سے قبل بفیلو، نیویارک، لندن، اور کراچی میں بھی نمازِ جنازہ

ادا کی گئی تھی۔

۲۹/ ستمبر ۱۹۷۹ء

امامِ کعبہ محمد بن عبداللہ بن سُبَیّل تعزیت کے لیئے تشریف لائے

۲۹/ اکتوبر ۱۹۷۹ء

پیر کرم شاہ صاحب سجادہ نشین بھیرہ (حال جج شرعی وفاقی سپریم کورٹ) تعزیت کے لیئے تشریف لائے۔

-●-

خراجِ عقیدت

مولانا کی وفات کے بعد مختلف اخبارات وجرائد میں چھپنے والے اداریے

۲۲ر ستمبر ۱۹۷۹ء رات ۹ بجے ٹی وی کی خبروں میں مولانا کی وفات کی خبر نشر کی گئی۔ ۲۳ر ستمبر کے اخبارات کی شہ سرخی یہی خبر تھی۔ ۲۴ر ستمبر کو اخبارات نے مولانا مرحوم پر اداریے لکھے۔ نوائے وقت، جنگ، جسارت، حریت، امروز، وفاق اور انگلش اخبارات نے مولانا مرحوم پر اداریے لکھے اور ان کی دینی اور ملی خدمات کو بھرپور خراجِ تحسین و عقیدت پیش کیا۔ ہفت روزہ اخبارات اور ماہانہ جرائد نے اداریے بھی لکھے اور خصوصی نمبر بھی شائع کیے، جن میں زندگی، بادبان، ایشیا، آئین، تعبیر وغیرہ شامل ہیں اور ماہانہ رسالوں میں اُردو ڈائجسٹ، قومی ڈائجسٹ، سیارہ ڈائجسٹ سرِفہرست ہیں۔ میں یہاں چند اخبارات و جرائد کے اداریے کتاب میں شامل کر رہا ہوں:۔

روزنامہ "جسارت" کراچی

آہ! یہ شخص۔

وہ شخص ہمارے درمیان سے اُٹھ گیا جس کو بہرحال اس دُنیا سے اٹھنا تھا، مگر جس کے جینے کی تمنا لاکھوں کو نہیں کروڑوں کو تھی۔ ان کروڑوں میں وہ بھی ہیں جو اپنی زندگی کی قیمت پر اور اس کے بدل میں اس کی زندگی کے طول کے آرزومند تھے، مگر انسانی تمنائیں مشیّتِ ربّی میں دخیل نہیں ہوتیں۔ مشیت نے ہر مخلوق کی تقدیر فنا رکھی ہے اور اس قانونِ قدرت سے خود اللہ کے محبوب بندوں، اُس کے مرسلہ انبیاء کو استثنیٰ نہ ملا تو بندوں کے کسی محبوب کو استثنیٰ کیوں کر مل سکتا تھا! یہ حقیقت ہے اور کون اس سے ناواقف ہے، مگر اس حقیقت کا احساس اور عرفان بعض لمحوں میں کیسی لرزہ خیز سنسنی پیدا کرتا ہے۔ مولانا مودودیؒ کی زندگی میں بھی ان کی قربت اور صحبت میں بھی جب کبھی ان کی علالت و اضمحلال کو دیکھ کر یہ خیال آتا تھا کہ کبھی یہ شخص ہم میں نہیں ہوگا تو اچانک اس لمحۂ موعود کا عذاب رگوں میں خون منجمد کر دیتا تھا۔ دل کی دھڑکن بے اختیار محسوس ہوتی تھی اور پورا بدن سنسناتا تھا۔ عذاب کا وہ لمحہ جس کے ٹل جانے کی خواہش کی شدت کا کوئی حد و حساب نہ تھا۔ بالآخر آیا اور گزر گیا۔ بادِ فنا کا ایک جھونکا عصرِ حاضر کی دُنیائے اسلام کی سب سے قیمتی زندگی کا چراغ گل کر گیا۔ ایک دردناک عذاب کروڑوں انسانوں پر بیت گیا۔ دُنیائے اِسلام کے گوشے گوشے کے کروڑوں مسلمانوں نے سسکیوں اور نذرانۂ گریہ کے ساتھ سید مودودیؒ

کو سپرد خدا کیا۔

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ۔!

یہ شخص جو ابھی ابھی ہماری محفل سے اُٹھ کر گیا ہے کیسی نادرِ روزگار شخصیت کا حامل تھا۔ اس کی عظمتیں بے کنار، اس کی وُسعتیں بے حدُود، اس کی جہتیں بے شمار، اس کا عمق بے حساب، اس کا تبحرِ علمی بے پناہ۔ جی ہاں اس کے استدلال سے پناہ نہیں ملتی تھی۔ اس کے قلم کی اثر آفرینی سے نجات ممکن نہیں تھی۔ اس کے مؤقف کی صحت، اس کے فکر کی سلامتی اور اس کی نیت کے اخلاص سے انکار نہیں ہو سکتا تھا۔ اپنے مخاطب کو، اپنے قاری کو کیسے بے بس کر دیتے والا انسان تھا۔ اور کمال و اعجاز اس کا یہ بھی تھا کہ اس کا ہر مخاطب اور ہر قاری اس کی زد میں آکر بے بسی اور گرفتاری کے احساس ہی میں اپنی شخصیت کو عروج پذیر محسوس کرتا تھا۔ ظرفِ طبع کو متاعِ علم سے معمُور و لبریز پاتا تھا۔ کیسے کیسے تہی داماں اس کی قربتوں سے فیضیاب ہو کر بصیرتوں کے خزانے پا گئے!

جس دین کا وہ اپنی پوری زندگی میں داعی رہا ہے وہ تمام اُمتوں اور تمام زمانوں کا دین ہے، مگر جب اس نے اس دین کی دعوت کے کام کا آغاز کیا اُس وقت دنیائے اسلام میں ایک مغلوبیت، تنہائی اور عالمی زندگی کے دھارے سے الگ رہنے کا احساس اور رُجحان تھا۔ ایمان کی سلامتی کی راہ یہ سمجھ میں آتی تھی کہ جدید مُلحدانہ خیالات کو پاس نہ پھٹکنے دیا جائے، کافرانہ علوم کے دیئے ہوئے تصورات کو خاطر میں نہ لایا جائے اور بس اپنے دین پر مضبوطی سے قائم رہا جائے۔ مدافعت کا یہ لائحہ عمل ظاہر ہے کہ چلنے والا نہیں تھا۔ نہ دین کے معاملے میں معذرت خواہی کا پیرایہ کوئی آبرو مندانہ طریق

دفاع تھا اور نہ اِسلام کو بازی گر کی زنبیل بنا کر اس سے عصرِ حاضر کے ہر بے جواز ضرورت اور ہر بے بنیاد تقاضے کی تکمیل کا سامان فراہم کرنا کوئی ہوشمندانہ طرزِ عمل ہو سکتا تھا مگر، ہو یہی کچھ رہا تھا اور اس کیفیت کے سبب مراکزِ علم و تحقیق میں، درسگاہوں میں مسلمانوں کے نظامِ عقائد و نظریات کے تار و پود بکھر رہے تھے۔ ان شکست خیز لمحوں میں یہ شخص منظرِ عام پر آیا۔ اس نے دین کے بارے میں معذرت خواہانہ اسلوب اختیار کرنے سے انکار کیا ـــــــــ اس نے جدید تصورات و نظریات سے کنارہ کشی کے رویے کو بزدلی ٹھہرایا، اس نے اِسلام کو بازی گر کی زنبیل بنانے کی ترکیب کو تحقیر سے مسترد کیا۔ اور پھر اس شخص نے یہ کیا کہ اپنے سحر انگیز قلم سے، اپنے مخاطب کو پوری طرح غیر مسلح کر ڈالنے والے منطقی استدلال سے، اپنے بے مثل مرتب و منظم ذہن سے اور اپنے لاجواب تجزیے اور تفکر سے جدید دُنیا، جدید زندگی اور جدید فکر کے پورے نظام کو کھنگالنا اور اس کی ناپاکیوں کو منظرِ عام پر لا کر اس کے مقابلے میں اِسلام کے نظامِ فکر کو پوری زندگی پر پھیلا کر اس کی برکتوں، طہارتوں اور منافع کو ممیز کرنا شروع کیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے چند سال میں فکری انقلاب کے آثار نمودار ہو گئے اور گزشتہ ہفتے کی شام کو جب یہ ابدی نیند سویا تو اس سے پہلے یہ مردِ خدا سیکولر نظام کے تعمیر کردہ الحادی دمدموں اور قلعوں سے نعرۂ تکبیر اور اِسلامی انقلاب کے نعروں کی گونج سُن کر قلب و ضمیر کی آسودگی پا چکا تھا۔ کیونکہ وہ وابستگانِ اسلام کے دلوں میں احساسِ کمتری، معذرت خواہی یا جدید نظامِ افکار و عقائد سے مبارزت طلبی سے فرار کے میلانات و جذبات کو فتح مندی اور برتری کے جذبات میں بدل چکا تھا اس نے جدید نظامِ زندگی کے حل کے سلسلے میں اسلام کے

حوالے کو زندہ کیا اور اس کا اعتبار بحال کیا۔ اس نے دینی تصوّرات اور عقائد پر سے صدیوں کا چڑھا ہُوا زنگ اتار کر انہیں صیقل کیا اور قابلِ قبول بنایا۔!

یہ شخص جو ابھی ابھی ہم سے رخصت ہُوا اپنے کردار میں استقامت کا کوہِ گراں تھا۔ پہاڑ پھٹ سکتے ہوں گے، مگر اس شخص کو حق اور اور اصول کی راہ سے ٹلتے اور ہٹتے کسی نے نہ دیکھا۔ اپنی طاقت اور حکومت کا باطل زعم رکھنے والے نہ جانے کتنے حکمران اس کو جھکانے کے لیے اس کی طرف لپکے، مگر خود سرنگوں پلٹے۔ موت کی کال کوٹھڑی میں نفسِ حیات کو منجمد کر دینے والی وہ سرد رات بھی اس کی حق پرستی کے دہکتے ہوئے جذبے پر اثر انداز ہوئے بغیر گزر گئی کہ جس رات میں اُسے اپنی زندگی کے باقی لمحوں کا شمار کر لینے کی خبر دے دی گئی تھی۔ اس نے مٹھی بھر افراد کو چنا۔ انہیں ایک جماعت کی شکل دی، افرادی قوت کے اعتبار سے اس کی منظم کردہ جماعت ہمیشہ سب سے "کمزور" سب سے "چھوٹی" قرار پائی۔ ہجوم اکٹھے کر لینے والوں نے اس کی جماعت کے عددی اختصار پر پھبتیاں کسیں، مگر وہ اس طعن و تنقید سے بے نیاز اپنے اصولِ تنظیم پر اٹل رہا اور پھر اس نے اپنے فلسفۂ تنظیم کا یہ معجزہ دکھایا کہ افرادی قوت کے اعتبار سے کمزور ترین جماعت کو قوتِ عمل کے اعتبار سے ملک کی سب سے بڑی جماعت تسلیم کرایا۔ مخالفوں نے اور حکومتوں نے اس "کمزور ترین" جماعت کو اپنی تنقید اور اپنی جہاتی منصوبہ بندی میں اوّلین ترجیح کا ہدف بنایا۔

تاریخ میں بڑے لوگوں اور ان کے عظیم الشان کارناموں کے تذکروں کی کوئی کمی نہیں مگر ایک چیز دیکھنے کی یہ بھی ہے کہ تاریخ کے ان اکابر میں لوگ یا تو محض بڑے مصنف رہے ہے، بڑے فنکار رہے ہے، بڑے

فلسفی، سیاستدان، نظریہ گر رہے ہیں یا بڑے ہادی، رہنما اور لیڈر رہے ہیں۔
گویا ان کی سرگرمی اور کمال کا میدان محض ایک ہی رہا۔ مگر یہ شخص
عجیب تھا کہ جس نے بہترین افکار و نظریات پر مبنی ضخیم لٹریچر ہی نہیں
دیا بلکہ اپنے افکار و نظریات اور اپنے لٹریچر کے سانچوں میں اُس
نے انسانی کردار سازی کا اچھوتا تجربہ بھی کیا اور ایک دو نہیں بلکہ
ہزاروں اور لاکھوں افراد کو اپنے دیئے ہوئے نظریات و تصورات کی
بنیاد پر نمونۂ عمل بنا کر کھڑا کر دیا۔

ہاں یہ شخص جو داغِ مفارقت دے کر رخصت ہوا ہے جامع کمالات
شخصیت کا حامل تھا۔ اپنی بے حد و حساب علمی مصروفیات کے ساتھ اس
نے بھرپور جماعتی زندگی بھی گزاری اور ملک کی سیاست میں مرکزی اہمیت
کی سیاسی شخصیت بھی رہا۔ اس نے اپنے اخلاق اور عمل کو دوسروں
کے لیئے معیارِ تقلید بنایا۔ اور ان گوناگوں مصروفیات سے وقت نکال
کر اُس نے ایسی مجلسی زندگی بھی گزاری کہ ہر عامی کو اس مجلس میں بار
حاصل رہا۔ زندگی بھر اس نے عصر سے مغرب تک کا وقت لوگوں سے
بلاتخصیص ملاقات کرنے کے لیئے نکالا ہر فرد کو خواہ وہ کسی مرتبے
کسی حیثیت، کسی مزاج اور کسی فکر و نظریے کا حامل کیوں نہ ہو۔ پیشگی
مُلاقات کا وقت طے کیئے بغیر ہر روز اس تک رسائی پانے اُس سے
ملنے اس کا نقطۂ نظر جاننے اور سمجھنے کا موقع حاصل تھا۔ اور ان ہمہ
جہت مصروفیتوں کے ساتھ اُس نے ایک بھرپور عائلی اور خاندانی زندگی
بھی گزاری اور اپنی تمام ذمہ داریوں سے پورے احساسِ ذمہ داری کے
ساتھ عہدہ برآ ہوا۔ سچ یہ ہے کہ وہ اچھے اور پسندیدہ انسان کا بہترین
نمونہ تھا جس سے ہم ہفتے کی شام کو محروم ہو گئے۔

اے ابنائے ملت یہ نادرِ روزگار شخصیت ہم سے چھن گئی۔ یہ

حادثہ ہم پر گزر گیا۔ اس حادثے پر ذہنوں کا مبہوت ہو جانا، قلموں کا ساکت ہونا، دلوں کا خون ہونا، زبانوں کا گنگ ہو جانا، سوچنے کی تاب نہ رہنا، آنکھوں سے جذبات کا تقاطر، احساسات کا انجماد اور رقتوں میں صبر و قرار کا ڈوب جانا سب قدرتی، سب فطری باتیں ہیں۔ مگر یہ نالہ و شیون تابہ کے؟ فنا کسے نہیں؟ سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ ہم اور آپ ایسے انسان تھے، فانی تھے لہٰذا رخصت ہوئے۔ ہاں مگر یہ حقیقت پیش نظر رہے کہ انسان فانی ہوتا ہے اس کا فکر، اس کا نظریہ، اس کا عمل، اس کا مقصدِ حیات فانی نہیں ہوتا۔ اس کو بقائے دوام مل سکتی ہے۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کا فکر ان کے نظریات، ان کا عمل اور ان کا دیا ہوا شعورِ حیات باقی رہیں گے اور ان کی طرح مولانا کی دعوت اور پکار کو بھی کبھی فنا نہیں آئے گی۔ وہ پکار اب بھی سُنی جا سکتی ہے، سنیئے اور توجہ دیجئے

• گواہی دیجئے کہ اللہ کے اس نیک بندے نے اپنی زندگی کا حق ادا کیا۔

• گواہی دیجئے کہ اپنے مقصدِ حیات کے ساتھ اُس نے پُورا پُورا انصاف کیا۔

• گواہی دیجئے کہ اللہ نے اُسے علم و حکمت اور رشد و ہدایت کی جو صلاحیتیں ودیعت کی تھیں وہ انہیں بھرپور طور پر استعمال میں لایا۔ اس نے اللہ کا قرض اپنی اہلیت کے مطابق پُورا پُورا چکایا۔

اُٹھو! اے ابنائے قوم اے سید مودودیؒ کو مرشد تسلیم کرنے والو! اس گواہی کے ساتھ ہی اس کی موت پر اپنے اضمحلال کو ایک جھٹکے کے ساتھ دور کرو، اپنی رقتوں کو مترنم کرو کہ فضا کی سوگواری ختم ہو، آنسوؤں کے رواں قافلوں کو انقلابی عزم و ارادے کے طوفانی

دھاروں میں بدل دو اور پوری یکسوئی کے ساتھ اس مشن کی طرف متوجہ ہو جاؤ جو تمہارے مرشد نے تمہارے اتالیق مہربان نے تمہارے رہبر و رہنما نے تمہارے لیے چھوڑا ہے۔ یہ مشن ہے، اس ملک میں نظام اِسلامی کا مکمل رواج و نفاذ! ——————

خدا تمہارا اور ہم سب کا حامی و ناصر ہو!

-●-

روزنامہ "جنگ" کراچی

مولانا سیّد ابو الاعلیٰ مودودیؒ

تحریکِ اسلامی کے قائد اور جماعتِ اسلامی کے بانی مولانا سیّد ابو الاعلیٰ مودودیؒ کی رحلت ایک بڑا عظیم سانحہ ہے۔ آج صرف پاکستان ہی نہیں پورا عالمِ اسلام رنج وغم میں ڈوب گیا ہے۔ علومِ اسلامیہ کے تمام مراکز میں صفِ ماتم بچھ گئی ہے۔ علماء و فضلاء مغموم اور طلباء افسردہ ہیں، ادب و صحافت کے حلقوں پر غم کی گھٹا چھا گئی ہے، علم و تحقیق کے مرکز خاموش اور ویران نظر آرہے ہیں، بوڑھے سوگوار اور جوان اشکبار ہیں۔ قوم کا ہر فرد غمگین اور پوری ملت اندوہگیں ہے، آہ! یہ کیسا غم ہے جس کی گھٹا عالمِ اسلام کے ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک چھا گئی ہے! یہ کیسا رنج ہے جس کی ٹیس خاص و عام، شاہ و گدا سب محسوس کررہے ہیں! یہ کیسی دولت تھی جو ہم سے چھن گئی۔ ہمارے خزانے کا یہ کیسا گوہر تھا جو زیرِ خاک چلا گیا، ہمارے چمن کا یہ کیسا پھول تھا جو مرجھا گیا! اب ہم ایسا عالم، ایسا فقیہہ، ایسا مجتہد، ایسا مدبر، اسلام کا ایسا مجاہد، ایسا مصنف، ایسا ادیب، ایسا محقق، اسلامی تحریک کا ایسا رہنما کہاں سے لائیں گے! ہمیں وہ دیدہ ور کیسے ملے گا جس کے لیئے قومیں ہزاروں سال انتظار کے دن گنتی ہیں!

مولانا مودودیؒ پاکستان کے لیئے ایک وجہ افتخار تھے، یہ سوچ کر ہمارا سر فخر سے اونچا ہوجاتا تھا کہ مودودیؒ جیسا عالم اور فقیہہ ہمارے

درمیان موجود ہے۔ اس اعزاز و افتخار پر ہمیں قابلِ رشک سمجھا جاتا تھا۔ خصوصاً عالمِ عرب میں۔ مولانا کی زبان و قلم پاکستان کے ایسے مؤثر ترجمان تھے جس کا آج کوئی بدل موجود نہیں ہے۔ عرب عوام ہوں یا ان کے سربراہ سب کے نزدیک مولانا کے پیغامات اور تحریریں یکساں طور پر وقیع اور معقول و محترم تھیں۔ پاکستان پر جب بھی کوئی نازک اور آڑا وقت آیا عالمِ اسلام کے سربراہوں اور رہنماؤں کے نام مولانا مودودیؒ کے پیغامات نے ان کی فوری امداد و حمایت حاصل کرنے میں بڑا مؤثر کردار ادا کیا۔ پاکستان اور اس کے مفادات کے ایک ایسے ترجمان اور بہی خواہ کی جدائی ہمارا ایک ناقابلِ تلافی نقصان ہے۔

مولانا کا اصل کارنامہ برصغیر میں تحریکِ اسلامی کے اجراء سے تعلق رکھتا ہے۔ مولانا نے جس دَور میں اپنے مشن کا آغاز کیا وہ برصغیر میں آزادی کی تحریکوں کا دَور تھا۔ مولانا نے اس وقت کی کسی سیاسی تحریک میں شرکت کی بجائے ایک علیحدہ اسلامی تحریک کا آغاز کیا۔ اس کا مقصد ذہنی انقلاب اور اخلاقی تربیت کے ذریعہ ایسے افراد تیار کرنا تھا جو اسلامی نظام کے قیام کے لیے جد و جہد کر سکیں، جو کسی باطل نظام کے تحت ملنے والی مذہبی آزادی پر قانع نہ ہوں بلکہ اس نظام کو بدل کر اسلام کی بنیاد پر ایک نئے نظام کو قائم کرنے کا جذبہ رکھتے ہوں، اسی کے لیے وہ کام کریں، اسی کے لیئے وہ اپنی قوتوں کو منظم کریں مستقبل میں سیاسی حالات خواہ کیسے ہی کیوں نہ ہوں، ان کی جد و جہد کا ہدف اسلامی انقلاب اور بالآخر اسلامی حکومت کا قیام ہو۔

اس اعتبار سے مولانا مودودیؒ کی تحریک ایک مثبت اور متوازی تحریک لازماً تھی، لیکن مسلمانوں کے اندر اُٹھنے والی آزادی کی کسی تحریک سے اس کا تصادم نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریک، اسلامی تحریک

کے وسیع تر مفاد میں آزادی کی مسلم تحریکوں کے ساتھ مختلف مراحل میں تعاون کرتی نظر آتی ہے۔ متحدہ قومیت کے نظریے کے خلاف مولانا کی نہایت مؤثر اور مدلل تحریریں جو کانگریسی پروپیگنڈے کے لیے ضربِ کاری ثابت ہوئیں تعاون کے اسی سلسلے کی ایک کڑی ہیں۔ سخت نامساعد حالات میں مولانا کی اسلامی تحریک کے وقت کے ساتھ ساتھ منظم اور مضبوط ہوتے چلے جانے کا بڑا سبب ان کی دل و دماغ کو مسخر کر لینے والی پاکیزہ شخصیت کے علاوہ ان کا تیار کردہ وہ لٹریچر تھا جو بہترین ادبی خصوصیات کے ساتھ اپنے اندر دل و دماغ کو بدل دینے کی انقلابی طاقت رکھتا ہے۔ اس برصغیر میں جلیل القدر علماء اور مذہبی لٹریچر کی کبھی کمی نہیں رہی ہے لیکن اس دور میں جبکہ مسلمانوں کی جدید تعلیم یافتہ نسلیں مغربی افکار اور فلسفوں سے مسحور تھیں ایک ایسے عالم اور اسلامی مفکر کی ضرورت تھی جو علومِ اسلامی کا ماہر ہونے کے ساتھ مغربی علوم اور فلسفوں پر ناقدانہ نظر رکھتا ہو اور جس کے قلم میں اتنی طاقت ہو کہ وہ مغربی نظریات کے تار و پود کو بکھیر کر رکھ دے۔

مولانا مودودیؒ نے وقت کی اس اہم ضرورت کو پورا کر دیا۔ انہوں نے اپنے لٹریچر میں ایک طرف مغرب کے معاشی، سماجی اور اجتماعی فلسفوں پر تنقید کر کے ان کی بنیادیں ہلا دیں اور دوسری طرف اسلامی اصولوں اور نظریات کی ایسے ذہن نشین انداز میں وضاحت کی کہ جدید تعلیم یافتہ طبقے کے ذہن میں پڑی ہوئی وہ ساری گرہیں کھل گئیں جو مغربی علوم نے لگائی تھیں۔ مولانا مودودیؒ کی شخصیت اور لٹریچر کی یہی وہ خصوصیت تھی جس نے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں پڑھنے والے ہزاروں لاکھوں طلبا کے ذہن و دل کو بدل کر رکھ دیا اور وہ اسلام کے گرویدہ ہوتے چلے گئے۔ یہی وجہ ہے کہ احیائے اسلامی کا کام کسی کے ساتھ مل کر

کرنے کے لیئے علامہ اقبالؒ کی نظر کسی پر پڑی تو وہ مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ ہی کی شخصیت تھی۔

مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ کے اس انقلابی اور تحریکی لٹریچر کو اس قدر مقبولیت حاصل ہوئی کہ اس برصغیر اور دُنیا کی تمام قابلِ ذکر زبانوں میں کم و بیش اس کا ترجمہ ہو چکا ہے اور یہ مختلف ممالک میں اِسلامی تحریکوں کو اُبھارنے اور تقویت پہنچانے کا سبب بنا ہے خصوصًا مولانا کی تفسیر تفہیم القرآن نے جدید نسلوں کے اذہان کو قریب لانے، قرآن کے مطالعہ اور قرآن فہمی کا ذوق پیدا کرنے میں ایک بڑا اہم کردار ادا کیا ہے۔ مولانا محترم نہ صرف ایک عظیم لٹریچر اپنے پیچھے چھوڑ گئے ہیں جو اِسلام کی انقلابی تحریک کو ساری دُنیا میں آگے بڑھاتا رہے گا بلکہ اپنے پیچھے ایسے علماء، جدید تعلیم یافتہ نسل سے تعلق رکھنے والے ایسے مفکرین و محققین کے ایک بڑے طبقے کو منظم کر گئے ہیں جو اِسلامی انقلابی لٹریچر تیار کرنے میں مسلسل مصروف ہے۔ مولانا نے جدید طرزِ استدلال کے ساتھ اِسلام کو پیش کرنے کے لیے اہلِ قلم کو راہ بتائی انہیں نیا اسلوب اور طرز دیا۔ جدید اصطلاحوں اور تراکیب کو زباں زدِ عام کیا۔

مولانا مودودیؒ کے علمی و اِسلامی کارنامے کا ایک اور اہم پہلو یہ ہے کہ انہوں نے دین اور سیاست کی علیحدگی کے تصوّر پر کاری ضرب لگائی اور اس بات پر زور دیا کہ اِسلام کو ماننے والوں اور نیک افراد کا فرض ہے کہ وہ سیاست میں حصّہ لیں اور خدا فراموش اور مفسد عناصر کو بے دخل کر کے زمامِ کار اپنے ہاتھوں میں لے لیں تاکہ حکومت کی طاقت اور وسائل کو اِسلامی قوانین کے نفاذ کے لیے استعمال کیا جا سکے، مولانا محترم اور ان کی تحریک کا یہی مؤقف تھا جو ملک کے

آمر حکمرانوں کو بار بار غضبناک کرتا رہا، چنانچہ مولانا محترم کو نہ صرف بارہا قید کیا جاتا رہا بلکہ انہیں پھانسی پر چڑھانے کی بھی کوشش کی گئی، لیکن مولانا نے تمام آلام و مصائب کو خندہ پیشانی سے برداشت کیا اور جابر سلطان کے آگے ہمیشہ کلمۂ حق کہتے رہے۔

پاکستان منتقل ہونے کے بعد مولانا محترم نے پورے ملک کا دورہ کر کے اسلامی نظام کے قیام کی تحریک چلائی اور اس تحریک میں تمام اسلامی جماعتوں اور علماء کا تعاون حاصل کیا۔ مولانا کی یہی تحریک قراردادِ مقاصد کا سبب بنی اور اس تحریک کی بنیاد پر پاکستان میں بننے والے ہر دستور میں اسلامی قوانین سے متعلق دفعات رکھنے کے لیے پاکستان کے حکمران مجبور ہو گئے۔ مکمل اسلامی نظام کے قیام کا مقصد مولانا کی زندگی میں پورا نہ ہو سکا، لیکن انہوں نے اپنی زندگی ہی میں دیکھ لیا کہ پاکستان میں اسلامی نظام کے قیام کی بنیادیں رکھ دی گئی ہیں۔ یہی پاکستان کے قیام کا اصل مقصد تھا۔ جس کے لیے مولانا مودودیؒ زندگی بھر جدوجہد کرتے رہے۔ ان کا قلم اسلام کے لیے پوری نصف صدی تک حرکت میں رہا۔ بیماری اور بڑھاپے کے آخری دور میں بھی وہ سیرتِ رسولِ اکرمؐ پر بڑا اہم کام انجام دے گئے۔

اب ہم مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ کی ان عظیم خدمات کی قدر ملک میں اسلامی نظام کو مکمل طریقے پر نافذ کر کے ہی کر سکتے ہیں۔

مولانا مودودیؒ ہمارے درمیان نہیں رہے لیکن ان کی اسلامی تحریک اور ان کا عظیم لٹریچر ہمیشہ انہیں زندہ و تابندہ رکھے گا۔ اللہ تعالیٰ مولانا محترم کو اعلیٰ علیین میں جگہ دے اور انہیں جنت الفردوس

عطا کرے اور کروٹ کروٹ اپنی رحمتوں سے سرفراز فرمائے اور سب کو صبرِ جمیل عطاء فرمائے۔

آمین ثُم آمین۔

-●-

ہفت روزہ "زندگی" لاہور

صدی کا رجلِ عظیم

چودھویں صدی ہجری جاتے جاتے اس بے بدل مفکرِ اسلام کو بھی ساتھ لے گئی، جس کی ولولہ انگیز فکر نے اس صدی کو اسلام کی نشاۃ ثانیہ کی صدی بنا دیا۔ برصغیر پاک و ہند کو اس بات پر بجا طور پر فخر ہے کہ دریائے آمو سے لے کر جزائر انڈونیشیا تک پھیلے ہوئے عالمِ اسلام کو حیاتِ نو سے ہمکنار کرنے والے رجال اسی عجمی سرزمین میں پیدا ہوئے، جہاں سے میرِ عرب کو ٹھنڈی ہوا کے جھونکے آیا کرتے تھے۔ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ سے لے کر اقبال تک اور اقبالؒ سے لے کر مودودیؒ تک مفکرین کا یہ سلسلۃ الذہب ایک ہی مقصد یعنی اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے لیے سرگرم رہا، جس کی حسرت کا داغ لے کر بے شمار اللہ والے اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ افراد کا مقام اگرچہ تاریخ ہی متعین کرتی ہے، لیکن اس بات سے انکار ممکن نہیں کہ چودھویں صدی ہجری پر اقبالؒ اور مودودیؒ کی گہری فکری چھاپ کسی معاند کے مٹائے مٹ نہیں سکتی۔ انہوں نے دلوں کو جو ولولۂ تازہ بخشا یہ اسی کا اعجاز ہے کہ اسلام اب قصۂ ماضی نہیں رہا، جو صرف مستشرقین کی دلچسپی کا موضوع بنا ہوا تھا، بلکہ ایک مرتبہ پھر وہ ایک انقلابی تحریک کی صورت میں طلوع ہو رہا ہے، جس کا غلغلہ ہر اسلامی ملک میں سنا جا سکتا ہے اور جس کی دھمک سے بے شمار بلند و بالا کاخِ حکومت کانپ رہے ہیں۔ اسلام کی یہی نشاۃِ ثانیہ ایران کی نجات دہندہ ثابت

ہوئی ہے، جس کے لیے تند و تیز سیلاب کے سامنے دو ہزار سالہ مستبد شہنشاہی خس و خاشاک کی طرح بہ گئی اور اسلام کی یہی نشاۃ ثانیہ انشاء اللہ افغان مسلمانوں کے لیئے بھی نتیجہ خیز ثابت ہوگی، جو سرخ سامراجیت کی یلغار کے سامنے سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح کھڑے ہیں، خود پاکستان میں، جس کی تخلیق ہی اسلامی تحریک کی مرہونِ منت ہے، بیسویں صدی عیسوی کی مستبد اور عیار ترین ڈکٹیٹرشپ اسلامی انقلاب کے سامنے پسپا ہونے پر مجبور ہو گئی اور شواہد بتا رہے ہیں کہ دو ماہ بعد شروع ہونے والی پندرہویں صدی ہجری انشاء اللہ احیائے اسلام کی صدی شمار ہوگی اور دنیا کا نقشہ اس قدر تبدیل ہو جائے گا کہ آنکھ اسے دیکھ کر محوِ حیرت رہ جائے گی۔

مولانا مودودیؒ اگرچہ اپنی طبعی عمر پوری کر کے دنیا سے رخصت ہوئے، لیکن پوری دنیا میں بالعموم اور دنیائے اسلام میں بالخصوص ان کی وفات پر جس طرح رنج و غم کا اظہار کیا گیا ہے، اس سے ایک بار پھر ثابت ہو گیا کہ جو لوگ اعلیٰ مقاصد کی تائید و حصول میں تا دمِ آخر کام کرتے رہتے ہیں، وہ کتنی ہی طویل عمر کیوں نہ پائیں، اُن کی وفات ہمیشہ قبل از وقت اور تکلیف دہ محسوس ہوتی ہے۔ مولانا نئی نسل کی محبوب ترین شخصیت تھے، اِس لیئے قدرتی طور پر سب سے زیادہ غم اس نوجوان نسل کو ہوا، جس کا "بابا" ان کی نظروں سے اوجھل ہو گیا ہے۔ مولانا سے نوجوان نسل کی یہ محبت بلاوجہ نہیں تھی۔ یہ مولانا مودودیؒ ہی تھے، جنہوں نے مسلمان نوجوانوں کو بے روح مذہب پرستی کی دلدل سے نکال کر اسلام کی انقلابی روح سے آشنا کیا۔ اگر اقبالؒ اور مودودیؒ نہ ہوتے، تو بے شمار مسلمان نوجوان عصرِ حاضر کی گمراہ کن فکری تحریکوں کا تر نوالہ بن چکے ہوتے۔ چودہویں صدی

ہجری کے انہی مسلم مفکرین نے مسلم نوجوانوں کو خود شناسی کی دولت عطاء کی اور انہیں بتایا کہ اِسلام کی صورت میں وہ کتنی بڑی دولت کے امین ہیں۔ اسی احساس نے مسلم نوجوانوں کو "حاضر و موجود" سے بیزار کر کے ان میں "جہانِ نو" کی تعمیر کا جذبہ پیدا کیا اور "اِسلامی انقلاب" کی صورت میں انہیں ایک ایسا نصبُ العین دے دیا جو ظُلم اور بے انصافی کے بوجھ تلے کراہتی ہوئی دُنیا کو امن اور انصاف کی ضمانت دے سکتا ہے۔ یہ انہی لوگوں کا فیضانِ نظر ہے کہ آج ہر کالج اور ہر یونیورسٹی میں لاتعداد ایسے نوجوان نظر آتے ہیں، جو اِسلام کے لیے اپنی جانیں تک قربان کرنے کے لیے تیار ہیں۔

حضرت علامہؒ کے بقول جہانِ تازہ کی نمود افکار تازہ سے ہی ممکن ہے، کیونکہ محض سنگ و خشت سے نیا جہاں وجود میں نہیں آ سکتا۔ اس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو مولانا مودودیؒ جہانِ تازہ کے معماروں کی پہلی صف میں کھڑے نظر آتے ہیں، جو سرمایۂ داری اور کمیونزم پر مبنی جہانِ کہنہ کو مسمار کر کے اِسلام کی آفاقی بنیادوں پر نئے جہان کی بنیادیں استوار کرنا چاہتے ہیں۔ شاید اسی لیے سرمایۂ داری اور کمیونزم دونوں نظاموں کے گماشتے انہیں اپنا دشمن سمجھتے ہیں، لیکن مولانا مودودیؒ کے بقول، "جس طرح کل سورج کا طلوع یقینی ہے، اس طرح اِسلامی نظام کا قیام بھی یقینی ہے۔" ہمیں یقین ہے کہ مسلمانوں کی نئی نسل اس فکر کی روشنی میں مسلسل آگے بڑھتی جائے گی، تا آنکہ اللہ کی یہ زمین اپنے پیدا کرنے والے کے نُور سے جگمگا اُٹھے اور انسانیت فلاح و کامرانی سے ہمکنار ہو جائے۔

الطاف حسن قریشی،

(بشکریہ ہفت روزہ "زندگی" لاہور، ۲۸ ستمبر تا ۴ اکتوبر ۱۹۷۹ء)

ہفت روزہ "بادبان" لاہور

سیّد مودودیؒ

زندہ ہیں، زندہ رہیں گے

یہ چہرہ اداس کیوں ہے؟ یہ ہر آنکھ نمناک کیوں ہے؟ یہ ہر دل فگار کیوں ہے؟ یہ قریہ قریہ آواز کیوں ہے؟ یہ گوشہ گوشہ پکار کیوں ہے؟ یہ غم کی برسی برسات کیوں ہے؟ یہ سورج کی کرنیں کیوں بجھ گئی ہیں؟ یہ چاند کا رنگ کیوں اُڑا اُڑا ہے؟ یہ پھولوں کی تاب کیوں تھک گئی ہے؟ —— یہ پہاڑ جیسے انسان، یہ سمندروں سے سینے، یہ دریاؤں کے سے دل کیوں لرز رہے ہیں، کیوں بکھر رہے ہیں، کیوں رو رہے ہیں، کیوں رو رہے ہیں؟

اے وہ لوگو، جو یہ سب کچھ دیکھ رہے ہو، اے وہ لوگو جو اس سب کا حصہ ہو، اے وہ آنکھو، جو پانیوں میں ڈوب گئی ہو، اے وہ مسکراہٹو، جو دم توڑ گئی ہیں ——

اے انسانو، اے پہاڑو، اے زمانوں، تمہیں کیا ہُوا ہے، تم پر کیا گزر گئی ہے، تمہیں کس نے اداس کر ڈالا ہے، کس نے تم سے زندگی چھین لی ہے؟

کیا آواز آئی —— کیا بجلی لہرائی —— کیا روشنی لرزی —— کیا اُجالا تڑپا —— کیا اندھیرا چھایا —— سیّد مودودیؒ انتقال کر گئے، وہ شخص اِس جہاں سے رخصت ہوگیا کہ جو ایک شخص نہیں تھا۔ جو ایک عہد تھا، عہد ساز تھا۔ جو شخصیت ہی نہیں شخصیت ساز تھا۔ جو ادارہ ہی نہیں ادارہ ساز تھا —— جو انقلاب تھا، انقلاب کے

آواز تھا ـــــــ جس نے برسوں پہلے، نصف صدی پہلے للکارا، پکارا، اے مسلمانو، اٹھو، مسلمان بن جاؤ اور پھر دنیا کو مسلمان بنادو ـــــــ اُٹھو، اپنی زندگی بدلو، اور پھر پوری انسانیت کی زندگی بدل ڈالو ـــــــ اُٹھو اپنی ذات میں انقلاب پیدا کرو، پھر پوری دنیا میں انقلاب کی صدا بن جاؤ ـــــــ اُٹھو کہ تمہارا مرنا، جینا، اٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا، صرف اور صرف تمہارے رب کے لیے ہے ـــــــ اُٹھو، کہ خدا کا گھر، خدا کا مقام مسجد تک محدود نہیں ہے، ہر بازار، کوچے، گلی، محلے، تھانے، کچہری، ایوان اور جھونپڑی کو مسجد بنا ڈالو ـــــــ اُٹھو، دیکھو، سمجھ لو، اسلام پوجا پاٹ کا مذہب نہیں ہے، یہ رسومات کا نام نہیں ہے، یہ ایک مکمل نظامِ حیات ہے، ایک طرزِ زندگی ہے، اس میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ ـــــــ اُٹھو، سیاست، معاشرت، معیشت، سب پر اپنے رب کے احکام نافذ کر دو، ہر شعبے کو مُسلمان بنادو۔

جب یہ آواز گونجی تو یہ اس پورے عہد کی تنہا آواز تھی، صدیوں کی غلامی نے، صدیوں سے بلند ہونے والی اِس آواز کو بھلا ڈالا تھا ـــــــ جب یہ آواز گونجی تو ہر شخص اپنے بُت لے کر آگے بڑھا، اس آواز کا راستہ روک لیا ـــــــ یہ شخص مذہب کو "ازم" بنا دینا چاہتا ہے، یہ مجدد بننا چاہتا ہے، یہ بڑے بڑے جبّوں پر تنقید کرتا ہے، یہ عماموں کی گرہیں کھولتا ہے، یہ مدرسوں پر برستا ہے، یہ کالجوں کو ٹوکتا ہے، یہ مسٹروں سے مسٹری۔ مُلّا سے مُلائیت چھین لینے کے درپے ہے۔ یہ نسل، رنگ اور زبان کے بُت نہیں مانتا، اُنہیں توڑ دینا چاہتا ہے ـــــــ اس کا راستہ روک لینا چاہیئے، اس کا گلا گھونٹ دینا چاہیئے۔

سو رَاستہ غلاظتوں سے اٹ گیا، رُکاوٹوں سے پٹ گیا، ایک

قدم بڑھنا دشوار سے دشوار تر ہوگیا ـــــ لیکن یہ شخص اپنا راستہ آپ بنانے کا قائل تھا۔ اس کے ہاں غصہ تھا نہ اشتعال ـــــ اُس نے اعلان کر دیا، کہ دنیا میں حق کا استقبال اِسی دُھوم دھام سے ہوتا آیا ہے، یہ شان اہلِ حق کی ہے کہ ان کا اسی طرح خیر مقدم کیا جائے۔ ہم جس داعیٔ انقلاب کے ادنیٰ غلام ہیں، اُس کے لیئے بھی مکّے اور طائف کی گلیاں یہی سوغاتیں لے کر بڑھی تھیں ـــــ سو، یہ شخص کھڑا رہا، آواز دیتا رہا، اپنے ہاتھ سے غلاظتیں ہٹاتا رہا، نفاستیں عام کرتا رہا، اور آگے بڑھتا گیا، راستہ صاف ہوتا گیا ـــــ اور، اس شخص نے ۷۶ برس گزار کر اس دُنیا سے نقل مکانی کی ہے، تو زمانے بھر میں اس کی آواز گونج رہی ہے ـــــ پاکستان سے ایران اور اس سے بھی آگے، کہیں، آگے، اس کی آواز دلوں کو گرما رہی ہے، انقلاب، انقلاب، اِسلامی انقلاب ـــــ اب دُنیا بھر میں، وہ اِسلامی انقلاب کا پیغامبر بن گیا ہے، اور ہر جگہ کے مسلمان اس کے راستے میں پھول بچھاتے، اور اپنے راستے کے کانٹے ہٹاتے ہیں۔ کئی برس پہلے کا تنہا آدمی، آج تنہا نہیں ہے، آج وہ رُوحِ عصر ہے، عزیزِ جہاں ہے، راحتِ دل و جہاں ہے۔

تو پھر اے لوگو! تم کس جھوٹی خبر پر ایمان لائے ہو، اے آنسوؤ! تم کس غلط فہمی کا شکار ہو گئے ہو ـــــ اے اندھیرو! تم کیوں خوش ہو رہے ہو، اور اے اُجالو ـــــ تم کیوں مضطرب ہو، تمہیں خبر نہیں کہ سیّد مودودیؒ مر ہی نہیں سکتے ـــــ وہ تو بس ایک بستی سے، دوسری بستی تک گئے ہیں۔ پہلے ان کی رہائش بر سرِ زمین تھی، اب ذرا زیرِ زمین ہے۔ پہلے وہ ۵۔اے ذیلدار پارک کے پختہ کمرے میں رہتے تھے، اب چند قدم کے فاصلے پر

ذرا مٹی کے گھر میں جا بسے ہیں ـــــ وہ عمر بھر کی مشقت سے تھک بہت گئے تھے، اب ذرا آرام کریں گے، اور پھر اس وقت ہم سے آملیں گے، جب ہم سب اپنے رب کے حضور پیش ہوں گے۔

موت تو اس کو آتی ہے، جو بس ایک آدمی ہوتا، جو فکر نہیں ہوتا، جو انقلاب نہیں ہوتا ـــــ فکر اور نظریہ کبھی نہیں مرتا۔ صدائے انقلاب کبھی نہیں ڈوبتی، ـــــ سیّد مودودیؒ انقلاب کی آواز تھے۔ اُن کے لئے موت کہاں؟ وہ تو بس اس امتحان گاہ سے عظیم الشان کامیابی حاصل کر کے، جلسۂ تقسیم اسناد میں شرکت کرنے گئے ہیں ـــــ اب ہم ہیں اور یہ امتحان گاہ ہے، اب پھر کسی کو پھر کسی کا امتحان مقصود ہے ـــــ ہم نے سیّد مودودیؒ کے راستے کو اپنا لیا تو کامیابی، ہمارے بھی قدم چوم لے گی، نہیں تو ہم زندہ رہتے ہوئے بھی مُردہ کہلائیں گے، وہ زندگی جو خود ہی موت میں ڈھل جاتی ہے۔

تو، اے لوگو، آؤ، اور اپنی زندگی کو زندگی کے سانچے میں ڈھالو اور ـــــ سُن لو، اور سمجھ لو کہ سیّد مودودیؒ کی موت کی خبر غلط ہے، بالکل غلط ـــــ!

اے چہرو، اُداسی جھٹک دو، اے آنکھو، آنسو خشک کر لو، اے دلو، اضطراب سے نجات حاصل کر لو ـــــ سیّد مودودیؒ زندہ ہیں، زندہ ہیں، زندہ رہیں گے !!!!

بشکریہ ہفت روزہ "بادبان" لاہور، ۲۸ ستمبر ۱۹۷۹ء۔
مجیب الرحمٰن شامی۔

-●-

ہفت روزہ "تعبیر" کراچی

سَیّدؒ زندہ ہے!

چودھویں صدی کا سورج غروب ہوگیا۔ ہمیں خبر ہوئی کہ ہم دورِ فِتن کی ظلمتوں میں زندگی بسر کر رہے تھے۔ اس کی جگمگ میں تھے، تو نہیں جانتے تھے کہ تاریکیاں کتنی شدید ہیں۔ سَیّد ابُوالاعلیٰ مودودیؒ کے ساتھ ایک عہد، ایک صدی، ایک قرن ہی تمام نہیں ہُوا، حق کی خاطر لڑنے والوں کا سب سے بڑا سہارا چھن گیا۔ آج لفظوں کو یارا نہیں کہ اس غم کا اظہار کر سکیں۔ اس کی توصیف، اس کی تعریف، اس کی مدح کا حق اَدا نہیں ہو سکتا۔ یہ غم کِسی ایک فرد کا غم نہیں، پوری ملّتِ اِسلامیہ کا غم ہے؛ اور جو لوگ اس غم سے باہر ہیں، وہ ملّتِ اِسلامیہ سے بھی باہر ہیں۔ ہم نہ فقیہہ ہیں، نہ محدّث، نہ عالم ہیں، نہ صوفی، محمّد صلی اللہ علیہ وسلم کے ادنیٰ غلام ہیں، جز دو حرُوف لَآ اِلٰہَ کچھ نہیں رکھتے، ہم صِرف اتنا جانتے ہیں کہ سَیّد مودودیؒ نہ ہوتے تو گمراہی کا طوفان نسلِ نو کو بہا کر لے جاتا۔ دنیا بھر کے مُسلمان انقلابی اس قوت و حرارت سے محروم ہو جاتے جس سے آج طاغوتی طاقتوں کے ایوانوں میں زلزلے ہیں۔ کفر ایمان پر، جہالت علم پر، بچھورا پن متانت پر فتح پا لیتا۔ اور یہ قرنِ آخر اپنی فتنہ سامانیوں کے ساتھ مہیب تر ہو جاتا۔

سَیّد مودودیؒ کا غم بے پناہ غم ہے اور سَیّد مودودیؒ

کی شخصیت بے پناہ شخصیت۔ یہ غم اس شخصیت کو اور یہ شخصیت اس غم کو دبائے ہوئے ہے۔ نہ یہ بتانا ممکن ہے کہ اس وقت عالمِ اسلام پر کیا بیت رہی ہے اور نہ سیّد مودودیؒ کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ ہمارے بس میں ہے۔ ہم عاجز و گناہ گار قلم کار اس لمحے صرف اپنے ربِ کریم کے سامنے دست بدعا ہیں:

"اے خدا! اپنے اس نیک بندے کے کام کو قبول فرما، اس نے جو روشنیاں بکھیری تھیں، ان کی ضیاء سے ہمارے دِلوں کے چراغوں کو منور رکھ، اپنے بندوں کو توفیق دے کہ وہ باطل کے ان گھٹا ٹوپ اندھیروں میں صدق و صفا کی شمعیں جلا سکیں، طاغوتی طاقتوں کو سرنگوں کر، سامراج کو شکست دے تاکہ تیرے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کا بول بالا ہو سکے کہ یہی سیّدؒ کی زندگی کا مشن تھا۔"

آخر میں، ہمیں سیّد مودودیؒ کے غم زدگان کو ایک بات یاد دلانا ہے کہ زندہ لوگ کبھی مرا نہیں کرتے، کون کہتا ہے سیّدؒ مر گیا، وہ تو امر ہو گیا اور ہاں اگر تمہیں گوشت پوست کے اس انسان سے محبت تھی تو پھر وہ فانی انسان تہہ خاک چادر اوڑھ کے ابدی نیند سو چکا ہے، اور اگر تم اس سیّدؒ کے چاہنے والے تھے جو خدا کا نام بلند کرتا تھا، تو یاد رکھو وہ خدا حیّ قیوم ہے اور اس کا نام بلند کرنے والا بھی ابدالآباد تک ہمارے درمیان ہے۔ سو اپنی اپنی تلواریں نیام میں کر لو، سیّد مودودیؒ انتقال کر چکے، اپنے غموں کے حصار سے نکلو کہ تمہیں خدا کا نام اب سیّد مودودیؒ کے بغیر ہی بلند

کرنا ہے۔ کیا کہا، سید مودودیؒ کے بغیر نہیں نہیں، اس قوت کے ساتھ جو سید ہی کی عطا کردہ ہے۔ سید مودودیؒ ہمارے ساتھ ہے اور ہمارے ساتھ رہے گا، ابدالآباد تک۔
بشکریہ ہفت روزہ تعبیر کراچی، ۲۸ر ستمبر ۱۹۷۹ء۔

سجاد میر۔

-●-

مولانا مودودیؒ کی وفات پر علماءِ کرام اور دانشوروں کے تاثرات کا انتخاب

حافظ الحدیث مولانا عبداللہ درخواستی، مولانا مفتی محمود

"مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی وفات سے پاکستان ایک عظیم مذہبی سکالر سے محروم ہوگیا ہے، جن کو پاکستان اور پورے عالمِ اسلام میں احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ مرحوم قرآن و سنت پر ایک سند کی حیثیت رکھتے تھے، ان کی موت سے پیدا ہونے والا خلاء مدتوں پر نہیں ہو سکے گا۔"

شیخ القرآن مولانا غلام اللہ خاں

"مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی موت سے عالمِ اسلام میں جو خلاء پیدا ہوگیا ہے وہ پُر نہیں ہو سکتا۔ مولانا مرحوم ایک مفکر اور مذہبی سیاسی عالم تھے۔ ان کی تعلیمات نے نوجوان پود کو مغربیت نوازی سے دُور اور اسلام کے قریب کر دیا۔"

مفسرِ قرآن مولانا امین احسن اصلاحی

"مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ جیسے عظیم مذہبی اسکالر کی موت، خاندان یا جماعت ہی کا نقصان نہیں، بلکہ یہ پوری ملتِ اسلامیہ کا ناقابلِ تلافی نقصان ہے۔ اہلِ علم میں ان کا ایک خاص مقام تھا، اور میں نے اس دَور میں

کسی دوسرے شخص کو اس پہلو سے ان کا ہم پلہ نہیں پایا۔"

مولانا ظفر احمد انصاری

"مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی رحلت نہ صرف پاکستان، بلکہ پورے عالمِ اسلام کے لئے ایک عظیم سانحہ ہے انہوں نے اپنی ساری توانائی اور پوری عمر مسلمانوں کی فکری، علمی اور عملی راہنمائی اور اسلام کی سربلندی کی کوشش میں صرف کردی۔ نصف صدی سے زیادہ مدت تک وہ جس انہماک اور استقامت کے ساتھ اسلام کی خدمت کرتے رہے اور جس خاص اسلوب سے انہوں نے اسلام کی حقانیت ثابت کرنے کے لئے اَن تھک علمی اور عملی کوشش کی۔ اس نے جدید ذہن کو خاص طور پر بہت متاثر کیا۔"

مولانا عبدالقدوس بہاری

"علامہ رازیؒ، غزالیؒ اور ابن ارشد کے بعد مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے جس خلاء کو پورا کیا تھا ان کی رحلت سے اس خلاء کی وسعت میں کہیں زیادہ اضافہ ہوگیا ہے۔"

مولانا عبدالحلیم قاسمی

"مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمۃ اللہ موجودہ صدی کے وہ راہنما تھے کہ عالمِ اسلام ان کی دینی بصیرت کا نہ صرف معتقد تھا بلکہ ان کی قیادت کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتا تھا۔ مولانا مودودیؒ کی وفات عالمِ اسلام کے لئے حادثۂ عظیم ہے۔"

مولانا محمد سلیم الدین شمسی (شارح مثنوی مولانا رومؒ)

"مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ اس صدی کے وہ صاحبِ عزیمت محقق عالم دین تھے جنہوں نے شہدائے بالا کوٹ، مولانا عبید اللہ سندھیؒ، جمال الدین افغانیؒ اور مولانا محمد علی جوہرؒ کے بعد اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا علَم تھاما۔"

مولانا عبدالرحمٰن سلفی (امیر جماعت غرباء اہلِ حدیث)

"مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ عظیم مفکرِ اسلام اور مفسرِ قرآن تھے۔ پاکستان میں اسلام کے داعی تھے۔ انکی نگارشات نے نئی نسل کو اسلام کا فہم اور دین کا شعور بخشا۔ وہ بلاشبہ عالم اسلام میں اپنی جامع صفات کے اعتبار سے ممتاز عالم اور راہنما تھے۔ ان کے عظیم دینی کارنامے تاابد زندہ رہیں گے۔"

مولانا معین الدین لکھوی (امیر مرکزی جمعیت اہلحدیث)

"بین الاقوامی مفکرِ اسلام، پاکستان میں جماعتِ اسلامی کے بانی اور اس خداداد مملکت میں اسلامی نظام اور سیکولر ازم کے مابین لڑی جاتے والی جنگ کے قائد مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی وفات، پاکستان ہی نہیں پوری ملّتِ اسلامیہ کے لیے ایک روح فرسا حادثہ اور ناقابلِ تلافی نقصان ہے۔"

مولانا عبدالقادر روپڑی (صدر جمعیت اہلحدیث پاکستان)

"مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی وفات سے نہ صرف پاکستان بلکہ پورا عالمِ اسلام ایک سکالر اور ممتاز عالمِ دین سے محروم ہو گیا ہے۔"

مولانا عبدالستار خان نیازی

"مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ ایک مذہبی راہنما، ریسرچ سکالر اور سیاسی مفکر تھے۔ ان کی وفات سے ملک کی مذہبی اور سیاسی فضاء میں جو خلاء پیدا ہو گیا ہے۔ وہ سالہا سال تک پُر کرنا مشکل ہے۔"

مولانا اسد القادری

"مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی وفات نہ صرف ملتِ اسلامیہ بلکہ پوری انسانیت کا عظیم نقصان ہے، جو ایک دل و دماغ سے محروم ہو گئی ہے۔ مولانا مودودیؒ کا کردار اور تفسیر قرآن اور شارحِ اسلام کی حیثیت اِس صدی پر چھائی ہوئی ہے۔"

صاحبزادہ فضل الحق رضوی (مرکزی سیکرٹری جنرل جمعیت مشائخ پاکستان)

"مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ زندگی بھر پاکستان اور دنیائے اسلام کی خدمت کرتے رہے، انہوں نے اسلام پر نہایت جامع لٹریچر تیار کیا جو رہتی دُنیا تک اُن کے نام کو زندہ رکھے گا، وہ ایک منفرد شخصیت تھے، جن کی تصانیف نے نوجوانوں کو اسلامی جذبہ سے سرشار کیا۔ مرحوم نے اسلامی نظام، عالمی اخوت، امن، سماجی و اقتصادی نظام کے لیے جو انتھک جدوجہد کی ہے اُسے ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ وہ عالمِ اسلام کے لیے بہت بڑا سرمایہ تھے اور اسلام پر سند کی حیثیت رکھتے تھے۔"

علامہ محمود احمد رضوی

"مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ پاکستان میں نظام

اسلامی کے ایک مخلص کارکن اور ممتاز عالم دین تھے۔ ان کی وفات سے جو خلاء پیدا ہوا ہے اُس کا پُر ہونا بہت مشکل ہے۔"

مولانا سیّد احمد جوہر دہلوی (ممتاز شیعہ عالم)

"مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی عالمانہ شخصیت کسی ایک فرقے، گروہ یا ملک تک محدود نہ تھی، بلکہ وہ اپنی بلند پایہ اسلامی تصانیف کے باعث تمام عالم اسلام میں ایک عظیم دانشور اور مفکرِ اسلام کی حیثیت سے پہچانے جاتے تھے۔ ان کی تصانیف میں اہم اور نمایاں مقام "تفہیم القرآن" کو حاصل ہے جو ایک ایسی شمع فروزاں ہے جس کی روشنی اسلامی دُنیا میں قیامت تک باقی رہے گی۔ مولانا مودودیؒ کا دوسرا بڑا کارنامہ مادیت اور لادینیت کے اس دَور میں بڑی جرأت واستقامت کے ساتھ جہاد بالقلم اور اسلام کے بارے میں شکوک وشبہات کو دور کرنا ہے۔"

شیعہ تنظیم، المرکز المسلمین

"سید مودودیؒ ایک عظیم مفکر، نابغۂ روزگار زعیم، جلیل القدر عالم، بلند پایہ انشاپرداز اور اتحاد بین المسلمین کے بہت بڑے داعی تھے۔"

سردار سکندر حیات (صدر آل جموں وکشمیر مسلم کانفرنس)

"مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی رحلت سے ایک ایسا خلاء پیدا ہو گیا ہے۔ جو کبھی پُر نہ ہو سکے گا۔ ان کا انتقال ایسے وقت ہوا جب کہ پاکستانی معاشرہ کو قرآن وسنت کے مطابق ڈھالنے کے لیے ان کی خدمات کی ضرورت تھی۔"

سردار شیرباز مزاری (صدر نیشنل ڈیموکریٹک پارٹی)

"مولانا مودودیؒ کی بے وقت وفات نہ صرف پاکستان کے لیئے بلکہ پوری مسلم دنیا کے لیے عظیم نقصان ہے۔ مرحوم نے اسلامی نظام، عالمی اخوت، امن اور سماجی و اقتصادی نظام کے لیئے جو انتھک جدوجہد کی، اسے ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔"

ظہیر الاسلام فاروقی (صدر مجلسِ اخوت اسلامیہ پاکستان)

"مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ عظیم عالمِ دین، بلند پایہ سیاستدان، مفکر، محقق اور مفسرِ قرآنِ حکیم کی حیثیت سے پوری اسلامی دنیا میں مقتدر تھے، مرحوم علم و سیرت کا حسین مرقع تھے، زندگی بھر کلمۂ حق کی سربلندی کے لیئے ہر حملے کا مردانہ وار مقابلہ کرتے رہے، ان کا لٹریچر آئندہ نسلوں کے لیئے مشعلِ راہ ہے۔"

ایس ایم ظفر (سیکرٹری جنرل پاکستان مسلم لیگ)

"مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ عالمی شہرت کے حامل عظیم مذہبی مفکر، ایک عہد آفریں اور تاریخ ساز شخصیت تھے۔ مرحوم اسلامی قانون پر سند کی حیثیت رکھتے تھے۔ انہوں نے نصف صدی سے زیادہ عرصہ تک مسلمانوں کی مذہبی اور سیاسی رہنمائی کی۔ اسلام کی ترویج کے لیے ان کی خدمات اس قدر زیادہ ہیں کہ ان کا اظہار ممکن نہیں۔

نوابزادہ نصر اللہ خان

"مولانا مودودیؒ کی وفات سے پاکستان کے عوام

اور دنیا بھر کے مسلمان ایک محبِ وطن اور سچے مذہبی رہنما سے محروم ہو گئے ہیں۔ مرحوم نے زندگی بھر عملی اور نظریاتی طور پر اِسلام کی خدمت کی اور نہایت جوش و خروش سے اپنے مشن کی تکمیل میں مصروف رہے۔"

خواجہ خیرالدین

"مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی وفات سے پاکستان اور عالمِ اِسلام اس صدی کے بہت بڑے مفکر سے محروم ہو گیا ہے۔ مولانا مودودیؒ کی تحریروں نے نوجوانوں میں اِسلام سے شیفتگی اور عقیدت کے جذبات پیدا کیے اور تحریر و تقریر کی قوت سے لادینی قوتوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔"

خان اشرف خان (صدر خاکسار تحریک)

"مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ ایک عظیم مدبّر، مفکّر، مفسر اور سیاستدان تھے۔ انہوں نے نہ صرف پاکستان، عرب ممالک بلکہ غیر اسلامی ملکوں میں بھی اپنی تصانیف کے ذریعے اِسلام کی خدمت کی، اِسلام کی خوبیوں اور سوشلزم، کمیونزم اور لادینی نظریات کے درمیان فرق کو دلائل کے ذریعے ثابت کر کے لوگوں کے ذہنوں کو اِسلام کی فیوض و برکات سے آگاہ کیا۔ ان کی وفات عالمِ اِسلام اور پاکستان کے لئے عظیم نقصان ہے۔"

بدیع الزماں کیکاؤس (ریٹائرڈ جسٹس)

"مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی وفات نہ صرف مسلمانانِ پاکستان بلکہ تمام مسلمانوں کے لئے گہرے رنج

کا باعث ہے۔ مرحوم تاریخ میں اپنا ایک پائیدار اثر چھوڑ گئے ہیں۔ ان کی وفات سے ہم ایک منفرد عالمِ دین سے محروم ہو گئے ہیں اور جو خلاء وہ چھوڑ گئے ہیں اس کا پورا ہونا مشکل ہے۔"

جنرل محمد ضیاء الحق (صدرِ پاکستان)

"مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ ایک جید اسکالر تھے جن کی شہرت پورے عالمِ اسلام میں پھیلی ہوئی تھی۔ برصغیر پاک و ہند کے اندر اور باہر کروڑوں افراد نے ان کی علمیت اور قرآنِ حکیم کی تفسیر سے استفادہ کیا۔ سید مودودیؒ کی رحلت سے نہ صرف پاکستان، بلکہ پورا عالمِ اسلام اس صدی کے عظیم ترین مذہبی مفکر سے محروم ہو گیا ہے۔"

میاں محمود علی قصوری

"مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی وفات سے مسلم دُنیا ایک عظیم دینی اسکالر سے محروم ہو گئی ہے۔ کم از کم پچاس برس تک مولانا مودودیؒ نے اسلام کا پیغام ہندوستان بعد ازاں پاکستان اور پھر پوری دنیا میں پھیلایا۔ ہندوستان اور پاکستان سے باہر کروڑوں افراد آج ان کیلئے سوگوار ہیں۔"

اے۔ کے سومار

"مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی وفات عالمِ اسلام کے لیئے ناقابلِ تلافی نقصان ہے۔ مرحوم اِسلام پر ایک اتھارٹی کی حیثیت رکھتے تھے۔ انہوں نے اپنی پوری

زندگی اسلام کے لیئے وقف کیے رکھی۔"

ڈاکٹر محمد باقر

"مولانا سیّد ابُوالاعلیٰ مودودیؒ اپنے زمانہ کے نوابغہ میں شمار ہوتے تھے۔ ان کی وفات سے دنیائے اِسلام میں علمی بصیرت رکھنے والے علماء کی صف میں ایک ایسا خلاء پیدا ہوگیا ہے۔ جسے پُر کرنا مشکل ہے۔"

شریفُ الدّین پیرزادہ (وفاقی وزیرِ قانون)

"مولانا سیّد ابُوالاعلیٰ مودودیؒ کی اچانک وفات سے عالمِ اِسلام ایک بلند مرتبت اسکالر، ممتاز مفکر اور اعلیٰ خوبیوں کی حامل شخصیت سے محروم ہوگیا ہے۔"

محمود ہارُون (وفاقی وزیرِ داخلہ)

"مولانا سیّد ابو الاعلیٰ مودودیؒ دنیائے اِسلام کے عظیم قائد اور بے مثال اسکالر تھے۔"

مسٹر آغا شاہی (وزیرِ خارجہ)

"سیّد ابُوالاعلیٰ مودودیؒ کی فکر انگیز تحریروں اور اِسلام کے مختلف موضوعات پر بلند پایہ تصنیفات نے انہیں پُوری اِسلامی دُنیا کی قابلِ احترام شخصیت بنا دیا تھا۔ نصف صدی تک اُن کی انتھک علمی اور عملی جدوجہد کے نتیجے میں اِسلامی دنیا میں احیائے اِسلام کی عظیم تحریک نے جنم لیا۔ مولانا مودودیؒ کی موت سے ہماری قومی زندگی اور عالمِ اِسلام میں ایک ایسا خلاء پیدا ہوُا ہے جس کا پُر ہونا مشکل ہے۔"

—

مسٹر جسٹس چودھری رحیم داد (چیئرمین اسلامی نظریاتی کونسل آزاد کشمیر)

"مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی رحلت تمام عالمِ اسلام کا نقصان ہے، مرحوم موجودہ صدی کے عظیم مفکر تھے۔"

لاہور ہائی کورٹ بار ایسوسی ایشن

"عالمِ اسلام کے ایک عظیم مفکر، جیورسٹ اور فلسفی سید مودودیؒ کی وفات پورے عالمِ اسلام کے لیے ناقابلِ تلافی نقصان ہے، ان کی اسلامی انقلاب کی جدوجہد کے سلسلے میں خدمات کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ ان کی شخصیت اُمتِ مسلمہ کے اتحاد کی مظہر تھی۔"

کراچی بار ایسوسی ایشن

"مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی ساری زندگی احیائے اسلام اور نفاذِ اسلام کے لیے انتھک کوششوں، بے مثل قربانیوں اور مسلسل ذہنی، فکری اور عملی کاوشوں سے عبارت رہی۔ موصوف نے اسلامی نظریہ حیات اور اصولوں کو جدید ترین فکری، عملی اور منطقی اسلوب سے آراستہ کر کے دورِ جدید کی قوتوں سے اسلام کی حقانیت اور عظمت کو منوایا جسے موصوف کا ایک ایسا مثالی کارنامہ قرار دیا جا سکتا ہے، جس پر تاریخِ اسلام ہمیشہ فخر کرتی رہے گی۔"

سندھ ہائی کورٹ بار ایسوسی ایشن

"مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ اسلام کے وہ عظیم اسکالر تھے جن کو پوری دُنیا سند مانتی تھی۔ اسلامی دُنیا کے لئے مولانا کی خدمات اتنی عظیم الشان ہیں کہ ان کی

رحلت سے عالمِ اسلام میں جو خلاء پیدا ہوا ہے اُسے پُر کرنا مشکل ہے۔"

بشکریہ ہفت روزہ، بادبان، لاہور۔
۵ر تا ۱۱ر اکتوبر ۱۹۷۹ء

آہ! سیّد مودودیؒ

(از حافظ پیر ظہور علی شاہ، سجادہ نشین چورہ شریف، اٹک)

اسلام کا وہ مہرِ درخشاں چلا گیا　　دینِ ہدیٰ کا نیّرِ تاباں چلا گیا
ڈھونڈیں گے لوگ فاتحِ دار و رسن کو اب　　وہ رہ نوردِ جادۂ زنداں چلا گیا
لرزاں تھے جسکے ہیبت تقویٰ سے تخت و تاج　　دنیا سے اب وہ غازیٔ دوراں چلا گیا
پھلتا رہے گا یُوں تو سدا گلشنِ جہاد　　اس گلستاں سے رُوحِ بہاراں چلا گیا
وہ مژدۂ اقامتِ دیں کا نقیب تھا　　عقدہ کشائے سنت و قرآں چلا گیا
ہر بُتکدے کو مثلِ ابراہیمؑ توڑ کر　　وہ آگ کو بنا کے گلستاں چلا گیا

دنیا ہے محوِ غم ابُو الاعلیٰؒ کے واسطے
اقدسؔ کو ہے یہ درد کہ "انسان" چلا گیا

-●-

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے چند
اقوال

(۱)

"انسانی شخصیت اپنے ارتقار کے لیے سب سے زیادہ جس چیز کی محتاج ہے وہ یہ ہے کہ اسے آزادی حاصل ہو، کچھ وسائل کار اس کے ہاتھ میں ہوں جنہیں وہ اپنے اختیار سے استعمال کر سکے اور وہ ان مسائل پر اپنے رجحان کے مطابق کام کر کے اپنی مخفی قوتوں کو اُبھارے اور چمکائے ـــــ مگر اشتراکی نظام میں اس کا کوئی امکان نہیں۔"

---

(۲)

"جمود بہر حال ٹوٹنا چاہیئے۔ حرکت کی ضرورت ہے، مگر نری حرکت کسی کام کی نہیں۔ حکمت اور تدبیر کے ساتھ حرکت ہونی چاہیئے۔ خصوصًا نازک اوقات میں تو بلا تدبر کے معنی خود اپنے پاؤں چل کر خندق میں گر جانے کے ہیں۔"

---

(۳)

"دین اور اقامت کے تصور میں بھی، ہمارے اور بعض

دوسرے لوگوں کے درمیان اختلاف ہے۔ ہم دین کو محض پوجا پاٹ اور چند مخصوص مذہبی عقائد کا مجموعہ نہیں سمجھتے بلکہ ہمارے نزدیک یہ لفظ "دین" طریقِ زندگی اور نظامِ حیات کا ہم معنی ہے اور اس کا دائرہ انسانی زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہے۔"

---

(۴)

"شیطانِ نفس کا ایک دوسرا ایجنٹ زبان ہے۔ کتنے ہی فتنے ہیں جو زبان کے ذریعہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ مرد اور عورت بات کر رہے ہیں، کوئی بُرا جذبہ نمایاں نہیں ہے۔ مگر دل کا چھپا ہُوا چور آواز کی حلاوت، لہجے میں لگاوٹ، باتوں میں گھلاوٹ پیدا کیے جا رہا ہے۔ قرآن اس چور کو پکڑ لیتا ہے۔"

---

(۵)

"میں آپ کا سخت بدخواہ ہوں گا اگر ہر لاگ لپیٹ کے بغیر آپ کو صاف صاف نہ بتادوں کہ آپ کی زندگی کا اصل مسئلہ کیا ہے۔ میرے علم میں آپ کا حال اور مستقبل معلق ہے اس سوال پر کہ آپ اس ہدایت کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں جو آپ کو خُدا کے رسول کی معرفت پہنچی ہے، جس کی نسبت سے آپ مُسلمان کہلاتے ہیں۔"

---

(۶)

" سرمایہ داری کا اقتضاء یہ ہے کہ روپیہ جمع کیا جائے اور اس کو بڑھانے کے لیے سود لیا جائے تاکہ ان "نالیوں" کے ذریعے سے آس پاس کے لوگوں کا روپیہ بھی سمٹ کر اس جھیل میں جمع ہو جائے ـــــ اِسلام اِس کے بالکل خلاف حکم دیتا ہے کہ اول تو روپیہ روک نہ رکھا جائے اور اگر رُک گیا ہو تو اس تالاب سے زکوٰۃ و صدقات کی نہریں جاری کر دی جائیں۔"

(۷)

"......اِس سلسلے میں سب سے پہلی بات جو میں اپنے مسلمان بھائیوں کو سمجھانا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ "اِسلام میں بھی عدالت اجتماعیہ موجود ہے۔" وہ بالکل ایک غلط بات کہتے ہیں۔ صحیح بات یہ ہے کہ اِسلام ہی میں عدالتِ اجتماعیہ ہے۔"

(۸)

" دورِ جدید کے فتنوں میں سے یہ 'ماہرین خصوصی' کا فتنہ بھی ایک بڑا فتنہ ہے۔ زندگی اور اس کے مسائل پر مجموعی نظر کم سے کم تر ہوتی جاتی ہے۔ انسان مختلف علوم و فنون کے یک حیثی ماہرین کے ہاتھوں کھلونا بن کر رہ گیا ہے۔"

(۹)

"آدمی قرآن کی روح سے پوری طرح آشنا نہیں ہو سکتا جب تک عملاً وہ کام نہ کرے جس کے لئے قرآن آیا ہے۔ یہ محض نظریات اور خیالات کی کتاب نہیں ہے کہ آپ آرام کرسی پر بیٹھ کر اسے پڑھیں اور اس کی ساری باتیں سمجھ میں آجائیں۔"

(۱۰)

"مسلمان صدیوں تک قلم اور تلوار کے ساتھ فرماں روائی کرتے کرتے تھک گئے۔ ان کی رُوحِ جہاد سرد پڑ گئی۔ قوتِ اجتہاد شل ہو گئی۔ جس کتاب نے ان کو علم کی روشنی اور عمل کی قوت بخشی تھی اس کو انہوں نے محض ایک متبرک یادگار بنا کر غلافوں میں لپیٹ کر رکھ دیا۔"

(۱۱)

"ہر وہ حکومت اور ہر وہ عدالت باغیانہ ہے۔ جو خداوندِ عالم کی طرف سے اس کے پیغمبروں کے لائے ہوئے قانون کے بجائے کسی اور بنیاد پر قائم ہو۔"

(۱۲)

"جس کسی نے امن اور سلامتی کا مطلب یہ سمجھا ہے کہ شیطانی نظامات کے زیرِ سایہ اطمینان کے ساتھ کاروبار چلتے رہیں اور مسلمانوں کی نکسیر تک نہ پھوٹے، اس نے

اِسلام کا نقطۂ نظر بالکل نہیں سمجھا۔ اسے اچھی طرح معلوم ہونا چاہیے کہ اِسلام ایسے امن اور ایسی سلامتی کا ہرگز مؤید نہیں ہے۔ اسے دوسروں کا قائم کردہ امن نہیں بلکہ اپنا قائم کردہ امن مطلوب ہے۔"

---

(۱۳)

"آخر اس میں کیا چیز مانع ہے کہ ہم مسلمان اپنے اپنے ملکوں میں اسلامی دستور کے مطابق خالص شرعی حکومتیں قائم کریں۔ اور ان میں خدا کی شریعت کو بلاکم و کاست نافذ کردیں۔ جس روز بھی ہم ایسا کریں گے، ہمیں اشتراکیت یا کسی اور نظامِ حکومت سے کسبِ فیض کی کوئی ضرورت باقی نہ رہے گی۔"

---

(۱۴)

"پس یہ واقعہ صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ دنیا کسی بنانے والے کے بغیر نہیں بنی ہے، بلکہ یہ بھی واقعہ ہے کہ اس کو ایک ہی نے بنایا ہے۔ حقیقت صرف اتنی ہی نہیں ہے کہ اس دنیا کا نظام کسی حاکم کے بغیر نہیں چل رہا ہے، بلکہ یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ حاکم ایک ہی ہے۔"

---

(۱۵)

"ایک مکمل اِسلامی زندگی کی عمارت اگر اُٹھ سکتی ہے تو صرف اسی اقرارِ توحید پر اُٹھ سکتی ہے جو انسان کی پُوری

انفرادی اور اجتماعی زندگی پر وسیع ہو، جس کے مطابق
انسان اپنے آپ کو اور اپنی ہر چیز کو خدا کی ملکیت سمجھے۔"

---

(۱۶)

"اسلام کا مستقل تقاضا یہ ہے کہ زندگی کے ہر شعبے
میں اخلاقی اصولوں کی پابندی کی جائے۔ اس لیئے وہ اپنی
ریاست کے لیئے بھی اس قطعی پالیسی کا تعین کر دیتا ہے کہ
اس کی سیاست بے لاگ، انصاف، بے لوث سچائی اور
کھری ایمانداری پر قائم ہوگی۔

-●-

اِسلام کا انقلاب[8]

"اِسلام کا مزاج موجودہ زمانے کی انقلابی تحریکوں کے مزاج سے
مختلف ہے۔ آجکل کی انقلابی تحریکیں اول تو ان سب لوگوں کے
خلاف سخت انتقامی کاروائیاں کرتی ہیں۔ جو ان کی کامیابی کی راہ میں
مزاحم ہو رہے ہوں۔ دوسرے وہ ایک نظام کی جگہ دوسرا نظام قائم
کرنے میں سخت اکھیڑ پچھاڑ اور توڑ پھوڑ کا طریقہ استعمال کرتی ہیں۔
اور اس میں کچھ پروا نہیں کرتیں کہ اس تغیر و تبدل سے کتنے لاکھ یا
کتنے کروڑ بندگانِ خدا تباہ ہو جائیں گے۔ اِسلام اس کے برعکس
جب کامیابی (یعنی حکمرانی) کے مرحلے پر پہنچتا ہے تو وہ بالعموم انتقام
کے بجائے عفو و درگزر کی پالیسی پر عمل کرتا ہے اور سابق نظام کی خرابیوں
کو بدلنے اور ان کی جگہ اپنا اصلاحی پروگرام نافذ کرنے میں بھی اسکی
عام پالیسی یہ ہوتی ہے کہ زیادہ سے زیادہ نرمی اور تدریج کے ساتھ
اصلاح کی جائے اور انسانی زندگی کو طوفان خیز، تغیرات سے جس حد
تک بھی ممکن ہو، بچایا جائے۔

اِسلام کی اس پالیسی کو بیان کرنے سے میرا مقصد یہ ہے کہ
رُوحِ اِسلام سے نابلد لوگ اصلاح کے غیر حکیمانہ جوش میں دنیا کے
چلتے ہوئے انقلابی مسلکوں کی جو نقل اتارنا چاہتے ہیں اور پھر اپنی
اس نقالی پر اِسلام کا لیبل بھی چپکا دیتے ہیں۔ ان کے طریقِ کار کی
غلطی واضح کر دوں۔"

-●-

"حق"

"حق" کے متعلق یہ بات اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ وہ بجائے خود "حق" ہے۔ وہ ایسی مستقل اقدار کا نام ہے جو سراسر صحیح اور صادق ہیں۔ اگر تمام دنیا اس سے منحرف ہو جائے تب بھی وہ حق ہی ہے کیونکہ اس کا حق ہونا اس شرط سے مشروط نہیں ہے کہ دنیا اس کو مان لے۔ دنیا کا ماننا نہ ماننا سرے سے حق و باطل کے فیصلے کا معیار ہی نہیں ہے۔ اگر دنیا حق کو نہیں مانتی تو حق ناکام نہیں ہے بلکہ ناکام وہ دنیا ہے جس نے اسے نہ مانا اور باطل کو قبول کر لیا۔ مصائب حق پر نہیں بلکہ اہلِ حق پر آتے ہیں لیکن جو لوگ سوچ سمجھ کر کامل قلبی اطمینان کے ساتھ یہ فیصلہ کر چکے ہوں کہ انہیں بہرحال حق پر ہی قائم رہنا اور اس کا بول بالا کرنا ہے وہ مصائب میں تو مبتلا ضرور ہو سکتے ہیں لیکن "ناکام" کبھی نہیں ہو سکتے۔ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض انبیاء ایسے گزرے ہیں جنہوں نے ساری عمر دینِ حق کی طرف دعوت دینے میں کھپا دی اور ایک آدمی بھی ان پر ایمان نہ لایا۔ کیا ہم انہیں ناکام کہہ سکتے ہیں ؟ نہیں۔ ناکام تو وہ قوم ہوئی جس نے انہیں رد کر دیا۔ اور باطل پرستوں کو اپنا رہنما بنایا۔

-●-

• یہ خط مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی صاحب کے نام ایک مفصل خط کا آخری حصہ ہے۔ جو مولانا مرحوم نے ۳۱ر اگست ۱۹۴۰ء کو لکھا تھا۔

میری محسن کتاب

کچھ مدت ہوئی آپ کا ایک عنایت نامہ آیا تھا، جس میں تجویز کیا گیا تھا کہ مَیں "وہ کتابیں جن کا ممنون ہوں" یا "میری محسن کتابیں" کے عنوان پر کچھ لکھوں، میں اِس کا جواب دینا بھول گیا تھا، ابھی آپ کو خط لکھتے ہوئے اس کا خیال آیا۔

"جاہلیت کے زمانے میں مَیں نے بہت کچھ پڑھا ہے۔ قدیم و جدید فلسفہ، سائنس، تاریخ، معاشیات، سیاسیات وغیرہ پر اچھی خاصی ایک لائبریری دماغ میں اتار چکا ہوں، مگر جب آنکھ کھول کر قرآن پڑھا، تو بخدا یوں محسوس ہُوا کہ جو کچھ پڑھا تھا، سب ہیچ تھا، علم کی جڑ اب ہاتھ آئی۔ کانٹ، ہیگل، نٹشے، مارکس اور دُنیا کے دوسرے تمام بڑے بڑے مفکرین اب مجھے بچے نظر آتے ہیں۔ بیچاروں پر ترس آتا ہے کہ ساری ساری عمر جن گتھیوں کو سلجھانے میں اُلجھتے رہے اور جن مسائل پر بڑی بڑی کتابیں تصنیف کر ڈالیں پھر بھی حل نہ کر سکے، اُن کو اس کتاب نے ایک دو فقروں میں حل کر کے رکھ دیا ہے۔ اگر یہ غریب اس کتاب سے ناواقف نہ ہوتے، تو کیوں اپنی عمریں اس طرح ضائع کرتے! میری اصل محسن بس یہی ایک کتاب ہے۔ اس نے مجھے بدل کر رکھ دیا ہے، حیوان سے انسان بنا دیا ہے،

تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لے آئی، ایسا چراغ میرے
ہاتھ میں دے دیا ہے کہ زندگی کے جس معاملے کی طرف
نظر ڈالتا ہوں، حقیقت اس طرح برملا مجھے دکھائی دیتی ہے
گویا اس پر کوئی پردہ ہی نہیں ہے ——
انگریزی میں اس کنجی کو شاہِ کلید (Master Key) کہتے ہیں
جس سے ہر قفل کھل جائے۔ سو میرے لیے یہ قرآن شاہِ
کلید ہے۔ مسائلِ حیات کے جس قفل پر اسے لگاتا ہوں،
وہ کھل جاتا ہے۔ جس خدا نے یہ کتاب بخشی ہے، اُس کا
شکر ادا کرنے سے میری زبان عاجز ہے۔

خاکسار

ابوالاعلیٰ"

بشکریہ اُردو ڈائجسٹ، بابت ستمبر ۱۹۸۱ء۔